کسی خواب کے یقین میں

ہما کوکب بخاری

بار اول ——— ۲۰۰۷ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف کمپوزر۔ لاہور
قیمت ——— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-255-1

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ ہمارے تعلقات میں پہلی دراڑ کب پڑی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ محبت کرنے کے لیے ہمارے پاس گنے چنے دن ہیں۔ اس احساس نے ہمیں بہت قریب کر دیا تھا۔ اتنا کہ ہم ایک دوسرے کی سانسوں میں رچ بس گئے تھے۔ لمحے ہتھیلیوں سے ریت کی مانند پھسل رہے تھے اور میں سوچتی تھی کہ تتلیوں جیسے یہ پل جب میرے ہاتھ سے اُڑ جائیں گے تو ہتھیلی پر اتر آنے والے ان کے رنگوں میں ڈوب کر میں ساری زندگی بتا دوں گی۔

مگر خبر نہیں کیا ہوا تھا' پہلے چھوٹی سی دراڑ پڑی تھی ہم تب بھی ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ہر شام چہل قدمی ضرور کرتے تھے' اس کے بعد یہ دراڑ بڑھ کر خلیج کی طرح گہری ہو گئی۔ سلونی شامیں اماوس کی رات کی طرح گہری اور تاریک ہو گئیں اور میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا اس لیے میں نے یہ بندھن باندھا تھا؟

وہ دن بیتے زیادہ سے تو نہیں گزرا تھا۔ میری بہن نبیلہ مجھے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔

''تجو! تو پاگل تو نہیں ہو گئی' شادی کوئی کھیل ہوتا ہے کیا؟ اور ہم کون سا مغربی معاشرے میں رہتے ہیں کہ ایک شادی کے اختتام کو ذہن سے جھٹک کر آسانی کے ساتھ دوسرا بیاہ رچا لیں' خدا کے لیے یہ حماقت چھوڑ دے۔''

سہیلیاں کہتیں۔ ''ہٹ تجو! تو کب سے اتنی جذباتی ہو گئی۔ اس پاگل پن سے باہر نکل آ۔ ایسا ہی شادی کا شوق ہو رہا ہے تو ہم پر چھوڑ دے مسٹر رائٹ کی تلاش۔ مانا کہ وہ بہت ہینڈسم ہے' لیکن ہم بھی خاص بندہ ڈھونڈیں گے تیرے لیے' سب کی آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی۔''

اور میں سوچتی کہ یہ سب کتنے بے حس لوگ ہیں۔ کل تک ان سب کی نگاہیں میرے انتخاب پر خیرہ ہو رہی تھیں اور آج اچانک جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔ کیا محبت ایسی ہی بے وقعت چیز ہوتی ہے' جسے ہر روز کپڑوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدل دیا جائے؟ ان میں سے کسی کی وہاں تک رسائی ہی نہیں تھی' جہاں میرے اور تیمور کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔

میں بہت لیے دیئے رہنے والی لڑکی ہوں۔ اجنبیوں کو ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے سے زیادہ اہمیت دینا میرے مزاج میں نہیں' مگر اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر ایک پل کے لیے میں ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ یوں لگا جیسے جی۔ کیو کے صفحوں سے نکل کر سانس لیتی جاگتی دنیا میں چلا آیا ہو۔ وہ ایسا ہی تھا کہ کوئی خوش ذوق لڑکی اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

ابھی بمشکل ہفتہ بھر پہلے ہی میں نے وہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کی تھی۔ سارا دن سگریٹ کے ایک اشتہار کے سلسلے میں مغز ماری کرتے ہوئے چھٹی کے وقت دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ نیلوفر کی تلاش میں پہلے خود کتنے کمروں میں جھانکا پھر ہرکارے دوڑائے اور بالآخر یہ سراغ ملا کہ محترمہ باہر پارکنگ میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ سخت کوفت کے عالم میں وہاں پہنچی تو اس پر نگاہ پڑنے سے پہلے میری نگاہ تیمور پر پڑی۔

وہ اپنی سفید ٹیوٹا کریسڈا کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ بائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ دھوپ کی وجہ سے آنکھیں قدرے مندی ہوئی تھیں اسی وقت وہ کسی بات پر ہنسا۔ اس کی ہنسی بہت ہی خوبصورت تھی۔

غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اس کی طرف متوجہ ہے۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی' میں بے نیازی سے نیلوفر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''فرو۔''

''ہائے بجو! آئی ایم سوری' میں تجھے بتائے بغیر ہی باہر نکل آئی۔''

پھر اسے تیمور کی موجودگی کا خیال آیا۔

''اس سے ملو' یہ میرا فرسٹ کزن تیمور ہے اور تیمور! یہ میری بہت ہی پیاری بچپن کی دوست نجیلہ ہے۔''

مجھے دیکھ کر اس نے سگریٹ پھینک دیا۔ تھوڑی دیر تک نائس ٹو میٹ یو قسم کے فقروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے مل کر واقعی اسے کوئی مسرت ہوئی تھی یا وہ محض رسمی

الفاظ بول رہا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے اس سے ملنا اچھا لگا تھا۔ وہ اسمارٹ ہونے کے ساتھ ساتھ مہذب بھی تھا۔ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی' مگر نیلوفر اکثر اس کا تذکرہ کیا کرتی تھی۔

نیلوفر اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی اور میں غیر محسوس انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

سردیوں کی شام کی نرم ٹھنڈی دھوپ میں اس کے بال چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ ماڈلنگ کی طرف آ جائے تو تہلکہ مچا سکتا ہے۔

''تمہاری کتابیں ڈیڈی لے آئے تھے۔ شام کو تمہارا پروگرام بن جائے تو خود آ کر لے جانا ورنہ رات کے کھانے کے بعد میں خود آ کر دے جاؤں گی۔'' نیلوفر اس سے کہہ رہی تھی۔

''میں خود آ جاؤں گا شام کو۔'' وہ بولا۔

''او۔ کے' میں اب چلتی ہوں' پھر شام کو ملاقات ہو گی۔'' نیلوفر نے کہا۔

اسے خدا حافظ کہہ کر ہم اپنی شیراڈ کی طرف بڑھ گئے۔ ''گیٹ سے نکلتے ہوئے تمہارے چہرے پر غصے کے مارے لکیروں کا جال بنا ہوا تھا۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''کیا نہیں ہونا چاہیے تھا؟ سارے دن کی بیزاری میں تمہاری اس حرکت کی کوفت بھی شامل ہو گئی ہے اب تو۔'' میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے وہیں دو ایک لوگوں کو بتا دیا تھا کہ باہر جا رہی ہوں۔ اصل میں مجھے پتا چلا کہ تیمور آیا ہے تو سوچا کہ کھڑے کھڑے اس سے دو چار باتیں ہی کر لوں' وہ بھی نکل ہی رہا تھا۔ ویسے بھی باہر تو تمہیں آنا تھا۔ اب مجھے کیا خبر تھی کہ کوئی تمہیں بتائے گا ہی نہیں۔'' وہ اطمینان سے پاؤں جوتوں سے نکالتے ہوئے بولی۔

''ویسے فرو! یہ تیرا کزن سگریٹ کے اشتہار میں کیسا لگے گا؟''

''خدا کے لیے بجو! بندوں کو اشتہاروں کے حساب سے کلاسی فائی کرنا چھوڑ دے۔ نعیم جھارو کے اشتہار میں' اسماء کالے رنگ کو گورا کرنے والی کریم کے اشتہار میں' سرفراز سنڈی مار مکاؤ کے اشتہار میں' نازو دانت سفید کرنے والے منجن کے اشتہار میں' فریدہ چینڈ و مارکہ صابن کے اشتہار میں اور...'' وہ قدرے سانس لینے کو رکی پھر بولی۔

''کیا کیا گنواؤں کہ فہرست بہت طویل ہے۔''

میں ہنس پڑی۔

''قسم لے لو جو اس مرتبہ میں اس قسم کی کلاسی فیکیشن کے چکر میں پڑی ہوں۔ اس حساب سے تو تمہارے کزن کو اولڈ سپائس کے اشتہار کے لیے ماڈلنگ کرنی چاہیے۔''

''ویسے ہے ناں ہینڈسم۔'' نیلوفر نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ہے لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا اس کے ہوتے ہوئے تمہاری نگاہِ انتخاب ہمایوں پر کیسے پڑی۔''

''جس وقت ہمایوں سے افیئر شروع ہوا تھا' اس وقت اتنی عقل ہی نہیں تھی۔ وہ روز صبح جوگنگ کے بہانے ہمارے گھر کا طواف کرتا تھا۔ سائیکل پر کرتب دکھاتا تھا۔ کارڈز کی ٹرکس سے حیران کرتا تھا۔ نئے نئے لطیفے سناتا تھا اور تب میں صرف ساتویں کلاس میں تھی۔ بس وہیں غلطی سے پھسل گئی۔ جب تک احساس ہوا کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھنے پر تیمور بھی نظر آ سکتا تھا' تب تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ یوں بھی تیمور اور ہمایوں بہت ہی گہرے دوست ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ سمجھو رہا سہا چانس بھی ختم ہو گیا۔'' نیلوفر نے مصنوعی آہ بھری۔

میں ہنس پڑی۔

''بہت افسوس ہوا۔''

''خیر اب اس قدر افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے میرا یہ کزن ابھی تک فارغ البال ہے۔''

''بال تو خیر خاصے ہیں اس کے۔''

''زیڈال کے اشتہار میں لے لو۔'' نیلوفر بھنا گئی۔ ''میرا مطلب کچھ اور تھا۔ تجھے اچھا لگا ہے یہ تو راستے میں کوئی دیوار نہیں ہے۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ تو ٹرائی کر سکتی ہے۔''

''پاگل ہوئی ہے کیا سمجھا ہوا ہے مجھے۔'' میں نے اسے گھورا۔

''یہی مسئلہ اس کے ساتھ بھی ہے تب ہی اب تک اتنا فارغ البال ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں کا کنوارے مرنے کا ارادہ ہے مگر خیر مجھے کیا۔''

نیلوفر کو اس کے گھر ڈراپ کیا تو جاتے جاتے وہ کار کے اندر جھانکتے ہوئے پھر بولی۔

''اب بھی وقت ہے سجو! سوچ لے شام کو وہ آئے گا میری طرف۔''

''اندر جا کر ٹھنڈا پانی ڈالنا سر پر۔ یہ جو بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شاید اس سے کچھ افاقہ ہو جائے۔'' میں نے کہا اور کار موڑ کر اپنے گھر چلی آئی۔

ہمارے گھر زیادہ دور نہیں تھے۔ میرے گھر کے سامنے لین کے شروع میں اس کا گھر تھا اور بالکل آخر میں میرا۔

میں اندر داخل ہوئی تو نبیلہ ہر روز کی طرح ٹی۔وی کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور پاپا ہاتھ میں پائپ لیے اپنی راکنگ چیئر پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

''ہائے سجو! جلدی آنا' دیکھو تو کیا زبردست ریس ہو رہی ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح مجھے دیکھتے ہی چلائی۔

ایک تو ٹی وی اور پھر اسپورٹس۔ دونوں میں ہی میری دلچسپی صفر تھی۔ یہ بات نبیلہ بھی جانتی تھی' مگر ہر روز ایسا ہی ہوتا تھا۔ اپنے جوش و خروش میں اسے اس بات کی زیادہ پروا نہیں ہوتی تھی۔

میں پاپا کے پاس گئی۔ ہمیشہ کی طرح ان سے پیار لیا۔ میرے لیے چائے پہلے سے تیار تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے آئی تو پاپا میرا انتظار کر رہے تھے۔ سارے دن کی دلچسپ باتیں انہیں سنا کر میں ان کے ساتھ مل کر کراس ورڈ پزل حل کرنے لگی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سے پاپا کے معمولات میں اخباروں کا عمل دخل بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ شہر میں ملنے والا کوئی ایک اخبار بھی ہمارے گھر نہ آتا ہو۔ ممی تو تھیں نہیں' ہمارے بچپن ہی میں وہ فوت ہو گئی تھیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ ممی سے پاپا کی محبت تھی یا ہم سے یا کوئی اور وجہ کہ انہوں نے سب کے اصرار کے باوجود بھی دوسری شادی نہیں کی۔ ہم بھی دو ہی بہنیں تھیں۔ نبیلہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھی۔

کبھی میں سوچتی کہ پاپا کس قدر تنہا ہیں' بالکل اکیلے۔ جب تک وہ سروس میں تھے تب تک کچھ نہ کچھ سرگرمیاں جاری تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔ پہلے ہم دونوں کی پڑھائی تھی' اب میں نوکری کرنے لگی تھی۔ نبیلہ ٹی۔وی سے چپکی رہتی تھی اور پاپا لاؤنج میں اس کے پاس بیٹھ کر بھی اکیلے ہوتے تھے۔ کبھی اخبار' کبھی باغبانی' کبھی گاڑی کی دھلائی' کبھی میرے ساتھ مل کر اسکریبل اور بس یہی مصروفیات رہ گئی تھیں ان کی۔

میری کوشش ہوتی تھی کہ اپنا تمام تر فارغ وقت ان کے ساتھ ہی گزاروں۔

اس وقت نبیلہ کار ریس دیکھ چکنے کے بعد اسٹار ٹی وی پر ایل۔ اے لاء دیکھ رہی تھی اور [م]یں نے اپنے اور پاپا کے درمیان ابھی اسکریبل رکھی ہی تھی کہ نیلوفر چلی آئی' مگر وہ تنہا نہیں [ت]ھی' تیمور بھی اس کے ساتھ تھا۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے نیلوفر کی طرف دیکھا کہ وہ اسے کیوں یہاں لائی تھی۔ اور وہ [آ]نکھوں میں شرارت لیے نبیلہ سے حال چال پوچھنے میں مگن ہوگئی۔

تیمور کی کمپنی اچھی تھی' مگر میں نے گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لیا۔ پہلی دوسری ملاقات [م]یں ہی کسی سے بے تکلف ہو جانا میری عادت نہیں تھی۔ وہ چاروں البتہ کافی دلچسپ باتیں کرتے رہے اور میں فلورکشن پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔

''تیمور آج کل سول سروس کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے انکل! میں یہ سوچ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لائی کہ شاید اسے آپ سے کوئی مدد مل جائے۔ آخر آپ بھی تو یہ امتحان پاس کر چکے ہیں۔''

''میں نے یہ امتحان برسوں پہلے پاس کیا تھا پھر سالوں کسٹمز میں نوکری کی اور اب ریٹائر بھی ہو چکا ہوں' پھر بھی میری مدد درکار ہے تو حاضر ہوں۔'' پاپا نے شگفتگی سے کہا۔

نبیلہ بھی دو سال سے سول سروس کا امتحان دینے کا ارادہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس کا یہ شوق پھر نئے سرے سے عود کر آیا۔ اس کے بعد اس موضوع اور اس سے متعلق دیگر موضوعات پر جو باتیں شروع ہوئیں تو ان کا اختتام ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد یہ باتیں مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کرنے لگیں۔ میری کیفیت دیکھ کر نیلوفر میرے پاس چلی آئی۔

''بور ہو رہی ہو؟''

''شدت سے۔'' میں نے کہا

''چلو لان میں چلتے ہیں۔''

میں اٹھ کر اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

لان میں آتے ہی وہ میرے اوپر چڑھ دوڑی۔

''یہ کیا حرکت ہے بجو! میں اسے یہاں لائی تھی کہ تم دونوں کے درمیان فرینڈ شپ ہوگی

اور تم منہ سیے بیٹھی ہو۔''

''تم اس لیے لائی تھیں اسے یہاں؟''

''تو اور؟ تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ اسے برٹش ہسٹری یا اکنامکس کے سبق پڑھوانے لائی تھی۔ وہ بھی کوڑھ مغز ہے اور تم بھی نری عقل سے عاری۔ وہ بھی مزے سے بیٹھ گیا ایڈم اسمتھ کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے اور میگنا کارٹا پر دستخط کرنے۔ یا خدا! یہ کیسے جاہلوں سے پالا پڑ گیا ہے میرا۔''

''فرو! آئی ول کل یو (میں تمہیں مار ڈالوں گی) کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے کہ یوں ہر راہ چلتے کے ساتھ عشق و عاشقی شروع کر دوں گی میں؟ ایسا ہی کرنا ہوتا تو درجن بھر عشق بھگتا چکی ہوتی۔''

''کیا کہا تم نے میرے اتنے ہینڈسم کزن کو؟ وہ کوئی راہ چلتا دل پھینک عاشق نہیں ہے۔ میرا دل جلتا ہے یہ دیکھ کر کہ تم جو زندگی کے لمبے لمبے فلسفے بگھارتی ہو تمہاری تجربات کی پوٹلی بالکل خالی ہے۔'' نیلوفر نے تیزی سے کہا۔

''دنیا کا ہر عقل مند شخص تم جیسے بے وقوفوں کو دیکھ کر ہی سبق حاصل کر لیتا ہے۔ عقل مندی کے لیے تجربات کے بجائے مشاہدات ہی کافی ہوتے ہیں۔'' میں جل کر بولی۔

''آئندہ کم از کم محبت اور زندگی پر اس کے اثرات کے متعلق اپنا کوئی لیکچر نہ دینا کیونکہ تمہارے پاس مشاہدات سے نچوڑے ہوئے چند لفظوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے کسی تجربے کا آمیزہ نہیں ہے۔ ان میں کھٹا میٹھا سا۔ کوئی سوز و گداز نہیں ہے۔''

''پلیز فرو! میرا مغز مت چاٹو' آدھا آفس میں چٹ ہو جاتا ہے' باقی پر تم ٹوٹ پڑتی ہو۔ میری جان بخشو' میرا کوئی ارادہ نہیں ہے تمہارے کزن سے محبت کرنے کا۔''

''کوئی زور زبردستی نہیں ہے' اس سے نہ سہی پر کسی سے تو محبت کرو۔ ویسے غور سے دیکھو تو لو' یہ بھی برا نہیں ہے اور کچھ نہیں تو ہینڈسم تو ہے ہی۔'' وہ شرارتی لہجے میں مجھے اکسا رہی تھی۔

''ہینڈسم بندے اچھے ہوتے ہیں' آخر ہم لڑکیوں میں بھی حسِ جمال پائی جاتی ہے اور ہر خوبصورت اور اچھی چیز پر ہماری نگاہیں بھی ٹکتی ہیں مگر فرو ڈیئر! زندگی گزارنے کے لیے انسان کے اندر اس سے کہیں زیادہ اہم خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ بندہ کیئرنگ ہو' کنسیڈریٹ ہو' اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہو' زندگی کو
بصورتی سے گزارنے کا ہنر جانتا ہو' بیوی کو کمتر اور ناقص العقل سمجھنے کی بجائے اپنا ساتھی اور
ں طاقت سمجھے' محبتیں لینے کے ساتھ ساتھ محبت دینا بھی جانتا ہو۔''

''. مارا۔'' وہ چلائی۔

''تو پھر بات پکی سمجھو۔ اس میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں بلکہ ایک اضافی خوبی یہ
ہے کہ وہ ہینڈسم ہے۔ قسم سے سجو! اس سے باتیں تو کر کے دیکھ' تجھے خود اندازہ ہو جائے
گا۔''

میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

رات کا کھانا انہوں نے ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ پاپا نے بہت اصرار کے ساتھ انہیں
روک لیا تھا۔ کھانے کی میز پر میری نگاہیں بظاہر پلیٹ پر تھیں اور میں پورے انہماک سے
کھانے میں مصروف تھی' لیکن میرے کان بالکل لاشعوری طور پر تیمور کی باتوں پر ہی لگے
ہوئے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھی نیلوفر وقفے وقفے سے مجھے ٹھوکے مار رہی تھی۔

ان چاروں کے درمیان گفتگو جاری تھی۔ ادب' فلسفہ' تاریخ' معاشیات اور نہ جانے کن
کن موضوعات پر' اور میں تیمور کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ یہ سوچ رہی تھی کہ معمول سے
ہٹ کر میری بریانی کی پلیٹ میں گوشت کم کیوں آیا تھا۔ ابھی میں کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچی
تھی کہ ...ر نے مجھے چونکا دیا۔

''اتنے انہماک سے کھانا مت کھاؤ' موٹی ہو جاؤ گی۔ تھوڑی بہت باتیں بھی ساتھ
ساتھ کرتی جاؤ تو منہ دو طرف چلنے کی وجہ سے کھانے پر تمہارا حملہ کچھ کمزور ہو جائے گا۔''

میں نے اسے گھورا۔

''تم جانتی ہو کہ کھانا مجھے کبھی موٹا نہیں کرتا اور یہ بھی کہ مجھے آرٹ کے علاوہ اور کسی
موضوع سے دلچسپی نہیں ہے۔''

''آپ کا مضمون فائن آرٹس ہے؟'' تیمور نے مجھے براہِ راست مخاطب کیا۔

''جی' میں نے این۔ سی۔ اے سے فائن آرٹس میں گریجویشن کی ہے۔''

میں پھر اپنی پلیٹ میں گوشت کی کمی پر تحقیق کرنے لگی۔

''اور فائن آرٹس میں آپ نے کیا پڑھا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے پاس سکلپچر اور گرافکس تھے۔''

''اور آج کل آپ ایڈورٹائزنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں؟''

''جی!''

''آپ ڈیزائنر نہیں آرٹسٹ ہیں پھر ڈیزائننگ کے شعبے سے کیسے منسلک ہو گئیں؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کمرشل ڈیزائننگ نہیں پڑھی' لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ
ایک آرٹسٹ تو ڈیزائنر ہو سکتا ہے مگر ایک ڈیزائنر آرٹسٹ نہیں ہو سکتا۔ بنیادی طور پر انسان
کے اندر تخلیقی شعور ہونا چاہیے۔ نت نئے خیالات کو عملی جامہ پہنانا آنا چاہیے۔ اس کے بعد
صرف تکنیک رہ جاتی ہے' جو سیکھنی مشکل نہیں ہوتی میں بھی سیکھ رہی ہوں اور سیکھنے کا عمل تو
ہمیشہ جاری ہی رہتا ہے۔''

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ اس کے بعد نیلوفر اور تیمور واپس چلے گئے۔
میں صبح کے لیے کپڑے استری کر کے سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی ہی تھی کہ پاپا
نے آواز دی۔

''سجو بیٹا! آپ کا فون ہے۔''

''نیلوفر کا ہی ہوگا۔'' میں نے سوچا اور موبائل ایکسٹینشن لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''بے فائدہ ہی رہا ناں اتنا وقت ضائع کرنا۔'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔

''کیا مطلب؟''

''اب تمہیں کیا سمجھاؤں مطلب' ہم واپس آئے تو تیمور انکل کے قصیدے پڑھ رہا تھا'
ان کی ناج کی تعریف' پرسنالٹی کی تعریف' انداز نشست و برخاست کی تعریف' باقی تعریفیں
نبیلہ نے سمیٹ لیں کہ واہ! کیا شاندار کھانا تھا۔ میں ترس گئی کہ ایک لفظ ہی تمہاری تعریف
میں بھی کہہ دے' مگر مجال ہے کہ کچھ پھوٹا ہو۔''

''فرو! تم میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں؟'' میں نے جھلا کر کہا۔

''خیر! یوں بھی تم میں قابلِ تعریف بات ہے ہی کیا؟'' وہ اپنی کہے گئی۔

''نہ کسی افسانوی ہیروئن کی طرح گھٹاؤں جیسے لمبے بال' ویج کٹ باب' وہ بھی
سٹریکنگ کے ساتھ' ستواں ناک بھی نہیں ہے' بس عام سی ہے' یاقوتی ہونٹ بھی نہیں' لپ
اسٹک کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ ہاں آنکھیں خوبصورت ہیں' لیکن دو اکلوتی آنکھوں کی

...بصورتی سے کیا بنتا ہے۔ اب ایسے حالات میں کوئی صورت پر فدا ہونے سے تو رہا۔ ذرا
...ان کو زحمت دیتیں تو پتا چلتا کہ تھوڑی بہت عقل ہے۔ شاید یہ عقل ہی تمہارے حالات سنوار
...تی لیکن تم سے تو وہ بھی نہ ہوا۔''

اس کے تجزیے پر میں نے قہقہہ لگایا۔

''میرا آئینہ تو کچھ اور کہتا ہے۔''

''بہر حال جانے دو اب اس بات کو اگلی مرتبہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ بولی۔

''اگلی مرتبہ...... اگلی مرتبہ تم نے اس نیت سے میرے گھر میں قدم رکھا تو میں کہیں سے
...وئی السیشن لا کر گیٹ پر باندھ دوں گی۔''

''مجھے بتاؤ' تمہیں تکلیف کیا ہے؟''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے' تکلیف تو تمہیں ہے۔ کسی دماغ کے ماہر سے چیک اَپ
...کراؤ۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو۔ قسم سے فرو تمہاری جگہ کوئی اور ایسی حرکت کرتا تو میں کب
...کا اس کا سر پھوڑ چکی ہوتی۔ یہ بچپن کی دوستی ہے بلکہ دوستی سے زیادہ بہناپا ہے جو مجھے روکے
...وئے ہے۔'' میں نے کہا۔

''چلو اسی کا خیال کر لو کہ ہر بہن اپنی بہن کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوتی ہے۔
...میں تو زیادہ فکر مند اس لیے ہوں کہ تمہارا حال بھی بے حال ہے۔ یہ بھی چاہتی ہو کہ شادی پسند
...سے ہو اور کسی کو پسند بھی نہیں کرتیں۔''

''اسے جانے دو' یہ بتاؤ کہ تمہارا کزن اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا؟ یہ کراچی میں
...نہیں ہوتا تھا؟''

مجھ میں گوسپ والی جو خالص زنانہ عادت تھی' اس کے مطابق میں نے پوچھا۔

''نمودار کیا ہونا تھا' پہلے ایک عرصے تک تایا' تائی اور یہ امریکہ میں رہے پھر یہ
...بورڈنگ میں رہا۔ تمہیں تو پتا ہے ناں کہ ہماری مما اور تائی کی آج تک نہیں بنی کبھی۔ حالانکہ
...خالہ زاد بہنیں بھی ہیں۔ ان سے ہماری رشتہ داری بس شادی بیاہ یا مرگ تک رہ گئی ہے' ہاں
...تیمور ہماری طرف آتا رہتا ہے' ہم بہن بھائی بھی ان کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں۔

دو سال پہلے تیمور نے لٹریچر میں ماسٹرز کیا تھا پھر وہ کراچی چلا گیا تھا اور تجربے کے لیے
...انگریزی اخبار میں کام کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ سی۔ ایس۔ ایس کی تیاری بھی جاری رہی۔ ابھی

مہینہ بھر پہلے کراچی سے اس لیے واپس آیا ہے کیونکہ تائی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ بالکل
اکلوتا ہے ناں تیمور۔ تایا کو اس کے سی۔ ایس۔ ایس کرنے پر اعتراض نہ ہوتا' اگر دو چار بیٹے
اور بھی ہوتے جو کاروبار سنبھال سکتے۔ اب بھی انہیں زیادہ اعتراض تو نہیں ہے۔ اگر تیمور کو
ڈی ایم جی مل جاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوں گے' لیکن اس سے کم پر وہ کسی طرح راضی نہیں
ہیں۔''

ان میں سے بیشتر باتیں مجھے معلوم تھیں' مگر تیمور کی اس مقصد سے آمد کا علم نہیں تھا۔
شاید نیلوفر کو بتانے کا خیال نہیں رہا تھا۔

اس کے دو دن کے بعد تک نیلوفر مجھے تیمور کے بارے میں معلومات دے کر میرے
کان دکھاتی رہی۔ کبھی گویا ہوتی۔

''وہ بہت لائق ہے۔ امتحان کلیئر کرنا تو اس کے لیے مسئلہ ہی نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ
پہلی دس پوزیشنوں میں سے کون سی پوزیشن لیتا ہے۔''

کبھی اطلاع ملتی۔

''وہ چائے میں چینی کم لیتا ہے۔''

کبھی پتا چلتا۔

''انگریزی ادب اور برطانیہ کی تاریخ اس کے پسندیدہ مضامین ہیں۔''

کبھی معلوم ہوتا۔

''کھانے میں اسے قیمہ بہت پسند ہے۔''

تیسرے دن میں نے قدرے سکون کا سانس لیا کہ نیلوفر نے آفس سے چھٹی کی تھی۔
شام کو وہ یقیناً میرے سر پر سوار ہو جاتی یا پھر مجھ سے ہی نہ رہا جاتا اور میں اس کے گھر پہنچ
جاتی' مگر فی الحال یہ اطمینان تھا کہ آدھے دن تک تیمور نامہ نشر نہیں ہوگا۔ صبح ہی صبح نیلوفر کا
فون آیا تھا۔

''آج میں چھٹی کر رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

''مجھے رات ہی سے چھینکیں آ رہی تھیں۔ اب باقاعدہ فلو ہو گیا ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں مستقبل کے سسر اور سگے ماموں کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرنے کا یہ فائدہ

تو ہوتا ہی ہے کہ دو چھینکیں آنے کے بعد بندہ آرام سے چھٹی کر سکتا ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

اس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔

صبح آفس کے لیے نکلتے وقت ہی سے آسمان پر بادل تیر رہے تھے۔ واپسی کے وقت تک باقاعدہ بارش شروع ہو چکی تھی۔ میں کیولری گراؤنڈ میں ایچ کریم بخش سے ذرا سا آگے نکلی تھی کہ تیز بارش میں سڑک کے کنارے کچھ کتابوں کو بارش کے پانی سے بچاتے ہوئے تیمور پر میری نگاہ پڑی۔ میرا پاؤں فوراً بریک پر جا پڑا تھا۔

''آئیں میں آپ کو گھر ڈراپ کر دوں۔'' میں نے کار کا شیشہ نیچے کر کے سر قدرے باہر نکالا۔

''تھینک یو۔'' وہ سامنے سے ہو کر آیا اور اپنے بھیگے کپڑوں کے ساتھ میرے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

میں نے کار آگے بڑھائی۔

''کہاں ڈراپ کروں آپ کو؟''

''آپ کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر اترنا ہے مجھے۔'' وہ کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

میں نے کچھ کہے بغیر ٹشو کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا اسے اپنے بھیگنے سے زیادہ کتابوں کے بھیگ جانے کا غم تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ ان پر پلاسٹک کور چڑھے ہوئے تھے' ورنہ اب تک نہ جانے ان کا کیا حال ہو چکا ہوتا۔

ایک نظر میں نے اس کی کتابوں کی طرف دیکھا۔ وہ تعداد میں چار تھیں اور سب کی سب آرٹ کے متعلق۔

''آج بارش میں بھیگنے کے لیے آپ نے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا؟''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں نے سوچا تھا کہ موسم خوبصورت ہے' اس لیے آج تھوڑی سی سیر کر لی جائے۔ کاروں نے ہمیں بہت ناکارہ کر دیا ہے۔ یہی سوچ کر پیدل ہی ماموں کے گھر کے لیے چل پڑا۔''

''پیدل' اتنی دور؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''اتنا اسٹیمنا تو ہونا چاہیے۔''

''اور آتے وقت آپ کو بادل دکھائی نہیں دیئے۔ آپ کو موسم خوبصورت لگ رہا تھا اور مجھے صبح سے سخت سردی لگ رہی تھی۔'' میں نے کہا۔

''بادل تو نظر آئے تھے' لیکن میرا خیال تھا کہ برسیں گے نہیں۔ اصل میں کل محکمہ موسمیات نے پیش گوئی کی تھی بارش کی۔ میں نے سوچا کہ آج تک ان کی کون سی پیش گوئی درست ثابت ہوئی ہے کہ آج ہو گی۔ مگر خیر اس مرتبہ میں غلطی پر تھا۔''

''آپ کو بھی آرٹ سے دلچسپی ہے؟'' میں نے یونہی گفتگو برائے گفتگو کے لیے پوچھ لیا۔

''تھی نہیں اب ہو گئی ہے۔'' وہ بولا۔ ''اصل میں اس روز تم......''

وہ کہتے کہتے رک گیا اور میں سنتے سنتے چونک گئی۔ ''میرے 'تم' کہنے پر مائنڈ تو نہیں کیا؟'' بالآخر اس نے کہا۔ پھر خود ہی وضاحت کرنے لگا۔

''دراصل نیلوفر کی زبان پر ہر وقت ''جوجو'' کی گردان رہتی ہے۔ اس نے ان دو دنوں میں اس موضوع پر اتنی زیادہ باتیں کی ہیں کہ جمیلہ شاہ میرے لیے کوئی اجنبی شخصیت نہیں رہی۔ نہ اجنبی نہ غیر اور یہ کتابیں میں اس لیے لے جا رہا ہوں کہ میں بھی جمیلہ شاہ کے لیے اجنبی اور غیر نہ رہوں۔ اسے آرٹ کے علاوہ کسی سبجیکٹ میں دلچسپی نہیں ہے اور اس بارے میں میری معلومات بالکل صفر ہیں۔

تمہیں معلوم ہے' اس روز وہ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی' ناخوش بھی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے اجنبیوں میں گھلنا ملنا پسند نہیں ہے اور شاید اس لیے بھی کہ وہ صرف آرٹ کے متعلق ہی پورے جوش و خروش سے بات کرتی ہے۔

ویسے تمہارا کیا خیال ہے کہ ان کتابوں کے ذریعے میں اس کے اور اپنے بیچ اجنبیت کی دیوار گرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

میں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی اور چند لمحوں کے بعد بولی۔

''دوستی میں اجنبیت کی دیوار جمیلہ شاہ نے صرف ایک مرتبہ گرائی ہے نیلوفر کی خاطر۔ پاپا' نبیلہ اور نیلوفر کے علاوہ کوئی بھی اس دیوار کے پار نہیں پہنچ سکا۔''

''یہ دیوار ماؤنٹ ایورسٹ جتنی بلند اور مشکل کیوں ہے؟'' وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''جو اتنے جوکھوں سے گزرے گا' وہ جمیلہ اور اس کی دوستی کی قدر بھی کرے گا۔''

''چلو راستے کا نشان تو ملا۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ مسجد چوک پر پہنچ کر میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب کہاں؟''

وہ راستہ بتاتا گیا۔ اسے اس کے گھر اتار کر میں مڑی تو بیک ویو میں کتنی دیر تک وہ دکھائی دیتا رہا۔ چند لمحے پہلے کی ہوئی اس کی باتیں مجھے اچھی لگی تھیں اور میں شعوری کوشش کے ساتھ اس کا الزام نیلوفر کے سر تھوپ رہی تھی۔ جس نے دو دن تک خوب میری برین واشنگ کی تھی۔

''ہاں' ورنہ اب سے پہلے کیا لڑکے نہیں ملے تھے؟ خیر وہ تو میرے بقول فرو کے خشک رویے کے باعث کبھی آگے نہیں بڑھ سکے' لیکن پتا نہیں کیا بات ہے کہ تیمور اپنا اپنا سا لگا ہے۔'' میں نے سوچا پھر یہ الزام نیلوفر پر لگا دیا۔

''اصل میں اس نے تیمور کے متعلق خبروں کا جو دفتر کھولا تھا' یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے' ورنہ اب وہ ایسا خاص بھی نہیں ہے۔''

پھر خیال آیا کہ وہ میری خاطر آرٹ کے متعلق کتابیں لانے گیا تھا۔ یہ احساس بہت خوش کن تھا' مگر پھر وہی محتاط طبیعت۔

''ممکن ہے کہ کتابیں لانے کی وجہ کوئی اور ہو۔ میرے سامنے یونہی میرا نام لے دیا ہو کہ میں ہواؤں میں اڑنے لگوں گی۔''

گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے میں اترنے لگی تو میری نگاہ تیمور کی کتابوں پر پڑی جو کار کی پچھلی نشست پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں انہیں اندر لے آئی۔

نبیلہ حسب معمول ٹی وی پر اسپورٹس چینل لگائے بیٹھی تھی اور پاپا آتش دان کے پاس اپنی راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے پائپ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ ٹی۔ وی بھی دیکھ رہے تھے۔

''ہائے سجو! جلدی آنا دیکھو تو سکنگ ہو رہی ہے۔'' وہ چلائی۔

میں پاپا کے پاس آئی ان سے پیار لیا اور کپڑے تبدیل کرنے اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ بالوں میں تیزی سے برش کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کتابیں بھیگی ہوئی ہیں خراب ہو جائیں گی' کیوں نہ انھیں سکھا دیا جائے۔

پہلے تولیے سے ان کی جلدیں صاف کیں پھر پلاسٹک کور اتار کر استری کے ساتھ اس کے صفحے سکھانے لگی۔ کتابیں بھی خاصی موٹی موٹی تھیں۔ اس کام میں کافی وقت لگ گیا۔ ابھی میں پورے انہماک سے گیلے صفحوں پر استری پھیر رہی تھی کہ نبیلہ دروازے پر دستک دے کر باہر سے بولی۔

''سجو! زندہ سلامت ہو؟''

''تمہیں کیوں شک ہے؟'' میں اندر سے ہی چلائی۔

''برآمد کیوں نہیں ہو رہیں پھر؟ پاپا چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔''

''آتی ہوں' ان سے کہو چائے پی لیں۔'' میں نے کہا اور پھر مصروف ہو گئی۔

سب کتابیں ٹھیک ٹھاک کر کے' ان پر پلاسٹک کور چڑھا کر میں باہر لاؤنج میں آئی تو پاپا میرا انتظار کر رہے تھے۔

''بیٹا خیریت ہے ناں؟''

مجھے اتنی دیر سے خواب گاہ سے برآمد ہوتے دیکھ کر انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''جی پاپا! بالکل خیریت ہے۔ آپ نے چائے پی لی ناں؟''

''آپ کے بغیر کیسے پیتا؟'' انہوں نے شفقت سے میری طرف دیکھا۔

میں اندر تک شرمسار ہو گئی۔

''ہم لڑکیاں بھی کیا ہوتی ہیں۔ کتنی جلدی اپنے گھر والوں سے غافل ہو جاتی ہیں۔ ان لوگوں سے جن سے برسوں محبتیں سمیٹی ہوتی ہیں۔ فقط چند الفاظ کے پیچھے' اور الفاظ بھی ایسے جن کا مفہوم تک واضح نہیں ہوتا۔'' میں نے سوچا۔

اپنی شرمندگی مٹانے کی خاطر میں نے جلدی جلدی پاپا کو چائے بنا کر دی۔ ان کے ساتھ دن بھر کی ڈھیروں باتیں کیں۔ اسی دوران پاپا کو خیال آیا۔

''فرو کا فون آیا تھا جب آپ بیڈروم میں تھیں' پوچھ رہی تھی کہ آپ اس کی عیادت کو نہیں آئیں گی؟''

"جانا تو ہے پاپا مگر آپ اکیلے ہو جاتے ہیں۔" میں نے تامل سے کہا۔

سارے دن کی کارگزاری پر سیر حاصل تبصرہ کیے بغیر ہم دونوں میں سے کسی کو بھی چین نہیں آتا تھا۔

"میں کب اکیلا ہوتا ہوں۔ نبیلا میرے ساتھ ہے اور آج تو بہت اچھے پروگرام آ رہے ہیں ٹی وی پر' آپ نیلوفر کی طرف ہو آئیں۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پاپا! مجھے دیر ہو جائے تو پلیز پریشان مت ہونا۔"

"آپ آرام سے گپیں لگا کر آئیں۔"

میں کمرے سے تیمور کی کتابیں اٹھا کر پاپا اور نبیلہ کو خدا حافظ کہہ کر پیدل ہی نیلوفر کی طرف چلی آئی۔

بارش ختم ہو چکی تھی' لیکن خنکی بڑھ گئی تھی۔ ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو وقت کا کس کو پتا چلتا تھا۔ میں نے اسے سارے دن کی روداد سنا دی۔

"اس کا مطلب ہے کیوپڈ کا تیر چل گیا دونوں طرف' داد دو مجھے۔" وہ ہنسی۔

"ابھی تو دوستی بھی نہیں ہوئی' تم کیوپڈ تک پہنچ گئیں۔"

"دلی کیفیات یہ ہوں اور پھر بھی مُصر ہو کہ دوستی نہیں ہوئی تو یہ میں کم از کم نہیں مانوں گی۔" وہ بولی۔

"مانو یا نہ مانو' لیکن میرے لیے کافی اور ڈرائی فروٹ لے آؤ۔ اس وقت میں بہت باقاعدگی کے ساتھ یہ چیزیں لیتی ہوں۔" میں نے قالین پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"ابھی لاتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

باہر نکلتے ہوئے ابھی وہ پورا دروازہ بھی بند نہیں کر سکی تھی کہ اس کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"ارے تیمور! تم کہاں؟"

"سوال جواب مت کرو' فوراً میرے ساتھ چلو۔" تیمور کی آواز آئی۔

میرے کان اسی سمت میں لگ گئے۔

"اب تم ہمایوں تو ہو نہیں کہ میں بغیر کچھ پوچھے تمہارے ساتھ چل پڑوں۔ کہاں جانا

ہے اور کیوں جانا ہے کا تفصیلی جواب تو دینا ہی پڑے گا۔ پھر کچھ سوچا جائے گا کہ تمہارے ساتھ چلا جائے یا نہیں۔"

"پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ خیر جمیلہ کی طرف جانا ہے۔" اس نے کہا۔

وہ بالکل انجان بن گئی۔ "کیوں؟"

"میری کچھ کتابیں رہ گئی ہیں۔" وہ بولا۔

"رہ گئی ہیں یا تم نے چھوڑ دی ہیں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے' جا کر لانی تو ہوں گی۔" وہ ہولے سے ہنسا۔

"کن چکروں میں ہو بھائی' گھن چکر بن جاؤ گے۔" نیلوفر نے اسے چھیڑا۔

"بن جاؤں گا' بن چکا ہوں۔ بس اس وقت میرے ساتھ چلی چلو' بعد میں سب کچھ میں خود سنبھال لوں گا۔"

"کیا مطلب؟ پہلے مجھے بتاؤ کہ میری سہیلی کے ساتھ سیریس ہو یا وقت گزارنا ہے صرف۔"

"I am damm serious مگر تم اب چلو بھی۔" وہ بولا۔

"اچانک اتنے سیریس کیسے ہو گئے؟" وہ جرح کرتی رہی۔

"یہ سوال جواب راستے میں نہیں ہو سکتے' پہلے ہی اتنی رات ہو گئی ہے۔ میں بات کل پر نہیں ٹالنا چاہتا۔"

"راستہ مختصر ہے' اس میں اتنے سوال جواب نہیں ہو سکتے۔"

"مجھے تو بہت طویل لگ رہا ہے راستہ۔" اس نے مصنوعی آہ بھری۔

"خیر' مجھے غرض نہیں' میرے سوال کا جواب دو۔" نیلوفر مُصر تھی۔

"تم سب مجھ سے پوچھتے تھے کہ آخر کوئی لڑکی پسند کیوں نہیں آتی اور کیسی لڑکی پسند آئے گی۔ میں نے ہمیشہ کہا تھا کہ میں اپنی پسند لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس وہ آئے گی تو میرا وجدان مجھے بتا دے گا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں' میں جان لوں گا کہ یہی لڑکی میرے لیے ہے' میری ہے۔ ایک گھنٹی سی بجے گی دل کے اندر۔

جمیلہ کو دیکھ کر ایسا ہی ہوا ہے۔ میرے دل میں ایک گھنٹی سی بجی ہے۔ میرے وجدان نے کہا ہے کہ یہی تو ہے وہ جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی میں نے جان لیا

تھا کہ اسی لڑکی کو میری زندگی میں آنا ہے' میری دنیا آباد کرنی ہے۔

حالانکہ تب تک میں نے اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ اس سے تعارف بھی نہیں ہوا تھا' پھر بھی میں جان گیا تھا۔ شام کو تم مجھے لے کر اس کے گھر گئیں تو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ احساس شدید ہوتا گیا اور آج وہ ملی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے یہ سب کچھ کہہ دوں گا۔''

تیمور کی آواز آ رہی تھی اور میں جو قالین پر دراز ہو کر بہت دلچسپی کے ساتھ اس کی اور نیلوفر کی گفتگو سن رہی تھی' اس کی آخری باتیں سن کر اٹھ بیٹھی۔ مجھے لگا کہ ماؤنٹ ایورسٹ جیسی بلند اور مشکل دیوار پل بھر میں ڈھے گئی ہو' جیسے وہ میرا اپنا ہو' مجھ سے بہت قریب۔ یوں تو کبھی کسی کے لیے میرے دل کے دروازے نہیں کھلے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ کبھی کسی نے میرے ساتھ اظہار نہ کیا ہو' لیکن مجھے کبھی کسی کی بات کا اعتبار ہی نہ ہوا تھا۔ کبھی کسی کے لیے دل کے دروازے نہیں کھلے تھے۔ وجدان نے یہ صدا نہیں دی تھی کہ میری محبت' میری زندگی کی خوشی مجھ سے صرف اتنی دور ہے کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لوں اور اس کے سب رنگ اپنی ہتھیلی کی لکیروں میں محفوظ کر لوں۔

کوئی انوکھی سی خوشی میرے وجود کو سیراب کر رہی تھی۔ ایسی خوشی جس سے بالکل نا آشنا تھی۔ کبھی محبت اس قدر اچانک میرے راستے میں آئے گی۔ یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو تیمور؟'' نیلوفر کے لہجے میں مسرت ابھر آئی۔

''تو میں کیا بکواس کر رہا ہوں۔ تم نے نہیں جانا تو نہ جاؤ' میں خود چلا جاتا ہوں۔'' انداز دھمکی آمیز تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم خود ہی چلے جاؤ۔'' وہ ہنسی۔

''تمہارا کیا خیال ہے' میں خود نہیں جا سکتا؟''

''نہیں' مجھے یقین ہے کہ تم اکیلے بھی سجو کے پاس جا سکتے ہو' لیکن اس سے کہو گے کیا؟'' وہ مزے سے پوچھ رہی تھی۔

''اس کا ہاتھ تھام کر کہوں گا کہ اپنے دل کے بند دروازے میرے لیے کھول دو۔ میں اس وقت سے تمہارا منتظر ہوں جب ابھی مصر کی سرزمین نے ''آتم'' کا وجود نہیں دیکھا۔ Sumer میں سمندر کی دیوی ''نامو'' نے زمین اور جنت کو جنم نہیں دیا تھا۔ جب یونان میں

Chaos سے دھرتی ماں ''گی'' وجود میں نہیں آئی تھی جب ایران میں Ahura Mazda پیدا نہیں ہوا تھا' جب چین کے بن تن میں ابھی ین اور یانگ بیدار نہیں ہوئے تھے۔ جب جاپان کی سرزمین ازانامی اور ازاناگی کے وجود سے بے خبر تھی۔ جب ''وشنو'' نے گلابی کنول کے ساتھ اننت کے اوپر لیٹ کر دودھ کے سمندر میں تیرنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

''سجیلہ! میں تب سے تمہارا منتظر ہوں۔''

تیمور کہہ رہا تھا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ میں اس کے الفاظ اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ نیلوفر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''دیکھو تیمور! یہی سب دہرانا' ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونا چاہیے اور ہاں ہاتھ ضرور تھامنا۔''

یہ کہتے ہوئے نیلوفر نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔

میں قالین پر بیٹھی دروازے کی سمت ہی تک رہی تھی۔ تیمور کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ خوش بھی بہت ہوا تھا۔

''تم سجو کو بتاؤ کہ کب سے اس کے منتظر ہو' میں اتنے میں کافی اور ڈرائی فروٹ لاتی ہوں۔''

نیلوفر وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔

تیمور نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا اور میرے قریب ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

''وہ سب جو میں کہہ رہا تھا تم نے سن لیا یا میں پھر دہرا دوں؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سب سن لیا ہے۔'' میں نے قالین کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ میری زبان کی نہیں دل کی آواز ہے' اس لیے پلیز میرے اور اپنے درمیان جو ماؤنٹ ایورسٹ کھڑی کی ہے تم نے وہ گرا دو۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ محبت کرنے کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب؟ کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ایک زندگی محبت کرنے کے لیے تھوڑی ہوتی ہے اور پھر یہ بھی کیا

خبر کہ زندگی کتنی ہے' اس لیے محبتوں کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھنا چاہیے اور جہاں جتنی بھی ملے اسے سمیٹ لینا چاہیے۔''

مجھے اس کی سنجیدگی سے الجھن ہو رہی تھی۔

''یوں بھی ہم ٹین ایجرز نہیں ہیں کہ فلرٹ میں وقت ضائع کریں یا خاموشی سے ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار رہنے کے بعد آنکھوں میں آنسو بھر کر الگ الگ شادی کر لیں۔ اتنے بڑے تو ہو ہی چکے ہیں کہ اپنے بارے میں کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں۔''

مجھے اس کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا' مگر اس کی سنجیدگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''یہی بات تم ذرا شگفتگی سے بھی کر سکتے ہو۔ اتنا دل دہلا دینے والا لہجہ کیوں اختیار کیا ہوا ہے؟''

وہ ہنس پڑا۔ ہنستے ہوئے وہ بہت اچھا لگتا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ ہماری زندگی بہت لمبی ہو گی اور اس میں محبت کرنے اور لڑنے دونوں کے لیے ہی بہت وقت ہو گا۔ اس وقت تم صرف اپنے ایگزام پر توجہ دو۔'' میں نے کہا۔

اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی اور اس قدر آرام سے مان جاؤں گی۔ وہ بھی ایسے انداز میں جیسے اس کا اظہار بھی لمحہ بھر پہلے کی بات نہ ہو' بلکہ یہ واقعہ خاصا پرانا ہو چکا ہو' لیکن جب دل مان چکا تھا تو خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ تھا۔

ہم دو پرانے گہرے دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے' جب نیلوفر کافی اور ڈرائی فروٹ لائی۔

''مان لو یہ اکیسویں صدی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ابھی تک بات ایک طرف یقین دہانیوں اور دوسری جانب شرمانے گھبرانے سے آگے نہیں بڑھی ہو گی۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ نئی صدی میں لوگ ان باتوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔''

''جب بالآخر ماننا ہی ہے تو وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟''

میں نے ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اپنی جانب کھسکائی۔

''کسی اور کو بھی پوچھ لیتے ہیں ہم! تازہ محبتوں میں ایک دوسرے کو تازہ گلاب پیش کیے جاتے ہیں۔ تم کیسی ہو کہ ڈرائی فروٹ تک پیش نہیں کر رہیں۔''

نیلوفر نے تیمور کو کافی کا مگ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''تازہ گلاب یہ پیش کر دے گی' کیونکہ وہ کھا نہیں سکتی' ڈرائی فروٹ نہیں دے گی۔ اس کے ساتھ ایک مرتبہ ڈنر کر کے ہی مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کی محبت کھانے کی پلیٹ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔'' تیمور کافی میں چمچ چلاتے ہوئے بولا۔

میں ہنس پڑی۔

''کیا درست اندازہ ہے۔ میری سب سے پہلی محبت کھانا ہے۔ پیٹ بھرا ہو تو اس کے علاوہ کچھ سوجھتا ہے' ورنہ اس کی فکر لگی رہتی ہے۔''

''کیا حقیقت پسندی ہے۔'' تیمور نے کہا۔

''ہونی چاہیے۔ یہ دور افسانوی اور فلمی نہیں ہے۔ لوگ اب ان باتوں سے باہر نکل آئے ہیں۔'' میں نے کاجو کھاتے ہوئے کہا۔

کافی پی کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب میں چلتی ہوں۔ پاپا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔'' تیمور بھی کھڑا ہو گیا۔

''میں نہیں چلوں گی۔ ایک تو اس لیے کہ اتنی سردی میں باہر نکلی تو مزید ہفتہ بھر بستر میں گزارنا پڑے گا اور دوسرے اس لیے کہ میں ساتھ چلی تو دونوں دل ہی دل میں بہت گالیاں دو گے مجھے کہ خواہ مخواہ کباب میں ہڈی بن گئی۔'' نیلوفر برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ ہوا تیز نہیں تھی پھر بھی ٹھنڈک میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ بادلوں کی ٹکڑیوں نے آسمان کو ایسے ڈھانپ رکھا تھا کہ ایک بھی ستارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاریکی بہت گہری تھی۔

''اف! کتنی سردی ہو گئی ہے۔'' میں نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے رگڑ کر انہیں گرمائش پہنچانے کی کوشش کی۔

''لاہور کی سردی ہی کتنی ہوتی ہے۔'' تیمور نے جیکٹ اتار کر میرے کندھے پر ڈال دی۔

اس بھاری لیدر جیکٹ سے بروٹ اور مالبرو کے سگریٹ کی ملی جلی مہک آ رہی تھی۔ گرم جیکٹ پہن کر ایک دم اچھا لگا۔

"یہ مت کہنا کہ سردی نہیں ہے۔ اچھی خاصی سردی ہے۔ میرے تو دانت بجنے لگتے ابھی تھوڑی دیر میں۔" میں نے جیکٹ اپنے گرد لپیٹی۔ "لیکن یہ کتنی بھاری ہے' میرے تو کراما کاتبین چلا اٹھیں گے۔"

وہ ہنس پڑا۔

"پھر تو انہیں مصروف رکھنے کا اچھا طریقہ ہے۔ تھوڑی دیر تک رجسٹر بند رہے گا۔"

میں نے چند گہرے سانس لے کر جیکٹ سے اٹھتی مہک کو اپنے اندر جذب کیا۔ اپنے جسم پر اسے اچھی طرح محسوس کیا۔ یہ احساس بہت خوشگوار تھا۔

"دیکھو راستہ کتنا چھوٹا ہے۔" تیمور نے کہا۔

ہم گھر کے گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ وہ رک گیا۔

"اچھا وقت جلدی بیت جاتا ہے' نہیں؟"

"سردیاں ہیں' اس لیے دن چھوٹے ہو گئے ہیں۔" میں ہنسی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا' یہ احساس مجھے شدت سے ہوتا ہے کہ اچھا وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے' لیکن برا وقت شاید ٹھہر ہی جائے گا۔"

"پلیز تیمور! کیا ہو گیا ہے تمہیں' کون سا برا وقت کہاں کا برا وقت۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم اتنے وہمی ہو گے۔ اتنی تو لڑکیاں ہی وہمی ہوتی ہیں۔"

"اب بہرحال مجھے ایک اطمینان ہے کہ میری تلاش ختم ہو گئی۔ میرے دل اور میری دنیا میں تو آ ہی گئی ہو' گھر میں بھی آ جاؤ گی۔"

"ہاں' ان شاء اللہ۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"چلو اندر چلیں۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں باہر ہی روک لیا۔" وہ بولا۔

"سنو تیمور!" میں وہیں کھڑی رہی۔ "تمہاری ممی اور پاپا مجھے اوکے کر دیں گے؟ ممکن ہے ان کی نگاہ میں کوئی اور لڑکی ہو۔"

"ممی کی نگاہ میں تو بیسیوں لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے انتخاب بہت مشکل بھی ہے۔ میں نے پہلے ہی دن انہیں بتا دیا تھا کہ جس کی تلاش تھی وہ مجھے مل گئی ہے میں جانتا ہوں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور پھر تم میں کون سی کمی ہے کہ انہیں اعتراض ہو؟"

"چلو اندر چلتے ہیں۔" میں گیٹ کھول کر اندر بڑھی۔ نبیلہ اور پاپا لاؤنج میں تھے۔ مخلوط

تعلیمی اداروں میں پڑھنے اور کلاس فیلو لڑکوں سے دوستی کے باوجود میں نے ہمیشہ سبھی سے فاصلہ رکھا تھا۔ کبھی کبھار کام وغیرہ کے سلسلے میں ان کے فون بھی آ جاتے تھے لیکن کبھی کوئی لڑکا میرے ساتھ گھر نہیں آیا تھا۔ جب ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو نبیلہ اور پاپا کا چونکنا عجیب بات نہیں تھی' لیکن انہوں نے اپنے محسوسات ظاہر نہیں ہونے دیئے۔ پاپا پہلے کی طرح گرم جوشی کے ساتھ تیمور سے ملے۔ نبیلہ کا انداز بھی دوستانہ تھا۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی وقت مجھے خیال آیا۔

"تیمور! تمہاری جیکٹ۔"

اس نے "تھینک یو" کہہ کر جیکٹ میرے ہاتھ سے لے لی۔

اگلے روز کے لیے کپڑے استری کرتے وقت میں اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی' جب نبیلہ میرے پاس چلی آئی۔

"مجھے بتائے بغیر کیا چکر چلا لیا تم نے؟"

"چکر! کیسا چکر؟ چھوڑو بیلا چکر وکر چلتے ہیں ٹین ایج میں' ہم بڑے ہو چکے ہیں۔"

میں بدستور قمیص پر استری پھیرتی رہی۔

"چکر نہیں تو جو کچھ بھی ہے' تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہم میں کیا کبھی کوئی سیکرٹ رہا ہے۔ مار ڈالنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"اس لیے نہیں بتایا کیونکہ یہ انکشاف مجھ پر بھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہوا ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔ اتنی جلدی نوبت جیکٹ پر بھی پہنچ گئی۔" وہ مسلسل میرے سر پر کھڑی تھی۔

"بھئی یہ تو بقول تمہارے "چکر" کے بغیر بھی ممکن ہے۔ مینرز کہتے ہیں کہ اگر لڑکی کو سردی لگ رہی ہو تو لڑکے کو اسے اپنی جیکٹ دے دینی چاہیے۔ چاہے خود بیچارا اکڑ کر کیوں نہ مر جائے۔ بالکل ایسے جیسے روتی ہوئی لڑکی کو رومال پیش کرنا۔ محبت نہیں اچھے مینرز کی وجہ سے ضروری ہے۔" میں نے استری بند کر دی۔

"اگر تمہارا خیال ہے کہ میں ٹل جاؤں گی تو یہ غلط ہے یہ چیٹ پٹی کہانی میں ضرور سنوں گی۔"

”چلو کمرے میں چلتے ہیں۔“

ہم دونوں بستر پر بیٹھ گئے۔ لحاف اپنے اوپر ڈال کر میں نے اسے شروع سے آخر تک سارا قصہ سنا دیا۔

”اللہ! ہاؤ رومینٹک۔“ نبیلہ کی دلچسپی عروج پر تھی۔

”ویسے تیمور اچھا لڑکا ہے ناں؟“ میں نے بھی شوق سے دریافت کیا۔

”اچھا، بہت ہی اچھا ہے، لیکن اس ڈاکٹر کا کیا ہوگا جو تمہارا امیدوار ہے اور کافی دن سے امیدوار ہے؟“ نبیلہ کو اچانک خیال آیا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اسے جھنڈی دکھا دو۔ تم اور پاپا دونوں جانتے ہو کہ میں شادی اپنی پسند سے کرنا چاہتی ہوں۔ اس بات پر کبھی کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا۔ البتہ میں دیکھ رہی تھی کہ پاپا اس ڈاکٹر کو انکار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں پاپا کا پرابلم بھی سمجھتی ہوں، وہ بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہیں، چاہتے ہیں کہ ہم بہنوں کو جلد از جلد اپنے گھروں میں آباد دیکھ سکیں۔

بہرحال وہ بات گئی۔ تیمور پر پاپا کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کی فیملی اچھی ہے، گرونڈ ہے۔ سول سروس کے امتحان میں بھی ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ مجھے اتنی سیکیورٹیز کی ضرورت نہیں ہے جتنی پاپا چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹیوں کو ملے، لیکن پاپا کے نقطۂ نظر سے جس قدر سیکیورٹیز کی ضرورت ہے وہ تیمور باآسانی دے سکتا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

”میرا خیال تھا کہ رات کو پاپا کے سامنے تمہاری پیشی ہوگی لیکن شاید وہ تمہیں کچھ وقت دینا چاہتے ہیں۔“ نبیلہ نے کہا۔

”میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں۔ ذہنی طور پر بھی کچھ تیار ہونا چاہتی ہوں۔“

اور پاپا نے ایسا ہی کیا۔ میرے ساتھ ان کا رویہ حسب معمول ہی رہا۔ میں اسی طرح صبح آفس جاتی تھی واپسی پر ان کے ساتھ چائے پیتی تھی۔ باتیں کرتی تھی۔ ہر شام تیمور ضرور آتا تھا۔ پاپا اس کے ساتھ پہلے دن والے طریقے سے ہی ملتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ یوں گھل مل گیا تھا جیسے اسی گھر کا فرد ہو۔ جو کچھ وہ پڑھتا تھا اس میں میری دلچسپی صفر تھی لیکن پاپا کے ساتھ اس کی خوب محفل جمتی تھی۔

اس روز بھی ہم سب لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے وہ پاپا کو بتا رہا تھا کہ اس کی امتحان کی تیاری کہاں تک پہنچی تھی۔

”بس بمشکل چھ سات ماہ رہ گئے ہیں تمہارے امتحانوں میں۔“ نبیلہ نے چائے کی پیالی تیمور کی طرف بڑھائی۔

”میرے لیے بہت ہیں۔ میری تیاری ٹھیک ٹھاک جا رہی ہے۔“ اس نے پیالی پکڑی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تم کیوں نہیں سی ایس ایس کرتیں؟“

”یہ جو کچھ تم پاپا اور نبیلہ کے ساتھ باتیں کرتے ہو وہ سب میرے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ میری فیلڈ آرٹ اور ڈیزائن ہے۔ یہی میرے لیے بہت ہے جتنا تم پڑھتے ہو اتنا تو میں ساری زندگی نہیں پڑھ سکتی۔“ میں نے کہا۔

”یہ بہت نکمی ہے۔ اسکول اور کالج تک اسے ایک کام ہی آتا تھا اور وہ تھا آرٹ۔ اس نے این سی اے میں داخلہ بھی اسی لیے لیا تھا کہ کچھ پڑھنا نہیں پڑے گا۔ کچھ اور پڑھنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ این سی اے میں اس کے مزے تھے۔ ادھر ڈیک لگا ہوا ہے اور ادھر یہ کام کر رہی ہے۔“ نبیلہ بولی۔

”اب ایسا آسان بھی نہیں ہے این سی اے میں پڑھنا جتنا تم کہہ رہی ہو۔ دن رات ایک کیا تھا۔ آنکھیں پھوڑی ہیں تب جا کر آنرز ملا تھا۔ مفت میں کسی نے نمبر نہیں دے دیئے تھے۔“ میں نے کہا۔

”بہرحال میں اسے پڑھائی نہیں مانتا۔“ تیمور نے فیصلہ سنایا۔ ”کسی محفل میں عقل کی بات ہو رہی ہو۔ تمہارے ہونٹ سلے رہتے ہیں۔ اب تمہیں ایسا کرنا ہے کہ کل میرے ساتھ قائداعظم لائبریری چلنا ہے اور کچھ نوٹس بنانے میں میری مدد کرنی ہے۔ شاید تم بھی اس سے کچھ حاصل کر لو۔“

”میں؟ مجھے بہت بورنگ لگتا ہے یہ سب۔“

”میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ ایسا کرنا کیسا لگتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ کل تمہیں آنا ہے سو کل تمہیں آنا ہوگا۔“

اس طرح مجھے کب کسی نے دھونس دی تھی اور دی ہوتو میں نے کب مانی تھی لیکن تیمور کا انداز مجھے قطعاً برا نہیں لگا۔

''اچھی دھونس ہے۔'' میں ہنسی۔

''بالکل ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''شکر ہے کوئی تو تجھ کو راہِ راست پر لانے والا ملا۔'' نبیلہ نے مصنوعی سکون کا سانس لیا۔

اسی رات پاپا کے دربار میں میری پیشی ہو گئی میں صبح کے لیے کپڑے استری کر رہی تھی کہ نبیلہ میرے پاس چلی آئی۔

''چلو! پاپا نے بلایا ہے۔''

''ابھی آتی ہوں' کپڑے استری کرلوں۔'' میں بدستور مگن رہی۔

''ارے لڑکی یہ خاص والا بلاوا ہے کیا سمجھیں؟'' اس نے پیچھے سے استری بند کر دی۔

میرے ہاتھ بھی رک گئے۔ ''سچ کہہ رہی ہو؟''

''جھوٹ کیوں بولوں گی؟''

''تیور کیسے ہیں ان کے؟'' میں نے رازداری سے پوچھا۔

''تیور تو ٹھیک ہی ہیں۔ بظاہر کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔'' نبیلہ نے اطلاع دی۔

''پھر تو ٹھیک ہے۔''

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے پاپا کی خواب گاہ میں پہنچے' وہ اپنی راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے پائپ پی رہے تھے۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کسی سوچ میں گم تھے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔

''بیٹا! مصروف تو نہیں تھیں؟''

''نہیں۔'' میں بولی۔

''میں تمہید باندھنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ میں تیمور کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

میں نے اور نبیلہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''جی پاپا؟'' بالآخر میں بولی۔

''میں نہیں چاہتا کہ آپ بچیوں کی زندگی بھی میں ہی بسر کروں اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ

آپ لوگوں کی زندگی سے بالکل ہی خارج ہو جاؤں۔ میں ان دونوں باتوں کے درمیان ایک صحت مند بیلنس رکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے آپ لوگوں کی زندگی میں کبھی بے جا مداخلت نہیں کی اور دوسری جانب پیار اور محبت سے آپ کو یہ بھی سمجھا دیا کہ میں آپ کے گرد ایک حصار کھینچ رہا ہوں اور یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ آپ لوگ اس کی حد کو عبور کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ دونوں نے بھی میرے کہے بغیر یہ سب سمجھا اور اس پر عمل کیا۔

آپ لوگوں نے جو کچھ چاہا میں نے کوشش کی کہ آپ کو دے سکوں۔ آپ کو اس حد تک تعلیم دلوائی کہ اگر زندگی میں کبھی ضرورت پڑے تو آپ کو کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اس کے بعد ماں باپ کا کام اشارہ جاتا ہے کہ اولاد کو راستے کا نقشہ دے دیا جائے' انہیں سمجھا دیا جائے کہ کون سا راستہ ان کے لیے بہتر ہے' ہر وقت کسی کی انگلی پکڑ کر اسے نہیں چلایا جا سکتا۔ یوں بھی ایک وقت ایسا آتا ہے جب والدین کو زندگی گزارنے کے لیے بہت سے اختیارات اپنی اولاد کو دینے پڑتے ہیں۔

نیلا نے اپنی مرضی سے یہ اختیارات میرے حوالے کیے تھے۔ سب والدین اپنی اولاد کو بہت خوشیاں دینا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ افسوس کہ میرا فیصلہ غلط ثابت ہوا۔ میں اس بات پر خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔''

''پلیز پاپا!'' نبیلہ ان کی افسردگی دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ ''ایسا مت سوچیں' آپ نے جان بوجھ کر تو کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ کون انسان ہے جو پہلے سے جان لے کہ اس کا فیصلہ درست ہو گا یا غلط۔ مستقبل میں کیا ہو گا' یہ علم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کس کے پاس ہے؟ آپ کیوں اپنے دل پر بوجھ رکھتے ہیں۔ جب مجھے کوئی ملال نہیں ہے۔ کیا یہ اللہ کا کرم نہیں ہے کہ اس نے ہمیں بڑی تکلیف سے بچا لیا۔ اگر خدانخواستہ رخصتی کے بعد حالات بگڑتے تو کیا ہوتا۔''

پاپا مزید افسردہ ہو گئے۔ ''یہ دکھ بھی معمولی نہیں ہے اور ایسا میرے غلط فیصلے کے باعث ہوا۔''

نبیلہ کا دکھ ہم سب کا مشترکہ دکھ تھا۔ گھر کے ہم تینوں افراد ایک ہی اکائی تھے۔ ہم ایک دوسرے کو بہت اندر تک بہت گہرائی تک جانتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہنستے تھے ایک دوسرے کے دکھ پر مل کر روتے تھے۔

نبیلہ نے اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کا اختیار پاپا کو دے رکھا تھا۔

''جو پاپا کریں گے' مجھے منظور ہوگا۔ کتنی قربانیاں دی ہیں انہوں نے ہمارے لیے ہم انہیں اس کا رتی بھر بھی نہیں لوٹا سکتے۔ بس اتنا کر سکتے ہیں کہ انہیں خوش رکھیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میری زندگی پر مجھ سے زیادہ ان کا حق ہے۔ آج میں جو کچھ ہوں' ان ہی کی وجہ سے ہوں۔'' وہ کہتی تھی۔

اور پاپا نے اپنی طرف سے بہترین فیصلہ کیا تھا۔ ہم تینوں خوش تھے۔ مطمئن تھے۔ تب نبیلہ ماسٹرز میں تھی۔ کتنی جوتیاں گھسائی تھیں ان لوگوں نے یہ رشتہ لینے کے لیے۔ رشتہ منظور ہوا تو پہلے منگنی پر اصرار کرنے لگے اور پھر نکاح پر۔

''رخصتی بے شک نبیلہ کے ایم۔ اے کے بعد دے دیں۔'' ان لوگوں نے کہا۔

پاپا نکاح پہلے نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ان لوگوں نے اس قدر اصرار کیا کہ پاپا بھی راضی ہو گئے۔ بس نکاح ہونے کی دیر تھی کہ ان لوگوں کے گن بھی کھلنے لگے۔ ان کے پاس سب کچھ تھا پھر بھی مزید کی طلب نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔ والدین فقیر ہوں تب بھی بیٹی کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ دے کر ہی رخصت کرتے ہیں اور پاپا کا ہمارے سوا اور کون تھا۔ ان کی طرف سے آنے والی ایک فہرست منظور کرنا بھی پاپا کے اصولوں کے خلاف تھا۔ لیکن نکاح ہو چکا تھا اس لیے لحاظ میں آ کر خاموشی سے وہ مطالبات قبول کر لیے۔ ایک مرتبہ راستہ کھل جائے تو پھر اسے کون بند کر سکتا ہے۔

جب یہ روز کا معمول ہو گیا اور پاپا نے بھی خاموشی اختیار کیے رکھی تو ایک دن میں ان سے الجھ پڑی۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے پاپا! آپ ان لوگوں کو منع کریں یہ کیا طریقہ ہے؟''

میں جانتی تھی کہ وہ خود بھی اس سلسلے میں پریشان تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں انہیں بہتری کی امید تھی۔

''یہ سب کچھ وہی تو ہے جو ویسے بھی ہم نے بیلا کو دینا ہی تھا۔'' انہوں نے مجھے تسلی دینی چاہی۔

''وہ دوسری بات ہے' جو ہم اپنی مرضی سے دے دیں' وہ ہمارا اختیار ہے لیکن بیلا کے سسرال والے کوئی ہنولنس دیں' مطالبہ کر کے کچھ حاصل کریں وہ غلط ہے۔ آپ کو پہلی مرتبہ ہی انکار کر دینا چاہیے تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ان کی بات مانی تو ان کا منہ ہی کھل گیا۔''

''آپ پریشان مت ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کب ٹھیک ہوگا؟ جب ہم کنگال ہو جائیں گے؟ پاپا میں آپ کو بتا دوں' یہ لوگ کسی بھی حد پر بس کرنے والے نہیں ہیں۔ ابھی تو رخصتی نہیں ہوئی جب رخصتی ہو جائے گی تو اور زیادہ منہ پھاڑ کر چیزیں مانگیں گے۔ کب تک آپ یہ سب پورا کرتے رہیں گے؟

ان لوگوں نے آپ کی اعلیٰ پوسٹ دیکھ کر سمجھا ہے کہ پتا نہیں آپ کس سونے کی کان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک دیانتداری اور ایمانداری کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ان کے خیال میں باقی سب کے ساتھ ساتھ آپ بھی لوٹ مار میں شریک ہیں اور اسی لیے وہ لوٹ کے مال سے بٹورنا اپنا حق سمجھ رہے ہیں۔

آپ پلیز ان لوگوں سے بات کریں۔ میں تو پہلی مرتبہ ہی آپ کو ان کا مطالبہ ماننے سے منع کرنے لگی تھی' پر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ آپ بہتر فیصلہ کریں گے' لیکن اب میں چپ نہیں رہ سکتی۔ سوچ سوچ کر آپ نے اپنی صحت تباہ کر لی ہے۔ پاپا شادی کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن اس سے بھی ضروری یہ ہے کہ ایسا رشتہ خوشیوں کے لیے قائم کیا جائے' زندگی جہنم بنانے کے لیے نہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک بیلا کی کوئی وقعت نہیں ہے' انہیں وہ پیسا پیارا ہے جو اس کے ساتھ ساتھ ان کے گھر میں داخل ہوگا۔ میری بات کا یقین نہ آئے تو اس مرتبہ انکار کر کے دیکھ لیں۔''

''سجو بیٹا! یہ معاملے جلد بازی سے خراب ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ نمائشی ہوتے ہیں لیکن برے نہیں ہوتے ہیں' لیکن ان کا دل اتنی سی بات سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ ان کی بہو گریڈ بیس کے افسر کی بیٹی ہے اور اتنا جہیز لائی ہے کہ ان کا گھر بھر گیا ہے' وہ بہو کو تکلیف نہیں پہنچاتے کیونکہ دل کے برے نہیں ہوتے۔ بس ناک اونچی رکھنا چاہتے ہیں۔'' پاپا نے کہا۔

مجھے مزید تاؤ آ گیا۔ ''اور بیلا کے سسرال والے تو دل کے بہت ہی اچھے ہیں۔ تب ہی آپ کی صحت کا یہ حال ہو گیا ہے۔ جس کی جتنی عقل چھوٹی ہوتی ہے اور جو جتنا جاہل ہوتا ہے' اس کی ناک اتنی ہی اونچی ہوتی ہے۔ ناک کی اونچائی ناپنے میں اپنی زندگی بھی اجیرن کیے رکھتے ہیں اور دوسروں کی بھی۔''

''آپ جا کر اپنا کام کریں' یہ میرا مسئلہ ہے' اسے میں خود ہی سلجھا لوں گا۔'' پاپا نے بات ختم کرنے کا سگنل دے دیا۔

نبیلہ جو گیلری میں کھڑی ہو کر لاؤنج میں ہونے والی یہ گفتگو سن رہی تھی' اندر آ گئی۔ اسے دیکھ کر ہم دونوں چونک گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ باہر لان میں ہو گی۔ ہاتھ میں پکڑی کتابیں اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھیں اور پاپا سے مخاطب ہوئی۔

''آئی ایم سوری پاپا! میں اس معاملے میں نہیں آنا چاہتی تھی لیکن آ رہی ہوں۔ نہ تو میں کم عقل ہوں اور نہ بے حس۔ میں سب کچھ دیکھ بھی رہی ہوں اور محسوس بھی کر رہی ہوں۔ بات یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ڈائمنڈ کے سیٹ کا مطالبہ کیا جو اللہ کے فضل سے بہت پہلے ہم دونوں بہنوں کے پاس ہیں۔ بات اس کے پیچھے ان کی نیت کی ہے۔ پلیز پاپا میری آپ سے ریکویسٹ ہے آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ مزید مطالبے نہ کریں جو آپ کی استطاعت اور میری قسمت میں ہو گا' وہ میں خود ہی لے آؤں گی۔''

میں اور پاپا خاموش بیٹھے رہے' نبیلہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں اپنے اسٹوڈیو میں رات گئے تک کام کرنے کی عادی تھی اور وہاں سے مجھے پاپا کے کمرے کی بتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ نبیلہ کی خواب گاہ کا دروازہ بند تھا' وہ ہمیشہ دروازہ بند کر کے پڑھتی تھی۔ اس روز نہ جانے وہ پڑھ رہی تھی یا کچھ سوچ رہی تھی بہر حال بند دروازے کے نیچے کی درز سے اس کے کارنر لیمپ کی زرد سی روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

میرا دل ایک دم کام سے اچاٹ ہو گیا۔ چیزل اور ہتھوڑی وہیں چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس رات ہم تینوں میں سے کوئی نہیں سویا تھا۔ صبح کے وقت نبیلہ ہم دونوں سے زیادہ فریش تھی۔

تین دن خاموشی سے سرک گئے۔ ہم تینوں نے اس بارے میں ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی پھر بھی ہم سب کا خیال تھا کہ جمعہ کے روز نبیلہ کی سسرال سے ضرور کوئی نہ کوئی آئے گا۔ وہ لوگ بہت تواتر سے ہمارے ہاں چکر لگایا کرتے تھے۔ ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا' شام کو اس کی ساس' نند اور دیور آ گئے۔ میں ڈائننگ روم میں کھڑی ٹرالی سیٹ کر رہی تھی کہ باہر ان کی کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ میں لاؤنج میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد پاپا بھی اندر داخل ہوئے' وہ واضح طور پر بہت اپ سیٹ تھے' وہ لوگ لان میں بیٹھے تھے اور

وہیں سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے پاپا کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں بیٹا! اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔'' انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

رات کو میں اور نبیلہ باہر واک کرتے ہوئے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ میں نے اچانک اس سے پوچھا۔

''بیلا! تمہارا اپنے سسرال والوں کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''افسوس کہ وہ ویسے نہیں ہیں جیسا میں نے سوچا تھا۔ مجھ میں ہر برا اچھا برداشت کرنے کی بہت صلاحیت ہے لیکن ہجو! انسان یہ سب برداشت تب کرتا ہے جب اسے احساس ہو کہ جس کے لیے وہ تکلیفیں اٹھا رہا ہے' اس کے اندر شرافت ہے' یہ ایک خوبی انسان کی سب خامیوں پر بھاری ہوتی ہے کیونکہ ہم سب میں بھی بہت سے عیب ہیں' بہت سی برائیاں ہیں۔ کوئی بھی مکمل نہیں ہوتا لیکن مجھے ان کے اندر شرافت نظر نہیں آتی۔ تم محسوس نہیں کرتیں کہ بنیادی طور پر یہ لوگ کمینے ہیں۔ ان کے اندر انسانیت اور شرافت نہیں ہے۔''

میں رک گئی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ بیلا میرے سامنے اتنے واضح انداز میں وہ سب کہہ دے گی جو میں بھی محسوس کر رہی تھی۔

''ہم اتنے بڑے تو ہو چکے ہیں ناں ہجو کہ یہ سب جان سکیں اور جب جانتے اور سمجھتے ہیں تو خود سے کیوں جھوٹ بولیں۔ جب تک حقیقت کو قبول نہیں کریں گے' تب تک مسائل سلجھیں گے بھی نہیں۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''بیلا! تم ایسے لوگوں کے درمیان کیسے رہ پاؤ گی۔''

''میرے لیے پاپا بہت اہم ہیں ہجو! تم کیا کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ میں ان سے کتنی محبت کرتی ہوں' وہ خود بھی نہیں۔ ان کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ ایسے لوگوں کے درمیان رہ بھی سکتی ہوں۔''

''بیلا! تم پاگل ہو گئی ہو۔ میں بھی پاپا سے بہت محبت کرتی ہوں اور اسی لیے ان کے غلط فیصلے پر احتجاج کر رہی تھی۔ تم سمجھتی ہو کہ ان کی خاطر سولی پر چڑھ جاؤ گی تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ شاید پہلے بھی اس رشتے کے طے ہو جانے پر ہم سب خوش اور مطمئن ہوں لیکن اب ہم تینوں میں سے کوئی بھی نہ خوش ہے اور نہ مطمئن۔ پاپا تمہاری شادی پر بھی خوش نہیں ہوں گے

اور میں اندازہ کرسکتی ہوں کہ شادی کے بعد تمہیں کن حالات سے گزرنا ہوگا۔ تمہاری تکلیفیں پاپا کو توڑ کر رکھ دیں گی۔ اس لیے پلیز تم ان سے یہ مسئلہ ضرور ڈسکس کرو۔ انہیں لمحاتی خوشی دے کر ساری زندگی کے عذاب میں مبتلا نہ کرو۔"

نبیلہ میری طرف ایک ٹک دیکھ رہی تھی پھر بالآخر بولی۔ "تمہارا ذہن جن خطوط پر سوچ رہا ہے' فی الحال میں ان پر نہیں سوچنا چاہتی پاپا کو فیصلہ کرنے دو۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔ جس سے میں دکھ میں مبتلا ہوں۔"

ان دنوں شاید میں پاپا اور نبیلہ سے بھی زیادہ اپ سیٹ تھی یا شاید وہ مجھ سے کہیں زیادہ پریشان تھے' لیکن ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ مجھے پاپا اور نبیلہ دونوں پر غصہ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ پاپا کی خاموشی نبیلہ کو کسی گہری کھائی میں گرا دے گی اور نبیلہ بھی اس کھائی میں گرنے کو تیار تھی اسے کوئی ملال نہیں تھا۔

یہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں بات بات پر دونوں سے الجھ پڑتی تھی۔ رو پڑتی تھی۔ نیلوفر سے بھی میری لڑائیاں تواتر سے ہونے لگیں۔ حالانکہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے لڑائی جھگڑا سخت ناپسند تھا لیکن نہ جانے کیا ہو گیا تھا مجھے۔

انہی دنوں میرے لیے ایک آرمی آفیسر کا پروپوزل آیا۔ پاپا اور بیلا نے مجھ سے پوچھا' یہ احساس مجھے بہت بعد میں ہوا کہ اس روز میرا رویہ انتہائی نامناسب تھا۔ مجھے خود علم نہیں کہ آخر مجھے اتنا غصہ کیوں آ گیا تھا۔

"بہت شکریہ' میں اس قسم کی شادیوں کی قائل نہیں ہوں' جب بھی کرنا ہوئی شادی' میں اپنی پسند سے ہی کروں گی۔ فیصلہ درست ہو یا غلط لیکن وہ میرا اپنا فیصلہ ہوگا۔ اگر تمہاری طرح مجھے بھی ساری زندگی پچھتانا ہے تب بھی کسی اور کے بجائے میں اپنے فیصلے پر پچھتانا زیادہ پسند کروں گی۔" میں غصے میں پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں جانتی ہوں کہ میں نے ان دونوں کے زخم بری طرح اُدھیڑ دیئے تھے۔ اپنے بستر پر گر کر روتے ہوئے میں نے خود کو بہت لعنت ملامت بھی کی لیکن وہ دونوں جو میرے بہت پیارے تھے انہوں نے اپنے زخم چھپا کر میری دلجوئی کی' میرے زخموں پر مرہم رکھا۔

نبیلہ کے سسرال والوں نے شکوہ کیا تھا کہ ہمارے گھر میں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مزید بے عزتی سے بچنے کے لیے وہ وہاں سے چلے آئے تھے۔ میں پاپا

کو جانتی تھی' اس روز وہی اس کے سسرال والوں سے ملے تھے اور وہ کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے جس سے ان لوگوں کی بے عزتی کا کوئی پہلو نکلتا۔ میں نے پاپا سے اس بارے میں استفسار کیا۔

"میں نے بہت شائستگی سے ان سے کہا تھا کہ جو کچھ میری استطاعت اور میری بیٹی کی قسمت میں ہوا' وہ سب کچھ بغیر کہے مل جائے گا۔" مجھے بھی یہی شک تھا' میں پھر پاپا سے اُلجھ پڑی۔

"دیکھ لیا ناں آپ نے یہ ہے ان لوگوں کا اصل۔ اتنی سی بات کا کیا بتنگڑ بنایا انہوں نے۔ آپ کہتے تھے کہ نمائشی لوگ ہیں لیکن دل کے اچھے ہیں۔ اب تو پتا چل گئی ناں آپ کو ان کی اچھائی۔"

پھر پاپا نے بھی فیصلہ کن قدم اٹھایا۔ "بیٹا! آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ یہ رشتہ خوشیوں کے لیے قائم کیا جاتا ہے' زندگی جہنم بنانے کے لیے نہیں' یہ فیصلہ غلط تھا اور اس پر ان ہی حالات میں قائم رہنا اس سے زیادہ غلط ہوگا۔"

پاپا نے آخری وقت تک کوشش کی کہ حالات سنور جائیں لیکن یہ ہوا نہیں اور بات طلاق پر پہنچ کر ختم ہوئی۔ پاپا بہت اداس تھے اور میں رو رہی تھی لیکن پتا نہیں نبیلہ کس مٹی کی بنی تھی۔ وہ بظاہر اطمینان سے معمول کے مطابق کام سرانجام دیتی رہی۔ جب ہم دونوں نے دوپہر کے بعد رات کے کھانے سے بھی انکار کر دیا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پاپا کی خواب گاہ میں لے گئی۔

"کیا ہوا ہے آپ دونوں کو' کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟" اس نے پوچھا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔"

"دل کیوں نہیں چاہ رہا؟"

"پلیز بیلا! جرح مت کرو۔" میں جھنجھلا گئی۔

"آئی ایم سوری پاپا' لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ لوگ ناشکرے بھی ہیں اور آپ لوگوں کا ایمان بھی کمزور ہے۔ پلیز آپ لوگ قبول کریں کہ مجھے طلاق ہو گئی ہے اور اسی میں میری بہتری تھی' وہ لوگ زہریلے سانپوں جیسے تھے اور اس رشتے کے قائم رہنے کا مطلب تھا کہ مجھے ساری زندگی ان سانپوں کے درمیان گزارنا پڑتی۔ پھر شاید برسوں بعد کسی

دن اچانک ہی میری برداشت کی حد ختم ہو جاتی لیکن تب تک ان سانپوں کے ڈسنے سے میرا جسم اور میری روح بھی زہر آلود ہو چکی ہوتی' تب کیا ہوتا؟ یا پھر کسی دن میری روح میں ایسا زہر اترتا کہ وہ ختم ہو جاتی۔ جسم کا بیکار وجود گھسیٹنا پڑتا۔ تب کیا ہوتا؟ آپ لوگ کیوں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے کہ اس نے ایک چھوٹا سا امتحان لے کر مجھے بڑے امتحان سے بچا لیا ہے۔ افسوس انسان بہت ناشکرا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کیا پایا ہے صرف یہ دیکھتا ہے کہ وہ کیا کھو رہا ہے۔''

پاپا نے نبیلہ کو سینے سے لگا لیا اور رو پڑے۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں بیلا! مجھے آپ بہت عزیز ہیں۔ میں نے آپ کے لیے غلط فیصلہ کیا لیکن میری نیت بری نہیں تھی۔ اس کے لیے میں خود کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا۔''

اس بات کو بیتے سال بھر ہو چلا تھا لیکن پاپا کے دل پر یہ بوجھ اب تک تھا۔ میرے لیے کتنے رشتے آئے تھے لیکن اس مرتبہ انہوں نے اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ میری رضامندی کے منتظر تھے۔ بعض رشتے انہیں بہت پسند آئے تھے۔ وہ چاہتے کہ میں ان کے لیے ہامی بھر لوں مگر اس بارے میں انہوں نے مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ سب اختیار میرے حوالے کر دیے تھے۔

''سجو بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ آپ کے لیے میں کوئی فیصلہ کروں لیکن میں آپ کو آپ کے گھر میں آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ کہہ رہے تھے' میں خاموش رہی' نبیلہ نے پہلے میری طرف دیکھا پھر ان سے بولی۔

''پاپا! تیمور بہت اچھا ہے۔ آپ اس سے ملے بھی ہیں۔ آپ خود ہی پرسوں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ امتحان میں بھی وہ ضرور کوئی پوزیشن لے گا۔''

''وہ تو بہت اچھا ہے لیکن صرف اتنا کافی نہیں' میں نہیں جانتا کہ اس کے گھر والے کیسے ہیں۔''

''وہ ملوانے کے لیے کہہ رہا تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کب ملوانا چاہتا ہے؟''

''وہ تو جلدی چاہتا ہے لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔ اس کی ممی اس کی منگنی کرنا چاہتی ہیں اور ملنے کے بعد وہ اس پر اصرار کریں گی لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ منگنی یا نکاح اتنا پہلے

نہیں ہوگا۔''

پاپا تھوڑی دیر چپ رہے پھر بولے۔ ''ٹھیک ہے' آپ جائیں اب میں اخبار پڑھوں گا۔''

نبیلہ بھی افسردہ ہو گئی تھی۔ میں اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''سجو! ہر کوئی اتنا برا نہیں ہوتا۔ آخر اتنی دنیا کی لڑکیوں کی منگنی اور نکاح شادی سے کافی پہلے ہو جاتا ہے اور پھر تیمور تو بہت اچھا ہے۔''

''پلیز بیلا! میں ایسا نہیں چاہتی۔'' میرا انداز فیصلہ کن تھا۔

''پھر تو بات بہت دیر پر ٹل جائے گی۔ ابھی امتحان میں بھی اتنا وقت رہتا ہے۔ رزلٹ آتے اور ٹریننگ پر جاتے جاتے مزید ایک سال لگ جائے گا اور پھر ٹریننگ کا عرصہ' یہ تو بہت لمبی مدت ہو گی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' مجھے جلدی نہیں ہے۔''

☆======☆======☆

صبح چھٹی تھی اور چھٹی کے دن عموماً دیر سے اٹھا کرتی تھی لیکن تیمور کی وجہ سے جلدی جاگ گئی۔ اس روز میں اچھے طریقے سے تیار ہونا چاہتی تھی' یہ پہلی مرتبہ تھی کہ ہم پلاننگ کر کے کہیں باہر نکل رہے تھے۔ صرف ہم دونوں۔ ورنہ ہماری ملاقات گھر پر ہی ہوتی تھی جہاں پاپا اور نبیلہ بھی موجود ہوتے تھے۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے ہم اس وقت تنہا ہوتے تھے۔ جب میں اسے گیٹ پر خدا حافظ کہنے جاتی تھی۔

میں نے سیاہ ٹائٹس کے اوپر شاکنگ پنک کلر کا سوئیٹر پہنا' بالوں کو اچھی طرح بلو ڈرائی کر کے ہیئر سپرے چھڑکا' بیچو کی شیشی نکال کر خوشبو لگائی۔ مناسب میک اپ کیا' داہنے ہاتھ میں خوبصورت نفیس بریسلٹ پہنا اور بائیں ہاتھ میں گھڑی پہن کر تیار ہو گئی۔

اسی وقت نبیلہ نے اندر جھانکا۔

''واہ واہ خوب تیاری ہے' گھر کے اس کونے سے اس کونے تک خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔''

اس نے گہرا سانس لے کر خوشبو اپنے اندر اتاری۔

میں ہنس پڑی۔ ''آج اچھا لگ رہا ہے مجھے یوں تیار ہونا۔''

"ناشتا کرو گی یا آنے والی ملاقات کے تصور سے ہی پیٹ بھر لوگی؟" اس نے چھیڑا۔

"بس کافی پیوں گی۔"

تیمور کے آنے تک میں کافی پینے کے ساتھ ساتھ پاپا کو اخبار سے خبریں پڑھ کر سناتی رہی۔ اس کی کار کا ہارن بجا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بیلا! پاپا میں اب چلتی ہوں تیمور آ گیا ہے۔"

"اسے اندر تو بلاؤ' کم از کم چائے ہی پی لے۔" نبیلہ نے کہا۔

"نہیں پھر لائبریری میں پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ مجھے پتا ہے وہ رکے گا نہیں۔"

تیمور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا مجھے بہت اچھا لگا۔ اس نے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا' اور مجھے اتنی لمبی تیاری میں اتنا زیادہ وقت صرف کرنے کا کوئی افسوس نہیں رہا۔ مال روڈ پر اس سے پہلے بھی ہزاروں مرتبہ میں نے سفر کیا تھا۔ بلکہ میرا کالج تو یوں بھی اس کے آخری سرے پر واقع تھا اور ہر روز میں اس سڑک سے گزرتی تھی۔ لیکن یہ راستہ پہلے کبھی ایسا خوبصورت نہیں لگا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا سحر تھا میں جس کے تابع ہو گئی تھی۔ لڑکے میرے لیے کوئی نئی مخلوق نہیں تھے۔ نہ ہی یہ تھا کہ وہ پہلا لڑکا تھا جو اس نیت سے میری جانب بڑھا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ بظاہر بلاوجہ ہی میں اس کی جانب کھنچی چلی جا رہی تھی۔ اس نے میرے دل کے دروازے پر دستک دی تھی اور وہ خود ہی کھل گیا تھا۔ اب اس کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ بعض اوقات تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اب تک میں اس کے بغیر کیسے رہ پائی تھی۔ زندگی کتنی بیکار تھی تب۔

پڑھنے کے لیے میں کبھی قائداعظم لائبریری نہیں گئی تھی۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آرٹ کی کتابیں کالج اور میوزیم کی لائبریری سے ہی مل جاتی تھیں۔ ہاں نبیلہ یہاں آتی رہتی تھی۔ وہ بھی بہت پڑھاکو تھی۔ میرا یہاں آنا تب ہی ہوتا تھا جب اسے لائبریری چھوڑنا یا لانا ہو۔

وہاں کا ماحول مجھے بہت اچھا لگا۔ نبیلہ اور تیمور کی طرح وہاں بے شمار پڑھاکو لوگ جمع تھے اور سب خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی کتابوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ تیمور بھی کتابیں نکلوا کر میرے ساتھ اوپر چلا آیا۔ ہم اس میز کی طرف بڑھ گئے جس کے ساتھ دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے لیمپ جلایا اور ایک کتاب اور ڈھیر سارے کاغذ میری طرف بڑھا دیئے۔

"میں نے کتاب میں فلیگ بنا کر رکھے ہوئے ہیں۔ ان چیپٹرز کو پڑھ کر نوٹس بناؤ۔" اس نے کہا اور خود اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے پہلے اسے دیکھا' وہ مجھے نظر انداز کر کے اپنی کتاب اور کاغذوں کے ساتھ اُلجھ گیا تھا' پھر میں نے کتاب کا جائزہ لیا جو اتنی موٹی تھی کہ مجھے یقین تھا اسے میں اکیلے اٹھا بھی نہیں سکتی تھی اور پھر اتنے چیپٹرز یہ کام میرے بس سے باہر کا تھا۔

"سنو تیمور!" میں نے لائبریری کی گہری خاموشی محسوس کر کے سرگوشی میں اسے پکارا۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"یہ بہت موٹی ہے اور اتنا چھوٹا چھوٹا لکھا ہوا ہے۔ میں نے کبھی اتنی موٹی کتاب نہیں پڑھی۔"

اس نے مجھے گھورا اور میری ہی طرح سرگوشی میں بولا۔ "کام شروع کرو۔"

"یہ فاؤل ہے۔ تم نے اپنے پاس پتلی کتاب رکھی ہے' مجھے اتنی موٹی پکڑا دی ہے۔"

اس نے خاموشی سے کتابیں تبدیل کر لیں۔ اب مجھے اندازا ہوا کہ اس کے پاس بھی اتنی پتلی کتاب نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ اپنا کام مجھے مشکل لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک پڑھنے کے بعد میرا دل اُچاٹ ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کیسے اتنی دلچسپی سے پڑھ رہا تھا۔

"تیمور!"

"کیا ہے؟"

"یہ کتاب بہت بورنگ ہے' وہی پہلے والی دے دو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے پڑھنے بھی دو گی؟ میں تمہیں اپنی مدد کرنے کے لیے لایا تھا۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"لڑتے کیوں ہو؟ ایک تو اتنی بوری کتاب تھما دی' اوپر سے ڈانٹ بھی رہے ہو۔ میں نے کبھی کسی کی ڈانٹ نہیں کھائی۔"

"اب پلیز' مجھے پریشان مت کرنا۔" اس نے کہا اور کتابیں پھر تبدیل کر دیں۔

میں نے وہ موٹی سی کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کیا' وہ پہلی والی کتاب سے بھی زیادہ خشک تھی۔ کن اکھیوں سے تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ کتاب میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی قریب رکھے کاغذوں پر نوٹس بھی بناتا جا رہا تھا۔ اب کے میں اسے مخاطب کرتی تو وہ یقیناً غصے

ہو جاتا۔ بہت بے دلی سے میں کتاب کے ورق اُلٹنے لگی پھر کتاب بند کر کے سرورق کا جائزہ لیا جو مجھے بہت اچھا نہ لگا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے تیمور کی طرف دیکھا وہ کسی طرف توجہ دیئے بغیر کام میں منہمک تھا۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔

''اتنا پرفیوم خواہ مخواہ ہی انڈیلا' یہ تو ایسے بیٹھ کر کام کرتا ہے جیسے دور دور تک کوئی بھی نہ ہو۔''میں نے سوچا۔

بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا۔

''سنو تیمور!''

''ہوں۔''وہ بدستور لکھتا رہا۔

''اس کتاب کے ٹائٹل کی السٹریشن دیکھی؟ اتنی اچھی تو نہیں ہے' ہیں ناں؟ اس سے اچھا ٹائٹل تو میں بھی بنا سکتی ہوں۔ رنگ بھی اتنے مناسب نہیں ہیں۔ دیکھو تو میں تمہیں کیا دکھا رہی ہوں۔''

مجھے محسوس ہوا کہ اس کا پارہ چڑھنے لگا تھا لیکن اس نے بہت ضبط کا مظاہرہ کیا۔''ہاں لیکن اب کام کرو۔ یہ بہت ضروری ہے کہ آج یہ سارا کام ختم ہو جائے۔''

بادل نخواستہ مجھے پھر کتاب کھولنی پڑی۔ دس صفحوں بعد ہی میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ تیمور سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ اب تو اسے بہت زیادہ غصہ آ جانا تھا۔ گھڑی پر وقت دیکھا۔ بمشکل پون گھنٹہ گزرا تھا۔

''اُف خدایا ہسپتال اور لائبریری' ان دونوں جگہوں پر وقت کتنا لمبا ہو جاتا ہے۔''میں نے سوچا۔

یہ تو طے تھا کہ میں نے ایسی خشک کتاب کو پڑھنا نہیں تھا لیکن نہ پڑھتی تو کیا کرتی؟ کتاب کے اندر صفحات رکھ کر بے خیالی میں میں تیمور کے اسکیچ بنانے لگی۔ یہ دلچسپ کام تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں نوٹس بنا رہی ہوں جبکہ میں یہ کام کر رہی تھی۔

اس وقت تک میں کافی اسکیچ بنا چکی تھی۔ جب وہ لکھتے لکھتے میری طرف مڑا۔ میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا' لیکن اس وقت مجھے بہت غصہ آیا جب اس نے میری طرف متوجہ ہونے کے بجائے میرے سامنے رکھی کتاب اپنی طرف سرکائی۔ شاید اسے کسی ریفرنس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ ان سکیچز پر پڑی اس نے سر اٹھا کر میری

طرف دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ حیران بھی ہوگا اور اسے یہ اسکیچ اچھے بھی لگیں گے۔

''اچھے ہیں ناں؟''میں نے خوشی سے پوچھا۔

لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب میں نے اس کی آنکھوں میں غصہ دیکھا۔ جلدی سے کار کی چابی نکال کر اس نے میری جانب بڑھائی۔

''تم گھر جاؤ۔''

''کیوں میں نے کیا کر دیا؟''

''میں کہہ رہا ہوں' گھر جاؤ۔''

مجھے بھی غصہ آ گیا۔ اس کے ہاتھ سے کار کی چابی تقریباً چھین کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہر نکلتے نکلتے غصے کے بجائے رونا آنے لگا۔ کار میں پہنچ کر میں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ وہ تو شکر ہوا کہ کار کے شیشے گہرے رنگ کے تھے' ورنہ پتا نہیں لوگ کیا سمجھتے۔ ویسے وہاں اتنے لوگ تھے بھی نہیں۔ بس دور دور اکا دکا لوگ یا پھر دور مال روڈ پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی کھڑکی کے شیشے پر ہلکے سے دستک ہوئی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہاں تیمور کھڑا تھا' کچھ کہے بغیر میں نے لاک کھول دیا۔ وہ اندر بیٹھ گیا۔

''ارے! یہاں تو مطلع ابر آلود ہے' خیریت تو ہے' ایسا کیا ہو گیا؟''

''بات مت کرو مجھ سے۔''میں نے بگڑ کر کہا۔

''میں سوری کرنے ہی آیا تھا۔ وہ بھی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ورنہ تم نے مجھے زچ ہی کر دیا تھا۔ بعد میں خیال آیا کہ یہ آتش فشاں کسی اور غریب کے سر پر نہ پھٹ پڑے۔ اس لیے سوچا کہ کسی بڑے حادثے سے قبل تمہیں منا لیا جائے۔''

''ایک تو اتنی موٹی سی کتاب مجھے دے دی' وہ بھی اس قدر بورنگ' پھر فضول میں غصہ بھی کیا۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ میں کسی کا غصہ برداشت نہیں کرتی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں وہی کتاب اس کے سر پر دے مارتی۔ اتنا لحاظ تو میں نے کبھی کسی کا نہیں کیا۔''میں نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔

''پھر تو میں خاصا خوش قسمت واقع ہوا ہوں۔''وہ ہنسا۔

''وہ تو ہو ہی۔ جمیلہ شاہ کو کوئی خوش قسمت ہی حاصل کر سکتا ہے۔''میں اترائی۔

وہ مسکرا دیا۔ ''ہاں ٹھیک کہا۔ اب ناراضگی ختم کرو کیونکہ مجھے بہت کام کرنا ہے۔ یہاں بور ہو رہی ہو تو بے شک گھر چلی جاؤ۔''

''اتنی بری لگ رہی ہوں تمہیں یہاں پر؟''

''میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ تم بور ہو رہی ہو۔'' اس نے کہا۔

''میری بوریت کو تم رہنے دو۔ میں تمہارے ساتھ ہی واپس جاؤں گی۔''

''تم ایسا کرو کہ اپنی پسند کی کتاب نکلوا لو اور پلیز پھر مجھے پریشان مت کرنا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج معمول سے زیادہ کام کر لوں گا لیکن اب مشکل لگ رہا ہے' تم میری کچھ اور مدد نہیں کر سکتیں تو صرف اتنا کر دو کہ درمیان میں مجھے بلاوجہ تنگ نہ کرو۔''

''میں نے کوئی تنگ نہیں کیا تھا تمہیں۔ تم نے خواہ مخواہ غصہ کیا تھا مجھ پر۔''

''اچھا اب جانے دو۔ اٹھو ابھی بہت نوٹس بنانے ہیں مجھے۔'' وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

میں آرٹ سے متعلق کتاب لے کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ پتا نہیں وہ اتنے انہماک سے کیسے پڑھنے لکھنے میں مصروف تھا۔ میرا دل بالکل کسی کتاب میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ میرے قریب تھا اور مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں کبھی بیچ بیچ سے کوئی صفحہ کھول کر پڑھنے لگتی اور کبھی سامنے رکھے کاغذوں پر کچھ بنانے لگتی۔ کبھی کبھی بہت شدت سے دل چاہتا کہ اس سے کوئی بات کروں مگر پھر یہ سوچ کر چپ رہ جاتی کہ اسے غصہ آ جائے گا۔

بہت دیر بعد اس نے اپنا شیفر کا بال پین کاغذوں پر رکھا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ہاتھ گردن کے پیچھے کر کے آنکھیں موند لیں۔ شاید وہ تھک گیا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھے گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول لیں اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''تھک گئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے جو! کہ تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں۔''

اس کی بات سن کر میری ساری بوریت دور ہو گئی۔ ''ہاں مجھے پتا ہے۔''

''کس نے بتایا ہے؟'' اس نے مصنوعی انداز میں مجھے گھورا۔

''تم سے پہلے اَن گنت لوگ بتا چکے ہیں' کہو تو لسٹ بنا دوں۔'' میں نے بھی مصنوعی بے نیازی سے کہا۔

''اور تمہاری آنکھیں بھی بہت خوبصورت ہیں۔'' وہ بولا۔

''میں تمہیں ٹکڑوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتی مجھے تم پورے کے پورے اچھے لگتے ہو لیکن پتا ہے مجھے تمہاری ہنسی سب سے زیادہ پسند ہے۔ سب سے پہلے تمہاری ہنسی نے ہی مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا تھا اور میرا دل چاہتا ہے کہ تم اسی طرح ہنستے رہا کرو۔'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''لائبریری سے نکل کر تمہاری یہ خواہش پوری کر دوں گا۔'' وہ مسکرایا اور ایک مرتبہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کتنی دیر سے میں منتظر تھی کہ وہ لنچ کے لیے اٹھے گا۔ بھوک سے میرا برا حال تھا لیکن وہ بدستور اپنے کام میں منہمک تھا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ اس کے اٹھنے کے آثار کہیں نہیں ہیں تو بہت ہمت کر کے میں اسے آواز دی۔

''تیمور!''

''ہوں؟''

''کھانا نہیں کھانا کیا؟''

''ایک منٹ ٹھہرو۔''

میں پھر انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسے مخاطب کیا۔

''تیمور! اُٹھو بھی' یہ کتابیں کہیں بھاگی نہیں جا رہیں۔''

''ہاں ایک منٹ ٹھہرو۔''

جب وہ کئی مرتبہ مجھے ایک منٹ ٹھہرنے کا مشورہ دے چکا تو مجھے غصہ آنے لگا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ دن بہت یادگار تھا۔ میں نے نیلوفر اور نبیلہ کو سب باتیں بتائیں۔ انہوں نے بھی بہت انجوائے کیا۔ نیلوفر نے اپنے تجربے کی روشنی میں کچھ قیمتی مشورے دیئے اور ہدایت کی کہ میں انہیں گرہ میں باندھ کر رکھ لوں کام آئیں گے۔

اگلی مرتبہ میرے آف ڈے سے پہلے شام کو وہ گھر آیا تو میں نے خود ہی کہا۔

''کل لائبریری چلنا ہے ناں؟''

''میں تو جاؤں گا لیکن میری تو یہ جواب تمہیں لے کر گیا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا' نبیلہ جو قریب ہی بیٹھی ٹی وی کی طرف متوجہ تھی' اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔

''جواب دو کہ اس نے کیا کیا ہے؟'' اس نے تیمور کو مخاطب کیا۔

''تمہاری بہن کے ساتھ بیٹھ کر کوئی انٹلیکچوئل ایکٹوٹی ممکن نہیں ہے۔ پڑھنے کے سلسلے میں یہ میری صرف اتنی مدد کر سکتی ہے کہ میرے قریب بیٹھی رہے اور جب میں تھک جاؤں تو اسے دیکھ کر فریش ہو جاؤں لیکن اپنے باقی وقت کی قیمت پر دیدارِ یار کرنا بہت مہنگا سودا ہے۔''

عام حالات میں شاید تیمور کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آتا لیکن اب کے میں بھی نبیلہ کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

''نہیں قسم سے تیمور! اس مرتبہ میں تمہاری مدد کروں گی' پورا ایک ہفتہ میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا ہے کہ وہ موٹی موٹی اور انتہائی بور کتابیں پڑھ کر تمہارے لیے نوٹس تیار کروں۔ کیا ہوا جو زہر بھرا گھونٹ ہے' تمہاری خاطر پی لوں گی۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''میں وہ مسلمان ہوں جو بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسا جاتا ہے اور بخوشی ڈسا جاتا ہے۔''

نبیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں ذرا کچن کا جائزہ لے لوں۔ تم نے جانا نہیں ہے تیمور! پاپا آتے ہوں گے کھانا کھا کر جانا۔''

میں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ تیمور کی خاطر وہ انتہائی بور کتابیں نہ صرف پڑھیں بلکہ ان کے نوٹس بھی بنائے۔

آفس میں' میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی مغزماری کر رہی تھی جب اس کا فون آ گیا۔

''تمہارا لنچ ٹائم ہونے والا ہے' صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں۔''

''واہ کیا سی آئی ڈی ہے تمہاری' اتنا بڑا اسکریٹ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' اس کی آواز سن کر میری ساری تھکن اتر گئی تھی۔

''قابل داد بات ہے ناں؟ تمہارے سلسلے میں میری سی آئی ڈی اچھی خاصی ہے۔ اب

تم ایسا کرو گی کہ ٹھیک بیس منٹ کے بعد باہر آؤ گی۔ جہاں سے میرے ساتھ تمہیں مناج جانا ہو گا۔ ہم وہیں پر لنچ کریں گے۔'' اس نے کہا۔

''حیرت ہے' تم بھی اتنی اچھی بات کر سکتے ہو۔ فرصت مل گئی تمہیں اپنی کتابوں سے؟''

''اب میں اتنا بھی کتابی کیڑا نہیں ہوں' ویسے بھی آج کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا بس تمہارے ساتھ باتیں کرنے کا موڈ ہے۔''

''سچی؟'' میں کھل اٹھی۔ ''تو ٹھیک ہے میں ایسا کرتی ہوں کہ آج ہاف ڈے کر لیتی ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھا ہو گا' میں منتظر ہوں گا ٹھیک بیس منٹ بعد۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔ جلدی جلدی کام مکمل کیا۔ بقیہ دن کے لیے چھٹی لی' لپ اسٹک لگائی اور بالوں میں جلدی جلدی برش کر کے باہر نکل آئی۔ بیس منٹ گزر چکے تھے' وہ باہر کار لیے میرا منتظر تھا۔ اپنی کار کی چابی میں نیلوفر کو دے آئی تھی۔

☆======☆======☆

مناج کے پُرسکون ماحول میں کھانا کھاتے ہوئے وہ بولا۔

''میں نے ممی سے تمہارے بارے میں اتنا ذکر کیا ہے کہ وہ ملنے کے لیے بیتاب ہو گئی ہیں۔''

''صحیح بات بتاؤں تو اس قسم کے امتحان سے گزرنے کا مجھے پہلے کوئی اتفاق نہیں ہوا' شاید اسی لیے میں اس تجربے اور تمہاری ممی سے ابھی سے خائف ہوں۔ بعض مائیں اپنے بیٹوں کے لیے اتنا کچھ طلب کرتی ہیں۔ جو کوئی ایک لڑکی نہیں دے سکتی اور میں تو یوں بھی بہت عام سی لڑکی ہوں جس میں بہو بننے کے حساب سے خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ ہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن افسوس کہ تمہارا اندازہ درست ہے۔ ایک تو میں اکلوتا ہوں اور شاید اسی لیے ممی کا بہت لاڈلا ہوں' ممی کی تمام تر توجہ کا مرکز' پھر یوں بھی ممی انتہا کی اسٹیٹس کانشس ہیں۔ فرد کے گھر والوں سے اسی لیے ان کی نہیں بنتی۔ انہیں بری طرح سے شوبازی کا چسکا ہے' بہو کے لیے بھی ان کے اپنے معیار ہیں لیکن یہ طے ہے کہ اس سلسلے میں ہو گا وہی جو میں چاہوں گا۔ میں انہیں راضی کر چکا

ہوں' بس وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

ایک دم کھانے سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ نبیلہ کے سلسلے میں جو تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں اس کی یاد تازہ ہو گئی۔ کانٹا سیدھا رکھ کر میں نے پلیٹ اپنے سامنے سے سرکا دی اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بھوک نہیں ہے۔"

"کیوں پریشان ہو گئی ہو؟ میں نے کہا تو ہے کہ میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور میں ممی کو راضی کر چکا ہوں۔" اس نے تسلی دینا چاہی۔

اس تمام عرصے کے درمیان اس نے مجھے بہت تسلیاں دیں لیکن میں بہت اپ سیٹ ہو چکی تھی۔ اسٹیٹس کانشس لوگوں سے میں بری طرح چڑنے لگی تھی۔ یہ میں مانتی تھی کہ ایک حد تک ہر کوئی اسٹیٹس کانشس ہوتا ہے لیکن اپنے انداز و اطوار سے اسے بار بار ظاہر کرنا' ہر آنے جانے والے کو یہ باور کروانا اور شو بازی کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لینا' یہ سب میری برداشت سے باہر تھا۔

رات کو نیلوفر آئی تو نبیلہ بھی ہمارے پاس آ کر لان میں بیٹھ گئی۔

"پتا نہیں کیا ہوا ہے' صبح تو ٹھیک ٹھاک آفس گئی تھی۔ جب سے گھر آئی ہے سخت اپ سیٹ لگ رہی ہے۔" نبیلہ نے اس سے کہا۔

"ارے آج کیوں اپ سیٹ ہے؟ میں تو آج کی داستان سننے آئی تھی بلکہ میرا تو خیال تھا کہ آج بڑی زبردست فلم چلی ہو گی رومینس سے بھرپور۔" نیلوفر نے شرارت سے کہا۔

"شٹ اپ فرو' کبھی تو مذاق بند کیا کرو۔" میں بلاوجہ اس سے الجھ پڑی۔

"مجھ پر کیوں چڑھائی کر رہی ہو۔ لگتا ہے تیمور سے لڑائی ہوئی ہے۔ ایسا ہے تو اسی پر غصہ نکالو۔" نیلوفر نے اطمینان سے کہا۔

حالانکہ نیلوفر نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی مگر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نبیلہ جو میری طرف ہی متوجہ تھی' میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"تجو! کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟" وہ گھبرا کر اٹھی اور میرا بازو جھنجوڑنے لگی۔

نیلوفر بھی گھبرا گئی۔ "میں نے تو مذاق کیا تھا تجو۔ کیا سچ مچ تیمور سے لڑائی ہو گئی۔"

"کچھ نہیں ہوا۔" کہہ کر میں اندر جانے کے لیے اٹھی ٹھیک۔ ہی تھا ہوا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس بیتے پل کی تلخی تھی اور میرے اندر کے خوف۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی کیا؟" نبیلہ نے پیار سے کہا۔

میں واپس بیٹھ گئی۔ ان کے اصرار کے سامنے میں بھی خاموش نہ رہ سکی اور انہیں سب کچھ بتا دیا۔

"ہاں' اس کی ممی ہیں تو کچھ ایسی ہی لیکن تم میں کیا کمی ہے؟ پریشانی کی کیا بات ہے؟ اور پھر ساسیں تو کم و بیش ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میری والی کو نہیں دیکھا' خیر کیا فرق ہو گا ہیں جو دونوں بہنیں لیکن ایک بات ہے کہ بیٹے کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہیں' اس لیے اس کی خوشی کی خاطر تمہیں پریشان نہیں کریں گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ تیمور بہت مضبوط ہے' وہ ہر جگہ تمہارے لیے اسٹینڈ لے گا۔ اور بتاؤں اپنا میاں اچھا ہو تو بیوی سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔"

"پتا نہیں خوشیاں پوری کیوں نہیں ملتیں' اتنی ادھوری کیوں ہوتی ہیں؟"

"خواہ مخواہ ہی بیوقوفوں والی باتیں کر رہی ہو۔ ابھی اس کی ممی سے ملیں نہیں اور پہلے سے بلاوجہ یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ تم انہیں پسند نہیں آؤ گی یا ان کی کوئی عادت تمہارے لیے مشکل پیدا کرے گی۔ فرو نے ٹھیک کہا ہے کہ آخر تم میں کیا کمی ہے جو ان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکو گی؟ باقی جہاں دو افراد ہوں وہاں تھوڑی بہت اونچ نیچ تو ہو ہی جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ قربانیاں دونوں کو دینی پڑتی ہیں۔" نبیلہ نے بھی میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

سب نے ہی مجھے تسلی بھی دی تھی اور آنے والے وقت کے لیے اتنا حوصلہ بھی کہ میں تیمور کی ممی کے رویے سے دلبرداشتہ نہ ہو جاؤں۔ پھر بھی وہ جب مجھے ان سے ملوانے کی بات کرتا' پہلے میں تذبذب میں گرفتار ہوتی اور پھر عین وقت پر انکار کر دیتی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتی۔ بیٹے کی خوشی کی خاطر اگر انہیں مجھے بطور بہو برداشت کرنا ہی پڑا تو بھی میری زندگی ایک مسلسل ایک امتحان میں گزرے گی میں اس وقت سے خائف تھی اور اسے تب تک ٹالنا چاہتی تھی' جب تک ٹل سکتا تھا۔ تیمور چاہتا تھا کہ میں ان سے مل لوں کیونکہ وہ مجھ سے جلد از جلد ملنا چاہتی تھیں' لیکن اس بارے میں میری ذہنی حالت دیکھتے ہوئے اس نے کبھی مجھ پر دباؤ نہیں ڈالا تھا اور میں اس بات سے مطمئن تھی۔ مگر اس روز ہم لائبریری جا رہے تھے جب وہ مجھ سے کہنے لگا۔

''کل ممی کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے لگیں۔ تم تو جانتی ہو کہ ایسے میں مائیں کیا کچھ کہتی ہیں۔''

میں سمجھ رہی تھی کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

''نہیں' میں نہیں جانتی میری مما نہیں ہیں۔''

وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے خود ہی احساس ہوا۔

''آئی ایم سوری تیمور! پتا نہیں کیا بات ہے میں اس موضوع سے چڑنے لگی ہوں۔ جیسے ہی یہ ذکر چھڑتا ہے میں قنوطیت کا شکار ہو جاتی ہوں میرے پاس یوں بھی اظہار کے لیے الفاظ نہیں ہوتے۔ کبھی بیلا اور فرو میرے اتنے قریب تھیں کہ میں ان سے سب کچھ کہہ دیا کرتی تھی' اب ان کے بجائے اپنے دل کی سب باتیں تم سے کہہ دینے کو جی چاہتا ہے۔ اور تم سے بات نہیں کر سکتی۔ نہ جانے تم کیا سمجھ بیٹھو۔''

''تم سب کچھ کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے۔ میں اپنے اور تمہارے تعلق کو کسی Communication کیمونی کیشن گیپ کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کھل کر اپنی بات ایک دوسرے سے کہہ دیں۔ اگر آج ایسا ممکن نہیں تو کل کسی اور مضبوط بندھن کی بنیاد رکھنا بالکل بیکار ہوگا۔''

''میرے اندر بہت سے خوف ہیں تیمور تم سمجھ نہیں پاؤ گے' کیا پتا ناراض ہی ہو جاؤ۔''

''کیا میں تمہیں اور تمہارے مزاج کو جانتا نہیں ہوں کہ ناراض ہو جاؤں گا؟ ہم دونوں تعلیم یافتہ افراد ہیں اور کھل کر کوئی بھی مسئلہ ڈسکس کر سکتے ہیں۔ جو جتنا احمق ہوتا ہے' وہ اتنی ہی جلدی پرسنل ہو جاتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکتا ہوں۔

یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ تم مجھے بہت کمزور اور بودا سمجھتی ہو۔ جو وعدہ کر کے بعد میں کسی مجبوری کا بہانا گھڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ میں بہر حال ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میں صرف وہی کمٹ منٹ کرتا ہوں جسے پورا کر سکوں۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے تیمور! کھو دینے سے خوف آتا ہے۔ پیدا ہوتے ساتھ میں نے اپنی ماں کو کھو دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ بھی نہیں سکی تھیں۔ یہ دکھ اور یہ خوف میری زندگی کا حصہ بن گئے ہیں۔ محبت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے' میں ہر وقت خوف زدہ رہتی ہوں کہیں ہم بچھڑ نہ جائیں۔ کہیں

تمہیں کچھ ہو نہ جائے۔ جس زندگی کے خواب دیکھتی ہوں' کہیں وہ زندگی اور وہ خواب کوئی چھین نہ لے۔ بیلا بہت بہادر ہے اتنے بڑے کرائسس سے گزرنے کے باوجود بھی اطمینان بھری زندگی گزار رہی ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ ایسا ہوا تو پتا نہیں میں کیا کروں گی۔ شاید خودکشی ہی کر لوں۔''

تیمور نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں تو ڈرتی کیوں ہو؟ میں تمہیں کسی خوش فہمی میں بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ زندگی اتنی آسان آرام دہ تو نہیں ہوگی لیکن پھر کس کی زندگی آرام دہ ہوتی ہے بس اتنا ضرور ہوگا کہ میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ کوئی دکھ' کوئی تکلیف تم تنہا نہیں جھیلو گی۔ میں ہوں گا تمہارے ساتھ۔''

بس ایک اتنی سی یقین دہانی سے میں پرسکون ہو گئی۔ مجھے بھی ایسی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس میں جدوجہد نہ ہو۔ میں اس سے تھکتی نہیں تھی لیکن ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی خالی ہاتھ رہ جانے کا دکھ میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے بعد جب تیمور نے مجھے اپنی ممی سے ملنے کے لیے کہا تو میں بلا چون و چرا تیار ہو گئی۔

''ذرا ٹھیک طریقے سے تیار ہو کر جانا۔'' نیلوفر نے مجھے ہدایت جاری کی تھی۔

مگر میں عمومی انداز میں ہی تیار ہوئی۔ ان کے سامنے میں اسی صورت میں جانا چاہتی تھی۔ جیسا کہ میں تھی۔ جیسا کہ میں عام دنوں میں رہا کرتی تھی۔ اپنے آپ کو مختلف بنا کر ان کی پسند کے مطابق ڈھل کر انہیں دھوکا دینا مجھے گوارا نہیں تھا۔

ہمارے گھر کے مقابلے میں ان کا گھر بہت بڑا تھا۔ چھ کنال پر پھیلا یہ گھر ایک مرتبہ پہلے بھی میں باہر سے دیکھ چکی تھی لیکن تب اسے دیکھ کر میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں آیا تھا۔

وسیع و عریض لان میں بہار آئی ہوئی تھی۔ کہاں کہاں کے نایاب پودے اور گھاس لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف پہاڑی سی بنا کر انگریزی طرز کا خوبصورت بڑا سا جھولا لگایا ہوا تھا۔ سوئمنگ پول کی بتیاں جلا کر صفائی ہو رہی تھی۔ ڈرائیو وے پر چھ کاریں پہلے ہی کھڑی ہوئی تھیں۔

ان باتوں نے مجھے کبھی بھی مرعوب نہیں کیا تھا۔ ہاں ان سب چیزوں سے خائف تھی۔

تیمور نے کہا تھا کہ اس کی ممی انتہا کی اسٹیٹس کانشس ہیں اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتی۔ عام حالات میں ایسے کسی بھی شخص کو میں گھاس تک نہ ڈالتی۔ لیکن اب بات دوسری تھی۔ تیمور میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھا۔ میری شدید ترین محبت تھا اور وہ اس کی ماں تھیں۔

مجھے حیرت بھی تھی۔ تیمور کی کسی بات سے مجھے کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاس اور بہت سی باتیں تھیں کرنے اور کہنے کے لیے۔ ہمارے گھر میں وہ سب کے ساتھ قالین پر بیٹھ جاتا تھا۔ کھانا کبھی ڈائننگ ٹیبل پر اور کبھی قالین پر بیٹھ کر ہی کھا لیا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں کبھی اس مشکل کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔

اس کی ممی میری منتظر تھیں۔ کسی بھی طرح وہ اس کی ممی نہیں لگ رہی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کی بڑی بہن لگتی تھیں۔ اب تک وہ بہت حسین تھیں اور بے حد اسمارٹ اور چاق و چوبند ہلکے انگوری رنگ کے کڑھائی والے کرتے دوپٹے اور سفید شلوار میں ملبوس وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھیں۔ ڈائمنڈ کا نفیس سا سیٹ پہن رکھا تھا۔ انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں تھیں۔ بال خوبصورتی سے کٹے اور سیٹ کیے ہوئے تھے۔ کپڑوں کی مناسبت سے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا۔

مجھے بیٹھنے کے لیے کہتے کہتے ہی انہوں نے سر سے پاؤں تک میرا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان کی گفتگو میں بھی تصنع تھا۔ چند باتیں میں نے واضح طور پر محسوس کر لی تھیں۔ میری انگریزی کے علاوہ اور کسی بات سے وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے میری دونوں انگوٹھیوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ کانوں کے ٹاپس اور ناک میں پڑی لونگ بھی انہیں کچھ خاص نہیں لگی تھی۔ گلے کی چین بھی ان کے حساب سے قیمتی نہیں تھی۔ اور ان سب باتوں کا اظہار انہوں نے وقتاً فوقتاً کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''پرانے جیولرز جو ہمیشہ سے خاندان کے لیے زیور بناتے آ رہے ہوں۔ وہی ٹھیک رہتے ہیں۔ اب دیکھو کتنی عام کوالٹی کا روبی لگا ہے تمہاری رنگ میں۔''

یعنی بیک جنبش لب انہوں نے نہ صرف خود کو رئیس ابن رئیس ظاہر کر دیا تھا اور مجھے نو دولتیوں کے خاندان میں شمار کر لیا تھا بلکہ مجھے یہ بھی باور کروا دیا تھا کہ میرے پاس موجود زیور خاصا گھٹیا تھا اور یہ بات انہوں نے بہت عام انداز میں کی تھی۔ جیسے بات سے بات نکلی ہو اور

انہوں نے اظہار خیال کر دیا ہو۔

ایک اور موقع پر یونہی بظاہر برسبیل تذکرہ انہیں خیال آیا۔ ''یہ چین فرحت علی جیولرز سے لی؟ میں نے دیکھی تھی وہاں لیکن چھوڑ آئی۔ مجھے پسند ہے کہ گلے میں پڑی چین نمایاں ہو۔''

کتنے آرام سے پیغام دے دیا تھا انہوں نے۔ ظاہر ہے نمایاں ہونے والی چین تو خواہ مخواہ پہننے والے کو شرمندہ کروا دیتی۔

خدا خدا کر کے جیولری اور کپڑوں کا موضوع تمام ہوا تو انہوں نے گھر اور گھر والوں کے متعلق جاننا چاہا۔ میں نے پاپا کے متعلق بتایا تو بولیں۔

''اچھا کسٹمز میں تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ بھی بہت اچھی جاب ہے لیکن میں نے تیمور سے کہہ رکھا ہے کہ D.M.G کے علاوہ کچھ نہ سوچنا۔ کسی اور کیڈر میں جانے سے بہتر ہے کہ بزنس پر توجہ دو۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ پتا نہیں لوگ کیسے رہ لیتے ہیں۔ پندرہ بیس ہزار روپے میں پورا مہینہ۔ میرے لیے تو تصور ہی محال ہے۔''

میں نے تبصرہ کرنا پھر مناسب نہیں سمجھا البتہ تیمور جگہ جگہ انہیں ٹوک رہا تھا لیکن مہذب انداز میں تاکہ انہیں بھی ناگوار نہ محسوس ہو۔

بالآخر جب انہوں نے پوچھا۔ ''گھر کتنا بڑا ہے؟'' تو میں نے بھی قفل توڑا۔ ''اللہ کے فضل سے ہم تین افراد کے لیے ضرورت سے بڑھ کر ہے۔''

وہ مسکرائیں۔ شاید انہیں کچھ حوصلہ ہوا تھا کہ کسٹمز کی نوکری میں رہتے ہوئے پاپا نے بھی کچھ کمال دکھایا تھا۔

''وہیں ڈیفنس میں ہے؟''

''جی!''

''کس بلاک میں؟''

''نیلوفر کے گھر کے قریب ہی ہے۔''

''اس کے گھر کی طرف تو شاید کنال کنال بھر کے ہی گھر ہیں۔'' سوچ سے ان کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں۔

''جی ایسا ہی ہے۔''

''اپنی اپنی بات ہے۔ مجھے تو تنگ سے گھر میں الجھن ہونے لگتی ہے۔'' اچانک جو

انہیں مجھ میں ایک پازیٹو پوائنٹ ملا تھا' وہ بھی ختم ہو گیا۔

ایک مرتبہ پھر تیمور نے انہیں ٹوکا۔ اب ان کا موضوع میری نوکری تھا۔

''شادی کے بعد نوکری کا ارادہ ہے؟''

''ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔'' میرا ڈپریشن لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔

''خیر اپنی مرضی کی بات ہے لیکن صحیح پوچھو تو مجھے یہ نوکری وغیرہ مڈل کلاس ذہنیت لگتی ہے۔ اصل میں مڈل کلاس فیملیز کی فنانشل پرابلمز کی وجہ سے اب لڑکیاں بھی نوکریاں کرنے لگی ہیں' ورنہ میں تو کہتی ہوں کہ لڑکیوں کو کچھ کرنا ہی ہو تو چلو شغل شغل میں بوتیک یا بیوٹی پارلر وغیرہ کھول لیں۔ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کر لیں کوئی این جی او وغیرہ کچھ ایسی چیز۔ ان کا شوق نہ ہو تو گھروں کے ہی سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اور کچھ نہ ہو تو انٹیریئر ڈیکوریشن کا ہی اتنا کام ہوتا ہے اور پھر نوکر۔ ہاؤس کیپرز پر کب تک گھر چھوڑا جا سکتا ہے۔''

تیمور کچھ کہنے لگا تھا کہ اس کی ممی کلائی پر بندھی تاشک میں وقت دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ایکسکیوزمی۔ میرا سوئمنگ کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

ان کے جانے کے بعد میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا؟ ابھی سے جانے کا ارادہ کر لیا۔''

''ہاں دیر ہو رہی ہے۔''

میرے ڈپریشن کا اسے اندازہ تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے واپس بٹھا دیا۔

''ممی کی ایسی ہی عادت ہے۔ ان کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو۔'' وہ بولا۔

''میری ایسی عادت نہیں ہے ناں۔ میں بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نہیں نکال سکتی۔ چھوٹی سی بات بھی میرے ذہن پر ہفتوں سوار رہتی ہے۔ میں کتنی کوشش کروں تب بھی ایسا نہیں کر سکتی اور آج جو کچھ ہوا' وہ اتنی چھوٹی سی بات ہے بھی نہیں جسے میں ذہن سے جھٹک سکوں۔''

''بعض اوقات اپنے مزاج کے خلاف باتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ تم جاب کرتی ہو' وہاں بھی کتنا کچھ اپنی مرضی کے علاوہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہی سوچ کر برداشت کر لو

کہ وہ میری ممی ہیں اور ہم دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں یوں بھی ممی کو اپنے رویے سے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میرے دو چار بہن بھائی ہوتے تو اور بات ہوتی۔ میں ان کے ساتھ شور شرابا بھی کر لیتا' ناراض بھی ہو جاتا۔ لڑ بھی پڑتا لیکن اب میں اکلوتا ہوں۔ ان کی تمام تر محبت اور امیدوں کا مرکز۔ میرے مزاج کے خلاف بھی بہت باتیں ہوتی ہیں جنہیں میں نظر انداز کر دیتا ہوں گھر سے باہر ہم جس قدر بھی جارحیت کا ثبوت دیں لیکن گھر میں تو ہمیں کمپرومائز کرنے ہی پڑتے ہیں اپنی محبت کی خاطر' ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے اپنے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ وہ کون سی جگہ ہے جہاں ہمیں سب کچھ مل جائے؟ یہی بہت نہیں تھا کہ تیمور میرا تھا۔ وہ اپنی ممی کو ناراض نہیں کر سکتا تھا تو کیا عجب تھا۔ کون اولاد اپنے والدین کو ناراض کرنا پسند کرتی ہے؟ میں خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ صرف میری وجہ سے اپنے تعلقات خراب کرے۔

ان سب باتوں کے باوجود بھی ڈپریس تھی۔ تیمور کو صرف اس کی ممی کی وجہ سے چھوڑ نہیں سکتی تھی اور اسے اپنانے کے بعد زندگی کتنی پریشان کن ہو سکتی تھی' اس بات کا مجھے ابھی سے اندازہ تھا۔ میں نے ہمیشہ بہت پُرسکون ماحول میں گھریلو زندگی بسر کی تھی۔ اختلاف ہوتا بھی تھا تو مل بیٹھتے تھے۔ سوائے نبیلہ کے مسئلے کے مجھے کبھی یاد نہیں تھا کہ ہمارے درمیان کوئی تلخ کلامی ہوئی ہو۔ اس تلخ کلامی کی وجہ بھی میں ہی تھی اور میں لڑ پڑتی تھی تو صرف اس لیے کہ مجھے علم تھا میری بات بھی سنی جائے گی۔ حقیقت یہ تھی کہ ایسا رویہ اپنانا مجھے سخت ناپسند تھا۔ کتنا مشکل تھا اس نئی زندگی میں داخل ہونا۔

نبیلہ نے میرا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو وہ بھی بجھ گئی لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا کر شگفتگی سے بولی۔

''لگتا ہے بہت طویل داستانِ غم ہے لیکن پہلے میری سن لو۔ ٹی۔ وی پر کرکٹ میچ لگا ہوا تھا۔ میں پاکستان کو جتانے کے لیے انتہائی خضوع و خشوع سے دعائیں کرنے بیٹھ گئی۔ پاکستانی کھلاڑیوں کی کارکردگی پر تو میری دعاؤں سے کوئی فرق نہیں پڑا لیکن وہ سالن جو میں چولہے پر رکھ کر بھول گئی تھی' میرے شوق کی نذر ہو گیا۔ اب میری اور تمہاری تو خیر [illegible] کھلاؤں گی؟''

"باہر سے کچھ منگوالینا یا آملیٹ بنادینا۔" میں نے کہا۔

"باہر کے کھانوں میں مرچیں بہت ہوتی ہیں اور پتا نہیں صفائی بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ میں خود بنالیتی ہوں پلیز میری مدد کردینا۔"

وہ مجھے کچن میں گھسیٹ لائی اور وہیں پیاز سرخ کرتے ہوئے اس نے مجھ سے تمام تر تفصیل بھی سن لی۔

"تیمور نے ٹھیک کہا تھا۔" بالآخر وہ بولی۔ "زندگی میں ہر بات ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتی۔ تیمور ہو یا کوئی اور' شادی کے بعد تمہیں اپنے مزاج کے خلاف بہت سی باتیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ کیونکہ ہر گھر کا سیٹ اپ مختلف ہوتا ہے۔ سب کے مزاج جدا جدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی سسرال والوں میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی آجاتی ہے لیکن سب سے زیادہ تو لڑکی کو ہی اپنا آپ بدلنا ہوتا ہے۔ بہت سی لڑکیوں بے چاریوں کے تو شوہر بھی تعاون نہیں کرتے۔ تمہیں کم از کم یہ فائدہ ہے کہ ابھی سے تیمور کے ساتھ تمہاری انڈر اسٹینڈنگ ہے' وہ تم سے محبت کرتا ہے' اس نے تمہیں تعاون کا بھی یقین دلایا ہے۔ تم عام لڑکیوں کی نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ نئے ماحول میں ڈھل سکتی ہو۔"

"میں اس ماحول میں نہیں ڈھل سکتی جہاں کپڑے' جیولری' گھر کی آرائش اور نوکروں کے نکمے پن کے علاوہ زندگی کا کوئی اور رخ ہی نہ ہو۔ زندگی ان سب باتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے اس کی ممی میری پرسکون زندگی میں بار بار اپنے اعتراضات کے کنکر پھینکتی رہیں گی تو میں پاگل ہوجاؤں گی۔"

"کوئی پاگل نہیں ہوتا۔ دیکھنا جب تم یہ بندھن باندھ لوگی تو تمہاری قوتِ برداشت خود ہی بڑھ جائے گی۔ یہ باتیں معمولی لگنے لگیں گی۔"

نیلوفر ملی تو وہ بھی نبیلہ کے ساتھ مجھے سمجھانے بیٹھ گئی۔

"بس کردیار میں ایک جیسا سبق سن سن کر اکتا گئی ہوں۔ میں اس ماحول سے نہ سمجھوتا کرسکتی ہوں نہ ہی اسے اپنا سکتی ہوں۔ بس تیمور کی وجہ سے جیسے تیسے اسے برداشت کرلوں گی۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

نبیلہ ہنس پڑی۔ "باقی باتیں اپنی جگہ لیکن سچ سچ کہنا' ہم تیمور کی ممی کے مقابلے میں بڑھیاں نہیں لگتیں؟"

مجھے بھی ہنسی آگئی۔ "اس میں واقعی شک نہیں ہے اب تک سوئمنگ کرتی ہیں تو فگر تو ٹھیک رہے گا ناں۔ میرے سامنے ٹرالی میں ان گنت لوازمات رکھے تھے کھانے کے لیکن انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صرف اس لیے کہ وہ ان کا کھانے کا وقت نہیں تھا۔ میری طرح نہیں ہیں کہ وقت بے وقت کچھ نہ کچھ ٹھونستی رہیں۔ اگر ان کی عقل اتنی محدود نہ ہوتی تو مجھے اتنی حسین' خوش شکل اور بظاہر نفیس سی ساس ملنے کی بہت خوشی ہوتی۔"

☆======☆======☆

دن سرک رہے تھے۔ تیمور امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس نے پھر ذکر نہیں کیا تھا کہ اس کی ممی کی میرے متعلق کیا رائے تھی۔ نہ ہی پھر انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تیمور سے ہونے والی ملاقاتیں بھی کم ہوگئی تھیں۔ امتحان بہت قریب آچکے تھے اور وہ پڑھائی کو بہت زیادہ وقت دینے لگا تھا۔ میں اسے مس کرتی تھی لیکن اس کے مستقبل کا سوچ کر خاموش ہوجاتی تھی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ پاپا جم خانہ گئے ہوئے تھے۔ نبیلہ رات کے کھانے کی تیاری کررہی تھی۔ میں اپنے کمرے کی ہفتہ وار صفائی کرکے باتھ روم میں گھسی ہوئی تھی نہا کر نکلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ نیلوفر بھی آئی ہوئی تھی۔ اور کچن میں ہی تھی۔ میں بھی وہیں چلی آئی۔

"اس کی ممی خاموش ہی اس لیے ہیں کہ شاید تب تک اسے تجو کے علاوہ کوئی اور لڑکی پسند آجائے' اس لیے خوامخواہ ابھی سے اس بات کو کیوں ایشو بنایا جائے۔" نیلوفر کہہ رہی تھی۔

مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر چپ ہوگئی۔ میں ہمیشہ کی طرح اس سے ملی حالانکہ اس کی بات میرے دل میں چبھ گئی تھی اور اس بارے میں' میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ رسمی گفتگو کے فوراً بعد میں اس موضوع پر آگئی۔

"تم تیمور کی ممی کے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں؟"

"تمہیں تیمور کے علاوہ کچھ سوجھتا بھی ہے۔ میں ابھی بیلا کے ساتھ سبزیوں کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ڈسکس کررہی تھی۔" وہ ٹماٹر منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"پلیز فرو! میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں اس گھر میں اپنی صحیح پوزیشن جاننا چاہتی ہوں۔"

نبیلہ نے نیلوفر کی طرف دیکھا پھر بولی۔ "ہم اتنے سمجھدار تو ہیں ہی کہ ہم سے باتیں نہ

چھپائی جائیں۔"

"ہم سمجھدار نہیں عقل کے بالکل کورے ہیں۔" نبیلہ نے میری طرف دیکھا۔

"تم میرے متعلق جو کچھ بھی سمجھو لیکن مجھ سے کچھ چھپا کر میرا بھلا نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

"میں تیمور کی طرف گئی تھی۔ اس کی ممی نے چند باتیں مجھ سے کی تھیں اور اسی نیت سے کی تھیں کہ وہ تم تک پہنچ جائیں۔ انہیں علم ہے کہ ہم دونوں بہت اچھی سہیلیاں ہیں لیکن وہ باتیں تمہارے لیے تکلیف دہ ہوں گی۔ نہ جانو تو زیادہ بہتر ہے۔ یوں بھی ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب تک تیمور تمہیں چاہتا ہے' تب تک یہ سب باتیں بیکار ہیں۔"

"میں پھر بھی سب پتہ جاننا چاہتی ہوں۔" میرا انداز فیصلہ کن تھا۔

"بتا دو فرو! اچھا ہے' اسے بھی معلوم ہو جائے کہ اس نے کون سی سائیڈ سیف رکھ کر کھیلنا ہے۔" نبیلہ نے کہا۔

"انہیں تم کچھ زیادہ پسند نہیں آئیں۔" نیلوفر نے کہنا شروع کیا۔ "اس سلسلے میں ان کا جو معیار ہے تم جانتی ہی ہو۔ اس بارے میں انہوں نے تیمور سے بھی بات کی تھی اور اعتراضات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کی تھی۔ ایک نہیں انہیں تم میں بے شمار خامیاں نظر آئی ہیں۔ مگر ان سب کو جانے دو۔ تیمور بہر حال اب بھی اڑا ہوا ہے۔ اس نے آنٹی سے صاف کھلے لفظوں میں کہا ہے کہ "سجو ورنہ کوئی بھی نہیں۔"

اب انہیں امید ہے کہ چونکہ سجو میں ان کے حساب سے کوئی خاص بات تو ہے نہیں' اس لیے جلد ہی تیمور کو اپنی حماقت کا احساس ہو جائے گا اور وہ یہ بیکار کی ضد چھوڑ دے گا۔ بس اسی لیے وہ وقتی طور پر خاموش ہیں۔ جب موقع آئے گا تب دیکھی جائے گی۔ پہلے ہی کیوں ماں بیٹے میں بلاوجہ ناراضگی ہو جائے۔"

میں خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ یہی سب سوچ سوچ کر میرے سر میں بھی درد ہونے لگا تھا میرا دل ہر چیز' ہر بات سے اچاٹ ہو رہا تھا۔

"پتا ہے بیلا میرا دل چاہ رہا ہے کہیں دور چلی جاؤں۔ کم از کم تھوڑے دن تک ان سب بکھیڑوں سے دور رہوں۔ کچھ نہ سوچوں۔ سب کچھ اپنے ذہن سے جھٹک دوں۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

"تم ایسا کرو' تھوڑے دن کے لیے آفس سے چھٹی لے لو۔ گھومو پھرو۔ ٹی وی دیکھو۔ فلمیں دیکھو۔ باقی سب کچھ بھول جاؤ۔" نبیلہ نے مشورہ دیا۔

"اس شہر میں رہتے ہوئے سب کچھ میرے سر پر سوار رہے گا۔ تیمور رات کو فون ضرور کرتا ہے۔ پھر کچھ نہ کچھ بات نکل آتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک ترکیب میرے پاس بھی ہے چاہو تو سن لو۔" نیلوفر بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"امینہ خالہ کراچی میں رہتی ہیں۔ کب سے بلا رہی ہیں چلو ان کی طرف چلتے ہیں۔ تم تو ملی ہو ان سے۔ ان کی کمپنی میں کوئی بور نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں سجو! میں تو کہتی ہوں کہ چند دن کے لیے ہو آؤ۔ اس قنوطیت سے نکلنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ تمہاری سراؤنڈنگز تبدیل ہوں۔ اسی صورت میں تم کوئی پازیٹو بات سوچ سکو گی۔" نبیلہ نے بھی اتفاق کیا۔

قبل اس کے کہ اس بارے میں' کوئی فیصلہ کرتی' نیلوفر نے جانے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

روانگی سے قبل میں تیمور سے ملی۔ میں اس سے دس بارہ دن بعد مل رہی تھی لیکن ان دس بارہ دنوں میں ہی وہ کافی کمزور سا لگنے لگا تھا۔ چہرے پر بھی پیلاہٹ سی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ اتنے کمزور ہو گئے ہو۔" میں اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"پتا نہیں تم سب کو کیا ہوا ہے۔ ہر کوئی اسی فکر میں گرفتار ہے کہ کیا ہو گیا ہے حالانکہ ہوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کھانے پینے اور سونے کے اوقات گڑبڑ گئے ہیں اور پڑھائی کا وقت بڑھا دیا ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ تم بتاؤ کہ تم نے اچانک کیسے پروگرام بنا لیا کراچی جانے کا؟"

"بس ذرا چینج کے لیے لیکن اب تمہیں دیکھ کر دل نہیں چاہ رہا جانے کو۔ دس بارہ دنوں میں صحت کا یہ حال کر لیا تم نے۔ خود کو دیکھا ہے آئینے میں؟"

"کہہ جو رہا ہوں' کچھ نہیں ہوا۔ تم عورتیں اس قدر وہمی کیوں ہوتی ہو؟ یہ سب اس بات کا اثر ہے کہ تم نے مجھے کئی دن بعد دیکھا ہے۔"

نیلوفر آئی تو میں نے اسے اطلاع دے دی کہ میرا پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔

"وہ کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"تم نے تیمور کو دیکھا ہے۔ کل زبردستی بھی اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوا میں لے جاؤں گی۔"

"اس کام کے لیے اس کی ممی کافی ہیں۔ اپنے گھر والوں کی صحت کی فکر جتنی انہیں ہوتی ہے اتنی کبھی کسی کو نہیں ہو سکتی۔ ایک چھینک آ جائے کسی کو تو ڈاکٹر بلوا لیا جاتا ہے اور تمہاری اور اس کی ممی کی آنکھوں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ مسئلہ کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ امتحان میں ڈھائی تین مہینے رہ گئے ہیں اور تیمور نے بھی پڑھائی کو سر پر سوار کر لیا ہے۔ اس کی ممی کو تو غشی کے دورے پڑ رہے ہیں اسے دیکھ دیکھ کر۔ وہ خود بھی گلوکوز پئیں گی' اسے بھی ڈرم کے ڈرم پلائیں گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔" نیلوفر ہنستی رہی۔

مگر میں پھر بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ تیمور کا فون آ گیا۔

"کل تم کراچی جاؤ گی اور ضرور جاؤ گی۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ قنوطیت کے بعد تم پر پاگل پن کا جو دورہ پڑا ہے آج وہ بھی اسی صورت ٹھیک ہو گا۔ جب تھوڑی چینج آئے گی۔ فرد کا اتنا غصہ بھرا فون آیا تھا مجھے۔ نہ تنگ کرو سب کو اتنا۔"

نہ چاہتے ہوئے ہی لیکن اگلے روز ہم کراچی فلائی کر گئے۔ سب نے ٹھیک کہا تھا کہ میرے لیے تبدیلی ضروری تھی۔ ماحول بدلا تو میرے ذہن پر پڑے بوجھ بھی کم ہونے لگے۔

امینہ خالہ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کے دونوں بچے بھی پانچویں اور ساتویں کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ ان کے گھر کوئی بور ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سب بہت زندہ دل اور ہنس مکھ تھے۔ ان کے میاں بزنس مین تھے۔ زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ اور جب گھر آتے تو بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتے۔ ہر وقت ہنگامہ سا رہتا تھا۔ اسکولوں میں چھٹیوں کی وجہ سے بچے گھر پر ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ مل کر ہم اتنا گھومے پھرے کہ سارا کراچی ازبر ہو گیا۔ ہر دوسرے دن سمندر کے مختلف ساحلوں پر پکنک ہوتی تھی۔ کوئی اچھا ریسٹورنٹ یا ہوٹل ہم نے نہیں چھوڑا تھا۔ خریداری کے لیے نکلتے تو صبح سے شام ہو جاتی۔

ہم ایک ہفتہ رہنے کے لیے گئے تھے اور پورے بیس دن رہ کر آئے۔ اس دوران کبھی تو بہت شدت سے میرا دل چاہتا کہ اس لحات میں تیمور میرے ساتھ ہوتا۔ کبھی اسے فون کرنے اور اس کی آواز سننے کو دل چاہتا تھا لیکن آنے سے پہلے اس نے مجھے منع کر دیا تھا۔

"پھر فون پر بات ہوتی رہی تو تم ذہن پر جو بوجھ رکھ کر جا رہی ہو' اسی سمیت واپس آ جاؤ

گی۔ چند دن کی بات ہے اس لیے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ بھول کر ریلیکس ہو کر آؤ۔"

آنے سے پہلے ہم نے گھر اطلاع کر دی تھی اور مجھے یقین تھا کہ تیمور بھی ائیرپورٹ پر ہو گا لیکن وہاں صرف پاپا اور نبیلہ تھے۔

گھر پہنچ کر بالآخر میں رہ نہیں سکی۔

"تیمور کو نہیں بتایا تھا میرے آنے کا؟" میں نے نبیلہ سے پوچھا۔

"شروع میں تو چند دن اس کا فون آتا رہا تھا۔ مجھ سے پوچھتا تھا کہ جو نے کوئی فون کیا۔ بعد میں شاید پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ ویسے بھی اس نے خود ہی تمہیں فون کرنے سے منع کیا تھا۔ کل میں نے اسے فون کر کے تمہاری آمد کی اطلاع دینا چاہی تو کسی ملازمہ نے بتایا کہ وہ پچھلی رات امریکہ فلائی کر گیا ہے۔ اس کی ممی بھی ساتھ ہی تھیں۔"

"امریکہ؟ کیوں؟ کیا اچانک پروگرام بن گیا؟ جب تک میں یہاں تھی تب تک تو پروگرام نہیں تھا اور کچھ نہیں تو اپنے جانے کی اطلاع کر دیتا۔ واپس آئے تو پوچھوں گی۔" میں نے کہا پھر اچانک خیال آیا۔ "ملازمہ نے بتایا کہ کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"زیادہ دن نہیں رہے گا وہاں پر۔ ہے ناں؟ امتحان سر پر ہیں اس کے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

اتنے دن چھٹیوں کے بعد آفس جوائن کیا تو کام بھی کافی زیادہ تھا۔ چند دن تو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ جب ذرا کام کچھ کم ہوا تو اپنی زندگی کے مسائل پھر اولیت حاصل کر گئے۔

"آخر اور کتنے دن تیمور کو وہاں رہنا ہے؟" میں سوچتی۔ "اور کچھ نہیں تو کم از کم فون ہی کر دیتا۔ اسے اتنا بھی احساس نہیں ہے کہ میں کتنی پریشان ہوں اور اسے کس قدر مس کر رہی ہوں۔ اتنا لاپروا تو نہیں ہے کہ وہ فون تک نہ کرے۔ یا پھر شاید وہ تو فون کرنا چاہتا ہو مجھے اطلاع دینا چاہتا ہو لیکن اس کے ساتھ جو اس کی اماں چلی گئی ہیں۔ انہوں نے کوئی دباؤ ڈال کر اسے منع کر دیا ہو۔" ہر سوچ کا اختتام اسی بدگمانی پر ہوا کرتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ تیمور بہت ذمے دار تھا۔ آخر اور کیا وجہ ہو سکتی تھی اس غفلت کی۔

دن گزر رہے تھے اور میرے اضطراب اور پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''فرو! تجھے بھی کچھ نہیں پتا؟'' میں الجھن کے ساتھ اس سے پوچھتی۔

''تجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ تایا بھی امریکہ میں ہی ہیں۔ گھر کے تین ہی تو افراد ہیں اور تینوں امریکہ بیٹھے ہوئے ہیں مجھے کیا پتا چل سکتا ہے۔''

''ہمایوں کو بھی علم نہیں؟ وہ دونوں تو بہت اچھے دوست ہیں۔''

''میں اتنی مرتبہ ہمایوں سے پوچھ چکی ہوں کہ اب ایک بار بھی مزید پوچھا تو وہ شک و شبے میں میرا گلا دبا دے گا۔ کیوں میری ننھی سی جان کے پیچھے پڑ گئی ہے تو؟''

مہینہ بھر ہو چلا تھا جب نیلوفر نے مجھے تیمور کی واپسی کی اطلاع دی۔

''سوہنی بیگم! جا کر مہینوال سے مل آؤ۔ بے شک وہ واپس آ گیا ہے لیکن تاوان کے طور پر اس کے گوشت کے کباب ضرور طلب کرنا۔ اس کی تمہیں اجازت ہے۔''

''آ گیا ہے' کب آیا؟ تم ملی ہو اس سے؟ کیسا ہے؟ بتایا' کیوں گیا تھا؟ اور اتنے دن کیوں لگا دیئے۔ واپسی میں؟ میرا پوچھا تھا اس نے؟ اسے کہنا تھا کہ میں بات نہیں کرنا چاہتی اس سے۔ سخت موڈ آف ہے میرا۔''

''خدا کی بندی اپنی اسپیڈ تھوڑی کم کرو تو میں کسی بات کا جواب دوں۔'' وہ بولی۔

''کہو بھی۔ جلدی کرو۔''

''میری اس سے صرف فون پر بات ہوئی ہے۔ اس وقت وہ سونے لگا تھا اس لیے تفصیلی بات نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا تھکا ہوا ہوگا آرام کر لے۔ اصل میں تایا نے اپنے آنے کی اطلاع صرف ڈیڈی کو دی تھی۔ ان سے مجھے پتا چلا۔ یوں بھی سب سے پہلے اس کی کھنچائی کرنے کا حق تمہارا ہی ہے۔ اس لیے بھی میں نے اس کار خیر کے بغیر ہی فون بند کر دیا۔''

''کب فون کیا تھا اسے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی اسے فون کر کے فارغ ہوئی تھی اور ساتھ تمہیں اطلاع دے دی۔'' اس نے بتایا۔

میں نے گھڑی دیکھی' رات کے سوا دس بج رہے تھے یہ سوچ کر کہ وہ سو رہا ہوگا' میں نے اسے فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

''ویسے تو اس کی سزا یہی ہونی چاہیے کہ اسے سوتے میں جگا دیا جائے لیکن ابھی رہنے دیتی ہوں۔ صبح فون کروں گی۔'' میں نے سوچا۔

صبح آفس جانے کی تیاری سے بھی قبل میں نے اسے فون کیا۔

''ابھی صاحب سو رہے ہیں۔'' ملازمہ نے بتایا۔

''کب تک جاگیں گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔''

''اچھا پلیز میرا میسج لے لیں۔ جب وہ جاگیں تو انہیں کہیں کہ تجیلہ بی بی کو فون کر لیں۔''

''جی کہہ دوں گی۔''

''کیا کہنا ہے ایک بار بتا دینا'' اپنی تسلی کے لیے میں نے اس کے منہ سے ایک مرتبہ پھر پیغام سنا۔

''یہ بھولنا مت۔ یاد سے دے دینا۔ بہت ضروری ہے۔'' میں نے تاکید کر کے فون بند کر دیا۔

آفس میں بھی میں بے چین ہی رہی۔ نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اٹھتی تھیں۔

''اب تک تو اسے اُٹھ جانا چاہیے تھا۔'' میں سوچ رہی تھی۔

یہ بھی مجھے اندازہ تھا کہ میسج ملے یا نہیں' وہ مجھے فون ضرور کرے گا لیکن جب ساڑھے گیارہ بج گئے تو میں نے خود ہی فون کر لیا۔

''صاحب سو رہے ہیں۔'' دوبارہ یہی جواب ملا۔

''انہیں جگا دو۔ اور کتنا سوئیں گے؟'' میں جھنجھلا گئی۔ میں اس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھی اور وہ مزے سے سو رہا تھا۔

''جی حکم نہیں ہے۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے ہر ایک گھنٹے کے بعد اسے فون کیا لیکن اس سے بات نہ ہو سکی۔ پہلے علم ہوا کہ سویا ہوا ہے پھر خبر ملی کہ کہیں باہر نکل گیا ہے۔ میں نے سوچا شاید مجھے لینے آ جائے لیکن کتنی دیر گزر گئی۔ پھر فون کیا تو بھی پرانا جواب ملا۔

''کہیں گئے ہوئے ہیں صاحب۔ بتا کر نہیں گئے کہ کہاں جانا ہے اور کب واپسی ہو

گی۔''

مجھے غصہ آ رہا تھا اور الجھن بھی ہو رہی تھی۔ تین دن تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ میں نے نیلوفر اور نبیلہ سے بات کی لیکن ان کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

''ممکن ہے اسے کوئی کام پڑ گیا ہو۔ امتحانوں میں بھی اب مہینہ سوا مہینہ ہی رہ گیا ہے۔ سارا وقت وہ اپنے عشق کی نذر تو کرنے سے رہا۔''

''ایک مرتبہ مل بھی نہیں سکتا تھا؟ فون بھی نہیں کر سکتا تھا؟ کبھی سو رہا ہوتا ہے' کبھی پڑھ رہا ہوتا ہے' کبھی گھر پر نہیں ہوتا۔ اسے احساس بھی نہیں ہے کہ میں اسے کیسے مس کر رہی ہوں۔ ایک مرتبہ ملے تو سہی مجھے' پھر پوچھوں گی۔ ذرا احساس نہیں ہے اسے میرا۔'' میں غصے سے بل کھا رہی تھی۔

''تو تم خود جا کر اسے مل لو۔'' انہوں نے مشورہ دیا۔

''ایسی گئی گزری بھی نہیں ہوں میں۔ اسے میرا خیال نہیں ہے تو مجھے بھی اس کا خیال نہیں ہے۔ پہلے کچھ بتائے بغیر امریکہ چلا گیا۔ اب واپس آنے کے بعد ایسی بے مروتی اور بے وفائی کہ ملنا تو دور فون کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ مجھے سمجھا کیا ہوا ہے اس نے۔ اب میں بھی اسے نہیں پوچھوں گی۔''

چار دن گزر گئے۔ میں نے تہیہ کیا تھا کہ اب میں خود نہ اسے فون کروں گی اور نہ ملنے جاؤں گی لیکن یہ تہیہ اپنی جگہ' یہ نہیں تھا کہ کسی لمحے بھی وہ مجھے یاد نہ آیا ہو یا اس سے ملنے کے لیے دل نہ مچلا ہو۔ کتنی مشکلوں سے خود کو باز رکھا تھا۔ میں نے اسے ٹیلی فون کرنے سے۔ اب تک میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ عجیب عجیب سے وسوسے میرے دل میں جنم لینے لگے تھے۔ سب سے زیادہ بدگمانی مجھے اس کی ممی کی طرف سے تھی لیکن میں اپنے بدترین خدشات بھی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ جس زاویے سے سوچتی تھی' مجھے اس کی ممی کا ہی قصور نظر آتا تھا۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ سے اتنی شدت سے محبت کرتا تھا میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا۔

پھر بالآخر میرے بدترین خدشات کو نبیلہ نے زبان دے دی۔

''اتنے دن ہو گئے اور تیمور نہیں آیا۔ فون پر بھی بات نہیں کر رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں ٹالنا چاہتا ہے۔ تم اپ سیٹ تو ہو لیکن بہتر ہو گا کہ خود کو اس سے بھی بُری کسی صورت حال کے

لیے ذہنی طور پر تیار کر لو۔''

''بیلا تم تو ایسے مت کہو۔ تمہیں تو اندازہ ہونا چاہیے کہ میں اس کے لیے کیسے سوچتی ہوں۔ وہ میرے لیے کیا ہے۔ اسے بھی جانتی ہو تم۔ وہ ایسا نہیں ہے۔'' میں روہانسی ہو گئی۔

''حقیقت کو قبول کر لینا چاہیے۔ میں نہیں جانتی کہ اس کے اس رویے کی وجہ کیا ہے لیکن جو بھی ہے وہ عام یا معمولی بات نہیں ہے' ممکن ہے اس کی ممی نے اس پر کوئی دباؤ ڈالا ہو۔ وہ اکلوتا بیٹا ہے۔ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا ہے شاید وہ ان کے دباؤ میں آ گیا ہو۔''

میں ایک دم رو پڑی۔ ''محبت تو وہ مجھ سے بھی کرتا ہے۔''

''ان دونوں محبتوں میں فرق ہوتا ہے سجو۔ تم سے محبت کرتے اسے ابھی اتنے دن بھی نہیں ہوئے ہوں گے جتنے اپنی ماں سے محبت کرتے سال ہو چکے ہوں گے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اکلوتا ہونے کے ناتے وہ ان سے اپنی بات منوا سکتا ہے تو اتنی ہی آسانی سے وہ والدین کے دباؤ میں بھی آ سکتا ہے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ بیلا کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ کیا میں اسے جانتی نہیں ہوں۔ میری خاطر وہ فائٹ کر سکتا ہے' اسٹینڈ لے سکتا ہے۔ میں نہیں مان سکتی کہ وہ کسی دباؤ میں آ گیا ہے۔'' میں اور شدت کے ساتھ رو پڑی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ تم ایسا کرو کہ اس سے صاف صاف بات کر لو تا کہ تمہیں اندازہ ہو سکے کہ تم کہاں کھڑی ہو۔ اس کے بعد حالات جو بھی رُخ اختیار کریں تم کم از کم بے یقینی کی اس موجودہ کیفیت سے تو نکلو گی۔ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اب بھی تمہارا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے اور اگر یہ علم ہو کہ اس نے اپنی راہیں بدل لی ہیں تو تم بھی اپنی زندگی کا یہ باب بند کر دو۔''

''پلیز بیلا! تم سے اس تکلیف دہ بات کی مجھے امید نہیں تھی۔''

''سجو! کیا میں تمہیں تکلیف پہنچا سکتی ہوں؟ میری جان! میں تو چاہتی ہوں کہ تمہیں بڑی تکلیف سے بچا لوں۔ ممکن ہے تمہیں میری باتیں تلخ لگ رہی ہوں لیکن کبھی کبھار ڈاکٹر بھی تو کڑوی گولی یا انجکشن دیتا ہی ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ کراچی جانے سے قبل بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اور واپس آنے کے بعد سب کچھ بکھر گیا تھا۔

میرے سامنے ہی نبیلہ نے نیلوفر کو فون کیا۔

"فرو پلیز کچھ پتا کرو۔ تیمور کا' آخر کیا ہوا ہے۔ مجھ سے تو تجو کو نہیں سنبھالا جا رہا۔ اس وقت سے روئے جا رہی ہے۔"

پھر دوسری طرف تھوڑی دیر کوئی بات سننے کے بعد بولی۔ "میں اور پاپا سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن ہم سے تجو کا کوئی دکھ برداشت نہیں ہوگا۔ یہ اَپ سیٹ ہو تو ہم کھانا کھا سکتے ہیں' نہ سو سکتے ہیں۔" اس کی آواز بھی بھرا گئی۔

پھر کافی دیر تک ہوں ہاں کرتی نیلوفر کی بات سنتی رہی۔ جب ریسیور رکھ کر میری طرف پلٹی تو اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔

"کیا کہا فرو نے؟" میں نے بہت مشکل سے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"وہ آ رہی ہے۔"

ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ میں رونا نہیں چاہتی تھی لیکن بہت کوشش کے باوجود بھی خود پر قابو پانا مشکل تھا۔ نبیلہ نے پھر مجھے تسلی بھی نہیں دی۔ وہ اپنی سوچ میں گم تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد نیلوفر آ گئی۔ وہ بھی بہت افسردہ تھی۔ میرے سامنے بیٹھی تو میں اس کے چہرے پر وہ خبر تلاش کرنے لگی جو اس کے پاس تھی۔ اس نے نظریں چرا لیں۔

"آئی ایم سوری تجو! یہ سب میرا قصور ہے۔ میں نے ہی تمہیں اس کے لیے سوچنے پر مجبور کیا تھا لیکن تب مجھے کیا خبر تھی کہ ایسا ہوگا۔ ہمیں زندگی میں سے کچھ ہماری مرضی کے مطابق نہیں ملا کرتا۔ پلیز تجو اسے بھول جاؤ۔"

"بھول جاؤں؟" میں نے جیسے خود سے کہا پھر گویا ہوش میں آ گئی۔ "کیسے بھول جاؤں؟ کیا بھول جانا کسی کے بس کی بات ہوتی ہے۔ تم اپنی کسی عزیز از جان ہستی کو بھول سکتی ہو۔"

"اس باب کو بند کر دینا ہی بہتر ہے۔"

"کیوں بہتر ہے؟ کیسے بہتر ہے؟ تم تیمور سے ملی ہو' ہے ناں؟"

وہ خاموش رہی۔

"بتاؤ ملی ہو ناں؟ اس سے پوچھا ہے ناں؟ جو بات وہ تم سے کہہ سکتا ہے' وہی مجھ سے کیوں نہیں کہتا۔ ہر بار کیوں ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔ اتنی جرأت کیوں نہیں ہے اس میں

کہ میرا سامنا کر سکے۔ میں نے اسے پھانسی پر تو نہیں چڑھا دینا۔ وہ خود کیوں نہیں کہتا مجھ سے کہ میں اسے بھول جاؤں؟ اپنا انکار خود کیوں نہیں پہنچاتا مجھ تک؟" میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

وہ دونوں ساکت بیٹھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بغیر کچھ کہے نیلوفر اٹھی اور باہر نکل گئی۔

پاپا جم خانہ سے واپس آئے تو مجھے یوں روتے دیکھ کر گھبرا گئے۔

"کیا ہوا تجو کو؟" وہ تیزی سے میری طرف بڑھے۔ نبیلہ خاموش رہی۔ پاپا بھی بے خبر نہیں تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ میں کس قدر اَپ سیٹ تھی اور اس کی وجہ کیا تھی۔ میرے قریب بیٹھ کر میرا سر انہوں نے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ تھوڑی دیر وہ مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتے رہے پھر بولے۔

"زندگی انہی سب باتوں کا نام ہوتی ہے۔ ہمیں انہیں قبول کرنا چاہیے۔ اس بات کو بھی کہ ہم محض قیاس کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ ہم میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ یہ نہیں کہ فیصلہ درست تھا یا غلط۔ بہت سی باتیں وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے تجربے میں شامل ہو جاتی ہیں اور تجربے اچھے بھی ہوتے ہیں برے بھی۔"

میں ان کی باتیں سن بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی لیکن خود پر اور اپنے آنسوؤں پر میرا اختیار نہیں تھا۔ سو وہاں سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلی آئی۔

میرے لیے یہ قبول کرنا بہت مشکل تھا کہ تیمور نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ میں اس سے شدت کی محبت اور شدت کی نفرت کے درمیان معلق تھی۔

"جب اس نے مجھے اپنی زندگی سے اتنی بے دردی کے ساتھ نکال دیا تو وہ میری زندگی سے بھی نکل گیا۔" میں نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی۔

میں اپنی تمام تر حسیات کے ساتھ' تمام شعور کے ساتھ اس سے نفرت کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتی تھی۔ میں مزید رونا نہیں چاہتی تھی۔ آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی۔ اس شخص کے لیے جسے میری محبت کی نہ قدر تھی' نہ ضرورت۔ بہت محنت سے میں خود پر خول چڑھا رہی تھی۔ بے نیازی کا' لاپروائی کا۔

شام کو میں کار کی چابی لے کر باہر نکلی۔ لان میں پودوں کو پانی لگاتی نبیلہ مجھے کار کی طرف بڑھتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

''سجو! خیر تو ہے' اس وقت کہاں نکل رہی ہو؟'' وہ پائپ کیاری میں چھوڑ کر میری طرف چلی آئی۔

''کچھ نہیں۔ گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا کہ ڈرائیو پر نکلنا چاہیے۔'' میں نے سچ سچ کہہ دیا۔

چند لمحے وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتی رہی پھر میری بے نیازی اور لاپروائی دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔

''دیر مت کرنا۔ پاپا جم خانہ سے آئیں گے تو تمہیں نہ پا کر پریشان ہو جائیں گے۔ ان کے آنے سے پہلے آ جانا۔'' اس نے ہدایت دی۔

''ہاں تب تک تو آ ہی جاؤں گی۔'' میں نے کار اسٹارٹ کی۔

میرا یہی ارادہ تھا کہ تھوڑی دیر یونہی بیکار گھوم پھر کر آ جاؤں گی۔ اپنے ذہن سے تلخ یادوں کو مٹانے کے لیے بہت تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ میں مصروفیت چاہتی تھی تاکہ سوچوں کو خود سے دور رکھ سکوں' لیکن ڈیفنس کی ذیلی ویران سڑکوں پر کار دوڑاتے ہوئے ان سوچوں نے مجھے آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا۔

''وہ کہتا تھا میں تمہارے ساتھ ہوں تو ڈرتی کیوں ہو؟ میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ کوئی دکھ' کوئی تکلیف تم تنہا نہیں جھیلو گی' میں ہوں گا تمہارے ساتھ۔'' میں نے سوچا۔

اور میری آنکھوں میں ڈھیروں پانی اُتر آیا۔

''وہ کہتا تھا کہ اس سلسلے میں ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔''

اور میرے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔

''اس نے کہا تھا کہ میرا وجدان مجھے بتا دے گا' ایک لمحے سے بھی کم وقت میں' میں جان لوں گا کہ یہی لڑکی میرے لیے ہے' میری ہے۔ ایک گھنٹی سی بجے گی دل کے اندر۔ جمیلہ کو دیکھ کر ایسا ہی ہوا ہے۔ میرے دل کے اندر ایک گھنٹی سی بجی ہے۔ میرے وجدان نے کہا ہے کہ یہی تو ہے وہ جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی میں نے جان لیا تھا کہ اس لڑکی کو میری زندگی میں آنا ہے۔ میری دنیا آباد کرنی ہے۔''

سسکیاں ایک تواتر سے آنے لگیں۔

''جب فرو نے اس سے پوچھا تھا کہ سجو سے کہو گے کیا تو وہ بولا تھا کہ اس کا ہاتھ تھام کر

کہوں گا کہ اپنے دل کے بند دروازے میرے لیے کھول دو۔ میں اس وقت سے تمہارا منتظر ہوں جب ابھی مصر کی سرزمین نے آتم کا وجود نہیں دیکھا تھا۔ sumer میں سمندر کی دیوی نامو نے زمین اور جنت کو جنم نہیں دیا تھا۔ جب یونان میں Chaos سے دھرتی ماں ''گی'' وجود میں نہیں آئی تھی۔ جب ایران میں Ahura mazda پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب چین کے ہُن تن میں ابھی ین اور یانگ بیدار نہیں ہوئے تھے۔ جب جاپان کی سرزمین ازانامی اور ازاناگی کے وجود سے بے خبر تھی۔ جب وشنو نے گلابی کنول کے ساتھ اننت کے اوپر لیٹ کر دودھ کے سمندر میں تیرنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

جمیلہ! میں تب سے تمہارا منتظر ہوں۔''

اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''تیمور! کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں خواب دکھائے تھے مجھے؟ کیوں امید دلائی تھی؟ پہلے میری اطمینان بھری زندگی میں کنکر پھینک کر پُرسکون پانی کو منتشر کیا اور جب تلاطم بڑھنے لگا تو تمہارا کھیل ختم ہوا۔''

میں نہیں جانتی کہ کس طرح میں وہاں تک پہنچی تھی اور کب پہنچی تھی۔ ہوش آیا تو چوکیدار میرے لیے گھر کا گیٹ کھول چکا تھا۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے اپنے سامنے ایستادہ اس محل نما مکان کو دیکھا وہ حقیقت تھی یا نظر کا دھوکا۔

نہیں۔ وہ حقیقت ہی تھی۔ کوئی خواب بھلا اتنا تلخ کہاں ہوتا ہے؟ میں اسی مکان کے سامنے تھی جس کے وسیع اور نفیس ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تیمور نے مجھ سے ڈھیروں وعدے کیے تھے۔ اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔ مجھے حوصلہ دیا تھا۔ کبھی تنہا نہ چھوڑنے کا عہد کیا تھا۔

چوکیدار گیٹ کھولے منتظر تھا کہ میں کب کار اندر لے جاؤں گی۔

''نہیں میں اندر نہیں جاؤں گی۔ میں کسی کو اپنے دکھ پر ہنسنے کا موقع نہیں دوں گی۔ کسی کو اپنا شکستہ وجود نہیں دکھاؤں گی۔'' میں نے سوچا اور کار اسٹارٹ کرنا ہی چاہتی تھی کہ دور سے تیمور سوئمنگ پول سے نکلتا دکھائی دیا۔ اس نے شارٹس اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور تولیے سے اپنے بال خشک کرتا چلا آ رہا تھا۔

میں وہیں رک گئی۔ یوں جیسے کسی نے منتر پڑھ میرے پاؤں زمین کے ساتھ جکڑ دیے ہوں۔

نہ جانے وہ میری اپنی خواہش تھی یا کسی سحر کا اثر۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہی۔ کار بیک کر کے سڑک پر لے جانے کے بجائے میں سیدھی گھر کے اندر لے گئی۔ وہ اپنی دُھن میں مگن چلتا ہوا ڈرائیو وے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے بریک لگائے۔

وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک دم چونک گیا اور پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے نظر انداز کر کے وہ قدم آگے بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ میں کار سے اتر آئی۔

''ٹھہرو تیمور!'' میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں پھانسی پر چڑھانے نہیں آئی کہ اس طرح منہ چھپا کر بھاگنا چاہتے ہو۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے بات نہیں کرسکتا۔ اس وقت میں مصروف ہوں۔'' اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

میرے دماغ کا فیوز یہ سنتے ہی اُڑ گیا۔ غصے' دکھ اور بیتی یادوں نے مجھے پاگل ہی کر دیا تھا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ میری آواز کس قدر بلند تھی۔

''فیس کیوں نہیں کرتے ہو مجھے تم؟ مرد بن کر وعدے نبھا نہیں سکتے تو کم از کم مردوں کی طرح میرا سامنا کر کے انکار ہی کر دو۔ بھاگتے کیوں پھر رہے ہو مجھ سے؟ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم جیسے گھٹیا انسان پر اپنی محبت ضائع کی۔ تم جو اس کے قابل نہیں تھے۔ میرے لیے مر گئے ہو سمجھے؟''

وہ ساکت کھڑا تھا۔ میری مٹھیاں غصے اور دکھ کے مارے بھینچی ہوئی تھیں۔ کتنا کچھ کہنا چاہتی تھی میں' لیکن اس سے آگے کچھ نہ کہہ پائی۔ اس کی ممی نہ جانے کب وہاں آگئی تھیں۔ اس لمحے میں نے اس عورت کے لیے اتنی شدت سے نفرت محسوس کی کہ آج تک اور کسی سے کبھی نہیں کی۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ بولتا' میں کار میں بیٹھی اور تیزی سے اسے بیک کر کے گھر کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔

اس کے گھر سے میرے گھر تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اتنے سے فاصلے میں چار دفعہ میں شدید قسم کے ایکسیڈنٹ سے بال برابر فرق کے ساتھ بچی۔ گھر کے گیٹ کے اندر داخل

ہوئی تو میری ڈرائیونگ کا انداز دیکھ کر ہی نبیلہ گھبرا کر لان چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر تیزی سے میری طرف لپکی۔ میں وہیں اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔

میری طرف کا دروازہ کھول کر اس نے سہارا دے کر مجھے باہر نکالا۔

''سجو! سجو! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میری جان روؤ مت پلیز۔''

بہت مشکلوں سے وہ مجھے میری خواب گاہ تک لائی اور بستر پر بٹھا دیا۔

''اس نے مجھے اپنی زندگی سے نکالا تھا ناں بیلا۔ آج میں نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ آج سے وہ مر گیا ہے میرے لیے' مرنے والوں کے لیے آخر کتنے دن روتا ہے انسان' بالآخر صبر کر لیتا ہے۔ مجھے بھی صبر آ جائے گا۔ بس آج رو لینے دو۔''

نبیلہ ہونٹ کاٹ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پیچھے دھکیل رہی تھی۔ مجھے لٹا کر وہ دواؤں کے خانے سے گولی نکال لائی اور تقریباً زبردستی پانی کے ساتھ مجھے کھلا دی۔ پھر میرا سر گود میں رکھ کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

اس کی گود میں سر رکھے کتنی دیر تک میں ہچکیوں کے ساتھ روتی رہی پھر نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

آنکھ کھلی تو سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ نبیلہ اور پاپا دونوں رے گرد تھے۔

☆======☆======☆

یہ وہ وقت تھا جب دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میرے لیے اپنا مفہوم کھو چکے تھے۔ نہ چمکتا سورج میرے لیے کوئی حقیقت رکھتا تھا' نہ چاند کی ٹھنڈی چاندنی کی کشش باقی رہی تھی۔ جب محبت کھو چکی تھی تو ضرورتوں کا حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا میں نے۔

میں روتی نہیں تھی لیکن نبیلہ اور پاپا میری خاموشیوں سے خوفزدہ تھے۔ مجھ سے ایسی باتیں کرتے تھے جن کے جواب طویل ہوں۔ میں باتیں کرتی تھی لیکن بولتے بولتے لفظ گم ہو جاتے تھے۔ سوچیں بکھر جاتی تھیں۔ بس ایک چہرہ رہ جاتا تھا۔ وہ ہنستا ہوا چہرہ جس نے پہلی مرتبہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''کہاں کمی تھی میری محبت میں؟ کیا طلب کیا تھا اس نے جو میں دے نہیں پائی تھی؟ کہیں کوئی بنیاد تو ہوتی۔'' میں سوچتی اور پھر اس کی ماں کا نفرت انگیز چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ ''میری محبت میں کہیں کمی نہیں تھی۔ ہاں میرے باپ کے پاس روپوں سے بھری کوئی تجوری نہیں تھی۔ میری شکست کا سبب محبت میں کمی نہیں' دولت میں کمی تھی۔ تم نے تیمور میری محبت کو تولا بھی تو کس ترازو میں۔''

میری سوچیں لامتناہی تھیں۔ کہیں کوئی حد نہیں تھی ان کی۔ کوئی انت نہیں تھا۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوتی تھی کب کوئی مجھ سے مخاطب ہوا' کب مجھے آواز دی۔

لیکن اس فون نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ فون مجھے اکثر چونکا دیا کرتا تھا۔ کبھی جب گیلری سے نبیلہ کی سخت غصے میں بھری آواز اُبھرتی۔

''اب یہاں فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کسی سے بات نہیں کرے گی۔''

اور ساتھ ہی ریسیور کریڈل پر پٹخنے کی آواز۔ میں نے اس سے اس بارے میں کبھی

استفسار نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ریسیور کریڈل پر پٹختی تھی اور میں بھی اپنی سوچوں کی دنیا میں پلٹ جاتی تھی۔

نیلوفر روز آیا کرتی تھی' نبیلہ کا رویہ اس سے بھی سرد مہر ہو گیا تھا۔ میری موجودہ حالت کا وہ اسے بھی برابر کا ذمے دار سمجھتی تھی لیکن نیلوفر اس کے رویے سے دلبرداشتہ نہیں ہوتی تھی۔ اس کے رویے اور انداز میں فرق نہیں آیا تھا۔ جب نبیلہ روکھے پن سے اس سے کہتی۔

''وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے سونے کے لیے گئی ہے اسے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں۔''

تو وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر میرے جاگنے کا انتظار کرتی تھی۔ حالانکہ میں سوئی بھی نہیں ہوئی تھی۔

اور جب وہ کہتی تھی۔ ''روز روز آ کر ہجو کو ڈسٹرب مت کیا کرو۔ ہم نے بہت مشکلوں سے اسے اس کیفیت سے نکالا ہے۔ اب اسے دوبارہ اسی کھائی میں دھکا مت دو۔''

تب بھی نیلوفر خاموش رہتی تھی۔ کبھی پلٹ کر اس نے نبیلہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ پھر بھی ہر روز آیا کرتی تھی۔

جب وہ لان میں میرے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی گوسپ سنا کر میرا دل بہلانے کی کوشش کر رہی ہوتی تھی' تب بھی نبیلہ آ جاتی تھی۔

''اتنا بولتی ہو تم فرو! سب کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔''

اور وہ برا ماننے کے بجائے ہنس دیتی تھی۔ اُس روز نبیلہ گیلری میں کھڑے ہو کر پھر فون پر برس رہی تھی۔ نیلوفر میرے پاس لاؤنج میں تھی۔

''پتا ہے اتنی تواتر سے یہ کس کا فون آتا ہے؟''

اس بات کا جواب دینا بے کار تھا۔ وہ کسی کا بھی فون تھا' مجھے اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس نے نبیلہ کے کچن میں چلے جانے کا انتظار کیا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تیمور کی ممی ہر حالت میں تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ مجھ سے کہہ رہی تھیں۔''

میں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''اب اسے مرے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں کہ ماتم کرنا بھی بیکار ہے کجا یہ کہ تعزیت کی جائے۔''

نیلوفر نے شاکی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے نہیں آئی۔

میری خاموشی برقرار تھی لیکن خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں گھر کے کاموں میں اُلجھی رہتی۔

"تمہیں عادت نہیں ہے۔ جو! رہنے دو۔ میں کرلوں گی۔" نبیلہ کہتی۔

"عادت ڈالنے سے ہی عادت پڑتی ہے۔" میں کہہ کر مصروف ہو جاتی۔

پاپا بھی نبیلہ کو ٹوکتے تھے۔ "اچھا ہے آپ کے ساتھ ہاتھ بٹا دیتی ہے۔ آپ بھی تھک جاتی ہیں۔"

حالانکہ جو کام میں کرتی تھی' ان کے لیے گھر میں نوکرانی موجود تھی۔ پاپا بھی چاہتے تھے کہ میں مصروف رہوں۔ کبھی اخبار میرے پاس لے آتے۔

"میری پڑھنے والی عینک کی کمانی ٹوٹ گئی ہے بیٹا یہ اخبار پڑھ دینا۔"

اور میں جانتی تھی کہ اب تک اس عینک کی کمانی کیوں نہیں بنوائی گئی۔

اور کبھی مجھے اپنے ساتھ جم خانہ لے جاتے۔

"چلو تینوں آؤٹ نگ پر چلتے ہیں۔"

نبیلہ نہ جاتی تب بھی وہ مجھے ضرور لے جاتے۔ میں نے ان کی کسی بات سے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ جیسے وہ کہتے تھے' میں بلا چوں وچرا ویسے ہی کرتی تھی۔

☆======☆======☆

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے میں نے فون سننا چھوڑ رکھا تھا۔ یہ پابندی میں نے خود ہی اپنے اوپر لگائی تھی۔ میں منتظر تھی کہ نبیلہ نہا کر نکلے گی تو وہی فون سن لے گی۔ پھر خیال آیا کہ پاپا بات کرنا چاہتے ہوں۔ وہ گھر سے باہر ہوتے تو اکثر فون کر کے نبیلہ سے میرے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔

"میں نے خود کو کیوں پابندیوں میں جکڑ لیا ہے؟ اپنی زندگی کیوں برباد کر لی ہے؟ آفس جانا چھوڑ دیا ہے۔ کیا وہ اتنا ہی اہم ہے کہ اس کی جدائی میں زندگی کو لاش کی طرح گزار دیا جائے۔ نہیں' وہ ہرگز اتنا اہم نہیں ہے۔" میں نے سوچا اور بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔"

"پلیز' جمیلہ شاہ سے بات کروا دیں۔ پلیز میں منت کرتی ہوں ہاتھ پاؤں جوڑتی

ہوں۔ میری جمیلہ سے بات کروا دیں۔"

اس آواز کو میں بھول نہیں سکتی تھی۔ ہاں آج اس میں اس روز والا غرور' تصنع اور طنطنہ نہیں تھا۔

"مجھے افسوس ہے' میں مصروف ہوں۔ کسی سے بھی بات نہیں کر سکتی۔" میرے لہجے میں خود بخود زہر اُتر آیا۔

میں نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ عورت کیوں رو رہی تھی۔ جیسے میرا لہجہ ٹوٹا ہوا' شکستہ تھا ویسا ہی لہجہ آج اس کا کیوں تھا۔ یہ سب باتیں میرے لیے غیر اہم تھیں۔ میں ریسیور واپس رکھنے لگی تھی کہ اس کی آواز اُبھری۔

"اللہ کے واسطے فون بند مت کرنا۔ جمیلہ تمہیں اپنے سب سے پیارے شخص کی قسم میری بات سن لو۔"

"سب سے پیارے شخص کی قسم۔" میرے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ کرچیوں نے ایک مرتبہ پھر روح کو گھائل کر دیا۔

اب میں چاہتی تب بھی ریسیور واپس نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لمحے اپنی بے بسی پر مجھے بے تحاشا غصہ آیا۔ آخر میں کیوں ہار جاتی تھی؟ کمزور لمحے کیوں مجھے اپنی گرفت میں لے لیتے تھے؟ کاش میں مضبوط ہوتی مگر میں بہت عام سی لڑکی تھی۔

"جمیلہ تم نے اسے موت سے پہلے مار دیا۔ میرے بیٹے کو مرنے سے پہلے مار دیا تم نے۔ تمہارے لفظوں نے ختم کر دیا اسے۔ سن رہی ہو تم؟ وہ قصوروار نہیں ہے۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ کاش تم نے جاننے کی کوشش کی ہوتی۔ یوں اپنے لفظوں سے اس کے زخم ادھیڑ کر نہ رکھ دیئے ہوتے۔

پلیز جمیلہ! میرے بیٹے کو بچا لو۔ اسے صرف تم بچا سکتی ہو۔ صرف تمہاری دعائیں اور تمہاری محبت اسے موت کے بڑھتے پنجوں سے نکال سکتی ہے۔ چاہے تم میری سب دولت لے لو' جو چاہتی ہو مجھ سے لے لو۔ بس ایک بار اسے کہہ دو کہ تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو۔ صرف ایک بار۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

میں گنگ کھڑی تھی۔ جو لفظ ابھی میری سماعتوں میں اترے تھے ان کے لہجے نے کتنے رنگ بدلے تھے۔ پہلے غصہ تھا پھر دھمکی پھر منت اور التجا اور بالآخر صرف اور صرف بے بسی۔

لیکن وہ کیا کہہ رہی تھیں' کیوں کہہ رہی تھیں ایسا؟ کیا ہو گیا تھا تیمور کو؟
میں پوچھنا چاہتی تھی مگر الفاظ نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ ریسیور ہاتھ میں تھامے
ں بت بنی کھڑی تھی۔

''وہ مر رہا ہے اسے بچا لو۔ پلیز۔''

''نہیں۔ وہ کیسے مر سکتا ہے۔ میرا تیمور کیسے مر سکتا ہے؟ آپ جھوٹ بولتی ہیں۔ ایک اں ہو کر ایسی بات کر رہی ہیں آپ کا کلیجہ نہیں کٹتا؟ کیسی ماں ہیں آپ۔ آپ کے پاس اسے بیٹے کے لیے دعائیں نہیں ہیں تو اتنی بڑی بددعا تو نہ دیں اسے۔'' میں ہوش میں آ گئی تھی۔

''کوئی ماں اپنے بیٹے کو یہ بددعا دے سکتی ہے؟ یہ ممکن ہوتا تو میں اپنی جان دے کر اپنے بیٹے کو بچا لیتی۔ میں نے اور اس کے ڈیڈی نے تو یہ کوشش بھی کی۔ ایک ایک ڈاکٹر کے سامنے میں روئی اور گڑگڑائی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ میری جان لے کر میرے بیٹے کو بچا لو پر وہ کہنے لگے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ وہ تقدیر کو نہیں بدل سکتے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے حضور التجائیں کرتی ہوں' وہ بھی نہیں سنتا۔ ایک ڈیڑھ سال اتنا طویل عرصہ نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے پلک جھپکتے میں یہ وقت گزر رہا ہو۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ کینسر سے نہیں بچے گا۔ بہت ہوا تو اس کی زندگی کے صرف ایک ڈیڑھ سال باقی ہیں۔ یہ وقت تھم کیوں نہیں جاتا؟ ابھی اسی وقت اسی لمحے قیامت کیوں نہیں آ جاتی۔''

''کینسر' ایک ڈیڑھ سال۔'' یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند میری سماعتوں میں اترے۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

☆======☆======☆

اس کے بعد میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ خوابوں سے حقیقت کی دنیا کا سفر تھا۔ بہت تکلیف دہ بہت کربناک۔ ایک ایک لمحہ جیسے پل صراط سے گزرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے گرد خواب بن لیتی تھی۔ انہی کی چادر اوڑھ کر سو جاتی تھی۔ پھر کہیں بالکل اچانک حقیقت کی تیز دھوپ جھلسا دیتی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ جاتی تھی۔ حیران پریشان اپنے گرد و پیش دیکھتی تھی۔ میں جدوجہد کرنے سے نہیں تھکتی تھی لیکن ساری دنیا کی جدوجہد کے بعد بھی خالی ہاتھ رہ جانے کا دکھ برداشت کرنا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

سفر شروع کرنے سے قبل انسان کتنا پُرعزم ہوتا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ راہ

میں بہت کانٹے ہیں۔ کہیں سایہ دار درخت نہیں اور سورج بھی سوا نیزے پر اترا ہوا ہے پھر بھی یوں لگتا ہے کہ۔

''ساری بپتا کٹ جائے گی۔ اور سب گھاؤ بھر جائیں گے۔''

لیکن جب سفر شروع ہوتا ہے اور کانٹے دار جھاڑیوں میں اُلجھ کر پورا وجود زخم زخم ہو جاتا ہے تب صرف ایک احساس غالب آنے لگتا ہے کہ آخر ہم نے یہ سفر کیوں شروع کیا تھا۔ اتنی مسافت کس لیے طے کی تھی؟ راہ کی آبلہ پائی گراں نہیں ہوتی۔ دکھ تو یہ ہوتا ہے کہ جس کے لیے یہ سب جھیلا اس نے بھی ہاتھ چھڑا لیا۔

میں تب بھی خوابوں کے حصار سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ حقیقتوں کو بھی خوابوں کے حوالے سے دیکھتی تھی اور جب ایسا ہو تو انسان میں خود بخود حوصلہ آ جاتا ہے۔ مجھ میں بھی حوصلہ تھا۔

میں نے تب بھی بالآخر خود کو سنبھال لیا تھا۔ جب تیمور کی ممی نے پگھلے ہوئے سیسے جیسے وہ الفاظ میری سماعتوں میں اتارے تھے۔

میں گرنے لگی تھی۔ اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا' جب نبیلہ نے دوڑ کر مجھے سنبھال لیا تھا۔

''بجو کیا ہوا؟ ہوش میں آؤ۔ اس منحوس عورت نے کچھ کہہ دیا؟ بجو بجو۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ ''پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ اوہ گاڈ۔ پاپا کیوں نہیں ہیں یہاں۔''

مجھے بستر پر لٹا کر اس نے جم خانہ فون کر کے پاپا کو بلوایا۔

ان کی گود میں سر رکھ کر میں بری طرح سے رو دی۔

''پاپا! میں باتھ روم میں تھی۔'' نبیلہ روتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی۔ ''فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ کافی دیر تک بجنے کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے سوچا جس کا فون ہے بعد میں کر لے گا۔ میں نکلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ فون بند نہیں ہوا تھا۔ بجو نے اُٹھا لیا تھا۔ شاید اسی منحوس عورت کا فون تھا۔ پتا نہیں اس نے کیا کہہ دیا اس سے۔''

میں انہیں سب کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ میں کیسے کہہ دیتی کہ تیمور کی زندگی کا فقط ایک ڈیڑھ سال باقی تھا' کیسے کہتی کہ اس کے بعد وہ نہیں رہے گا۔ بس چند یادیں رہ جائیں گی۔ تتلیاں اُڑ جائیں گی۔ ہتھیلیوں پر رنگ رہ جائیں گے۔ وہ جو آج سانس لیتا' جیتا جاگتا سب کے درمیان موجود ہے کل صرف اس کی باتیں ہوں گی۔ وہ

خوبصورت چہرہ مٹی تلے جا سوئے گا۔

بہت دیر بعد میں یہ کہہ پائی تو فقط یہ۔

''اس کی ممی کا فون تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تیمور کو کینسر ہے۔ وہ ٹرمینل کیس ہے۔ اس کی زندگی کے بس ایک ڈیڑھ سال باقی ہیں۔''

یہ الفاظ کتنے مشکل تھے لیکن میں چاہتی تھی کہ سب میرے ساتھ مل کر روئیں۔ وہ سب جو میرے اپنے ہیں۔ پاپا اور نبیلہ' یہ زمین' یہ آسمان اور اس کے درمیان موجود ہر چیز بین کرے اس چہرے کے لیے جسے مٹی اوڑھ کر سو جانا تھا۔ اس ہنسی کے لیے جسے فنا ہو جانا تھا۔

پاپا نے فون کر کے تصدیق کر لی تھی اور اس کے گھر لے جانے سے قبل مجھے کتنی تاکید کی تھی۔

''وہاں رونا نہیں ہے۔ اگر آپ روئیں تو میں فوراً واپس لے آؤں گا۔''

میں نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں نہیں روؤں گی۔ میں اس کی دلجوئی کرنے جا رہی تھی۔ اسے زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے جا رہی تھی پھر میں ہی اس کے سامنے رونے لگتی تو کیا فائدہ تھا۔ میں نے خود کو بہت مضبوط بنا لیا تھا۔

اس کی ممی ہماری منتظر تھیں اور گیٹ پر کھڑے ہو کر ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کپڑے ملگجے تھے۔ بال بے ترتیب تھے۔ نہ کلائی میں ڈیڑھ لاکھ کی گھڑی تھی اور نہ انگلیوں میں بہت سی انگوٹھیاں۔ میرے سامنے ایک ٹوٹی چھوٹی عورت کھڑی تھی۔ خود سے بیگانہ' اپنے غم میں گم۔ مجھے دیکھا تو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔

''نجیلہ! اسے بچا لو۔ تم جو کچھ مانگو گی میں تمہیں دوں گی۔ میرا سب کچھ لے لو' ساری جائیداد' دولت' زیور' سب کچھ۔ میں اپنے بیٹے کی چند سانسوں کے لیے سب کچھ لٹا سکتی ہوں' بانٹ سکتی ہوں۔''

میں چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر آہستگی سے خود کو چھڑا لیا۔

''کاش! سب کچھ دولت سے خریدا جا سکتا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

وہ ہمیں اندر لے آئیں۔

''تیمور تھوڑی دیر پہلے ہی سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں گیا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''میں جاگنے کا انتظار کر لوں گی۔''

پاپا اور نبیلہ ان سے اظہار افسوس کرتے رہے۔ وہ بتاتی رہیں کہ اس دوران انہوں نے کہاں کہاں علاج کرانے کی کوشش کی تھی۔ کس کس مزار پر جا کر منتیں مانی تھیں۔ بات کرنے کے درمیان بار بار وہ رو پڑتی تھیں۔

اور میں خاموشی سے سوچ رہی تھی۔ ''شاید کبھی انسان کو بہت پہلے کوئی اشارہ مل جاتا ہے۔ وجدان کی کیا حقیقت ہے؟ اس نے کہاں سے سنی تھی وہ آواز کس نے اس کے کان میں سرگوشی کر کے اسے بتایا تھا کہ محبت کرنے کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔ کس نے خبر دی تھی اسے کہ اچھا وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور برا وقت شاید ٹھہر ہی جائے گا۔

جو پیدا ہوا ہے اسے ہر حال میں موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن یوں اپنے کسی پیارے کو قدم قدم موت کے منہ میں جاتے دیکھنا۔ بیتے لمحوں سے پل پل خوفزدہ ہو جانا' کسی جیتے جاگتے وجود کو زندگی کے ہنگامے سے کٹ کر شہر خموشاں کی طرف رواں دواں دیکھنا' سماعتوں میں رس گھولتی ہنسی کا فنا کے دروازے کو دستک دینا۔ ستاروں کی طرح چمکتی آنکھوں میں ویرانیوں کا ڈیرے ڈال لینا' محبت بھرے دل کی دھڑکنوں کا ڈوبنا ابھرنا اور زندگی سے بھرپور چہرے پر موت کو رقصاں دیکھنا۔ یا خدا کیا ایسے میں موت سے پہلے مرنے والے کا ماتم کرنے کو دل نہیں چاہتا؟ یہ کیا امتحان ہے؟ کیسی آزمائش ہے؟''

پاپا اور نبیلہ جانے کی اجازت لے رہے تھے پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

''چلیں بیٹا؟''

''میں آ جاؤں گی پاپا۔ آپ لوگ جائیں۔''

میں نہیں چاہتی تھی کہ پاپا زیادہ دیر یہاں رکیں وہ دل کے مریض تھے۔ مرض کی شدت تو نہیں تھی لیکن زیادہ دباؤ برداشت نہیں کر پاتے تھے اور پچھلے دنوں تو میری وجہ سے بھی وہ بہت زیادہ اپ سیٹ رہے تھے۔ تیمور سے انہیں انسیت ہو گئی تھی۔ اسے ایسی حالت میں دیکھ کر وہ بہت پریشان ہوتے۔

نبیلہ بھی یہ سمجھتی تھی۔ وہ میرے رکنے کے حق میں بھی نہیں تھی۔ دبے دبے انداز میں اس نے کہا بھی تھا۔

''نہ جانے تیمور کب جاگے۔ ابھی گھر چلو کل پھر آ جانا۔''

''تم لوگ جاؤ میں آ جاؤں گی۔''

تیمور کی ممی جو امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ میرے جواب سے ان کے چہرے پر کچھ رونق اُتر آئی۔

''آپ نبیلہ کی فکر مت کریں۔ یہاں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں خود اس کا خیال رکھوں گی۔ دیکھ بھال کروں گی۔ اسے گھر بھی خود چھوڑ جاؤں گی۔ پلیز اسے رہ جانے دیں۔''

اس منت بھرے لہجے کے بعد پاپا اور نبیلہ دونوں خاموش ہو گئے۔ اس ممتا بھری پکار کے بعد وہ کون سا دل تھا جو پگھل کر پانی نہ بن جاتا۔

دکھ دشمنوں کو بھی بعض اوقات قریب لے آتا ہے۔ سب کے جانے کے بعد جب ڈرائنگ روم میں ہم دونوں رہ گئے تو ہم بھی ایک دوسرے سے قریب آ گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر دیر تک روتے رہے۔ آنسو بہاتے رہے۔ اس وقت کا ماتم کرتے رہے جو ابھی دور تھا لیکن پل پل قریب آ رہا تھا۔

''اس نے منع کر دیا تھا۔ تمہیں کچھ بتانے سے' وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم اس دکھ سے گزرو۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ تم اسے اس کے مرنے سے پہلے ہی مردہ سمجھنے لگو۔ اس کا خیال تھا کہ یہ دکھ تم جھیل جاؤ گی۔ اسے دل سے نکال کر' اپنی دنیا سے نکال کر ایک نئی دنیا آباد کر سکو گی۔ وہ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا ہمیشہ۔

پھر اس روز تم آئیں تو تم نے سارے زخم ادھیڑ دیئے وہ بہت مضبوط ہے۔ اوپر سے اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا مگر میں اس کی ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کیسے ٹوٹا ہے۔ کیسے لہولہان ہو گیا ہے اندر سے۔ صرف ایک تمہاری خوشی کی خاطر۔ کہ کہیں کوئی الزام تمہارے سر نہ آئے۔ کوئی احساسِ گناہ تمہارے اندر جنم نہ لے کہ وہ جس سے تم محبت کرتی تھیں۔ اسے مرنے کے لیے چھوڑ کر الگ ہو گئیں۔ وہ جانتا ہے کہ سوسائٹی کا پریشر ہوتا ہے اور شاید اتنا دباؤ تم برداشت نہ کر سکو۔ یوں بھی موت سے اتنا قریب کوئی شخص تمہیں کتنی خوشی دے سکتا ہے۔

مگر میں پھر بھی تمہیں بتانا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بیٹے کے لیے کسی کے دل میں کوئی میل ہو۔ کوئی ہاتھ اسے دعا دینے کے بجائے بددعا دینے کے لیے اٹھیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ میرا بیٹا جھوٹا اور فریبی نہیں ہے۔ زندگی کا لطف اُٹھانے والوں کے لیے محبتوں کے رشتے عزیز ہوتے ہیں۔ موت کے بستر پر پڑے شخص کے لیے عزیز ترین ہو

جاتے ہیں۔ وہ مجھ سے کہتا ہے کہ وہ بہت خوش ہے لیکن کیا ماں سے بھی اولاد کچھ چھپا سکتی ہے۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''بہت برا کیا اس نے' بہت برا۔ مجھ پر اتنا اعتبار' اتنا اعتماد بھی نہیں تھا اسے۔ اتنا کچھ برداشت کیا اس نے۔ اتنا کچھ جھیلا' بالکل تنہا۔ کچھ کہا تو ہوتا مجھ سے۔ کچھ بتایا ہوتا۔ مجھے آواز دی ہوتی۔ میری محبت کیا اتنی کمزور تھی۔ کیوں نہیں بتایا اس نے مجھے؟'' میرا دل چاہ رہا تھا کہ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لوں۔

ہم دونوں کا دکھ سانجھا تھا اور ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے غمگسار تھے۔ روتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ اور پھر رو پڑتے تھے۔ ایسے میں ہی ملازمہ نے اطلاع دی۔

''تیمور صاحب جاگ گئے ہیں۔ بیگم صاحب کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔''

ہم دونوں ہی تیزی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''سنو نبیلہ! اس کے سامنے رونا مت' وہ اَپ سیٹ ہوگا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ کتنا مشکل ہے پھر بھی مت رونا۔ اس کے لیے یہی کم نہیں ہوگا کہ تم آئی ہو۔ اس نے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا مجھے کہ تمہیں کچھ نہ بتایا جائے۔ اسے دکھ تھا کہ پھر شاید تمہیں کبھی نہ دیکھ سکے لیکن وہ مطمئن تھا۔ وہ مجھ سے ناراض ہوگا۔ شاید مجھ پر چیخے چلائے بھی لیکن میں سب سنبھال لوں گی۔ تم پلیز اس کے آگے مت رونا۔'' انہوں نے تیزی سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ بہت مشکل تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اسے دیکھ کر میرا ردِعمل کیا ہوگا لیکن میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے حوصلہ دینے کے بجائے بے حوصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کے مختلف حصوں سے ہوتی ہوئی اس کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچیں۔

''تم ادھر ٹھہرو۔ میں بلاؤں تو آنا۔'' جذباتی امتحان کے باعث ان کے ہاتھ کا دباؤ میرے ہاتھ پر بڑھ گیا۔

ان کے اندر جانے کے بعد میں نے گیلری کی دیوار سے پُشت ٹکا لی اور آنکھیں موند کر چند گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے دل کی دھڑکن کو معمول پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے پاس جانے' اسے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کی جتنی شدید خواہش تھی۔

اسی قدر میں ان لمحات سے خوفزدہ تھی۔ جب ہم دونوں کا سامنا ہوتا تھا۔ میں جو اپنے دل کی ہر بات اس سے کہہ دیا کرتی تھی۔ آج اس سے کچھ کہنے کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں تھے۔ جو میرے دل پر گزر رہی تھی۔ جو درد میرے اندر تھا۔ وہ سب مجھے اس سے چھپا کر ملنا تھا۔ وہ الفاظ جو آخری ملاقات پر میں نے ادا کیے تھے۔ اب میرے دل میں چبھ رہے تھے۔ اس کے دل میں بھی تیر بن کر پیوست ہوئے ہوں گے۔ وہ سب کہہ دینے کے بعد اس کا سامنا کرنا کتنا مشکل تھا۔

وہ کیا سوچتا ہوگا کہ میرا حوصلہ بس اسی قدر تھا؟ کچھ جانے بوجھے بغیر ہی میں نے اس پر الزام بھی دھر دیا اور سزا بھی سنا دی۔ کیا اس کی محبت کا اتنا بھی حق نہیں تھا کہ الزام دھرنے کے بجائے میں یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ کہیں وہ کسی مشکل میں تو نہیں تھا۔

لیکن نہ جانے ہمیں کیا ہو جاتا ہے۔ ہمارے وہم اتنے پختہ ہو جاتے ہیں کہ کبھی حقیقت لگنے لگتے ہیں اور ہم ان کو سچ مان لیتے ہیں۔ میں تیمور کی ممی سے بدگمان تھی اور اپنی بدگمانی میں میں نے انہی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ ان سے شدت کے ساتھ نفرت کرنے لگی۔

کاش میں نے پہلے ہی اسے کچھ الاؤنس دے دیا ہوتا۔ یہ سوچا ہوتا کہ ماں کے دباؤ کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ جس نے اسے قدم بڑھانے سے روک دیا ہے۔''

میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہاں دیوار پر سامنے ہی ان کی فیملی فوٹوگراف لگی ہوئی تھی۔ اپنے ماں باپ کے درمیان ہنستا مسکراتا تیمور زندگی سے بھرپور روشن پیشانی اور چمکدار آنکھوں کے

ساتھ۔ کیا موت ایسی بے رحم تھی کہ تیمور جیسے شخص کو ہم سے چھین لے۔

☆======☆======☆

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میں ایک ٹک اس تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جب آہستہ سے دروازہ کھول کر اس کی ممی باہر آئیں۔

''جمیلہ!'' انہوں نے مجھے پکارا۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اسے تمہارے بارے میں نہیں بتا سکی۔ میرے ہمت ہی نہیں پڑی۔ میں نے غلط کہا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوگا۔ چیخے چلائے گا تو میں سنبھال لوں گی۔ تب میرا یہی خیال تھا

لیکن اب چھوٹی سی بات بھی کتنی مشکل لگ رہی ہے۔ میں نے اسے کچھ اشارے دیئے ہیں۔ کھل کر نہیں بتا سکی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کن الفاظ میں تمہاری آمد کی خبر دوں۔''

وہ ساتھ تھیں تو مجھے حوصلہ تھا۔ اب سارا بوجھ میرے کندھوں پر آ گیا تھا۔ چند لمحے میں خاموش کھڑی رہی۔ پھر دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوگئی۔

اس کا خوبصورت اور وسیع بیڈروم میرے سامنے تھا۔ ہر چیز ترتیب اور قرینے سے تھی۔ بہترین آرائش گھر والوں کے ذوق کی آئینہ دار تھی۔ سامنے شیشے کی دیوار سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور وہ راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ تھا اور ماتھے پر سوچ کی لکیریں۔

اسے میرے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ چند ثانیے میں وہیں کھڑی اسے تکتی رہی پھر دبیز قالین پر قدم قدم چلتے اس کے سامنے پہنچ گئی۔

وہ چونک گیا۔

''سجو تم؟'' جھولتی ہوئی راکنگ چیئر رک گئی۔

''یہ کیسی میزبانی ہے؟ بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟ لیکن ٹھیک تو ہے ہم میں کیا مہمانداری۔''

میں اس کے سامنے قالین پر شیشے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

وہ میری طرف دیکھے گیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''ممی نے وعدہ خلافی کی ہے۔ انہیں ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ بولا۔

''چچ چچ۔ افسوس ہوتا ہے مجھے جب کوئی انسان دیوتا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ اس کی یادیں رہ جائیں تو اس کے عقیدت منداس کا مجسمہ بنا کر پرستش کر سکیں۔ تمہارے پاس اپنی False Ego Satisfy کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے کیا؟ چاہو تو میں ابھی تمہارا مجسمہ بنا سکتی ہوں لیکن افسوس اس کی پوجا نہیں کر سکتی۔ محبت اور عقیدت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ ضبط کرنا کتنا مشکل تھا۔ دانتوں تلے اپنے ہونٹ دبا کر میں سسکیاں اپنے اندر دفن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

راکنگ چیئر سے اُٹھ کر وہ میرے برابر آ بیٹھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ

ہاتھ جس میں اب تک زندگی کی حرارت تھی اور جو دھیرے دھیرے موت کی تاریک سرد وادیوں میں اُترنے والا تھا۔

''کیا تم میری محبت کو نہیں سمجھ سکتی ہجو؟''

''افسوس کہ تم نے میری محبت کو نہیں سمجھا۔ کیا ہماری محبت اتنی کمزور تھی کہ یوں ٹوٹ کر بکھر جاتی؟ اتنا کمزور تعلق تھا یہ؟ تم نے مجھے بتایا تو ہوتا' کچھ کہہ کر تو دیکھا ہوتا۔ صرف ایک مرتبہ پکارا ہوتا۔

تم مجھ سے کہتے تھے کہ ہجو سب کچھ کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے۔ میں اپنے اور تمہارے تعلق کو کسی کمیونی کیشن گیپ کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کھل کر اپنی بات کو ایک دوسرے سے کہہ دیں۔

پھر بتاؤ کیا ہو گیا تیمور؟ کیوں نہیں کچھ بتایا تم نے مجھے؟ میری محبت میں کہاں کمی تھی کہ تم نے میرا یقین نہیں کیا مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ کبھی مجھے تنہا نہیں چھوڑو گے۔ ہر دکھ اور اور تکلیف میں میرا ساتھ دو گے۔ پھر وعدہ خلافی کیوں کی؟ مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ اور خود بھی تنہا سب کچھ سہتے رہے۔'' میرا ضبط جواب دے گیا۔ آنسو آنکھوں کے بند توڑ کر نکل آئے۔

وہ تھوڑی دیر خاموشی سے مجھے روتے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''میں اسی غم سے تمہیں بچانا چاہتا تھا۔''

''تم مجھے کسی غم سے نہیں بچانا چاہتے تھے۔ تم صرف ایک مہان دیوتا کا روپ دھار کر رکھنا چاہتے تھے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

میرے آنسو تھم نہیں رہے تھے اور وہ مجھے یوں دیکھ کر افسردہ ہو رہا تھا۔

''آئی ایم سوری۔ پلیز ہجو روؤ نہیں۔ تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔''

میں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کیے بہت مشکل سے خود کو سنبھالا۔

''اب رونا نہیں۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھو وقت کتنی تیزی سے بیت رہا ہے۔ اسے اس طرح برباد مت کرو۔ آؤ باہر لان میں چلیں۔ موسم کتنا اچھا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

ہم دونوں بیڈ روم سے باہر نکل آئے۔ لاؤنج میں اس کی ممی مضطرب کھڑی تھیں۔ ہمیں

آتے دیکھ کر انہوں نے ہمارے چہروں پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔

''ممی آئیں باہر لان میں چلتے ہیں۔ بہت اچھی ہوا چل رہی ہے۔'' اس نے شگفتگی سے کہا۔

''تھینک یو بیٹا لیکن مجھے کچھ کام ہے۔ تم لوگ چلو میرا کام ختم ہو جائے گا تو جوائن کر لوں گی۔'' انہوں نے کہا۔

باہر واقعی بہت اچھا موسم تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ لان چیئرز پر بیٹھنے کے بجائے ہم سبز چمکدار گھاس پر بیٹھ گئے۔

''تم نے دیکھا ممی کو انہوں نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے؟ پاپا بھی پہلے جیسے نہیں رہے اور آج تمہیں دیکھا تو تم بھی خود سے بیگانہ نظر آئیں۔ میں نہیں چاہتا کہ زندگی اس طرح ضائع ہو جائے۔ اب جب آؤ تو ڈھنگ سے آنا۔''

''ڈھنگ سے ہی تو آئی ہوں۔ اور کس طرح آنا چاہیے؟'' میں زبردستی مسکرائی۔

''آنے سے پہلے آئینہ نہیں دیکھا؟ بلکہ مجھے تو لگتا ہے' نہ جانے کب سے نہیں دیکھا۔ تمہاری آنکھوں کے نیچے پہلے یوں حلقے نہیں تھے۔ چہرے پر تازگی ہوتی تھی۔ اب دیکھو بالوں کو بھی کٹنگ کی ضرورت ہے۔ میک اپ بھی نہیں کیا ہوا۔ کپڑے بھی یوں لگتے ہیں جیسے مروتاً اپنے اوپر لٹکائے ہوں۔ تم ایسی تو نہیں تھیں ہجو۔ اور اب اس طرح میرے سامنے آنا بھی مت۔

اور ممی ہیں۔ انہیں دیکھو۔ کتنی خوش لباس تھیں' کتنی نفاست تھی ان میں۔ اب جیسے بالکل ختم ہو گئی ہوں۔ ساری ساری رات میرے سرہانے بیٹھ کر آنکھوں میں گزار دیتی ہیں۔ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے کا کچھ ہوش نہیں رہا انہیں۔ تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہر انسان کو بالآخر مرنا ہے۔ کسی کو اول' کسی کو آخر لیکن یہ ذائقہ ہر جاندار کو چکھنا ہے۔ پھر اتنا ملال کس بات کا' یہ بھی تو ممکن ہے کہ کینسر کے بجائے میں اس عمر میں ایکسیڈنٹ سے مر جاتا۔''

''پلیز تیمور بس کرو۔'' مجھ میں سننے کی تاب نہیں تھی۔

''جتنا رونا ہے آج رو لو۔ پھر یہاں آنا ہو تو میرے سامنے مت رونا۔''

میں نے دھندلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا پھر ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کر دیئے۔

"پلیز سجو۔ میری خاطر کچھ کر سکتی ہو تو ممی کا حلیہ درست کروا دو۔ میرے اعصاب جواب دے جاتے ہیں کبھی تو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن تم ان کا حلیہ کیا درست کراؤ گی۔ تمہیں تو اپنا ہوش نہیں ہے۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے ہمارے سدھرنے کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔

پھر وہ نبیلہ اور پاپا کے متعلق پوچھنے لگا۔ اس نے بہت سی باتیں کیں لیکن اس کی کوشش تھی کہ گفتگو کا رخ اس کی ذات کی طرف نہ مڑے۔

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں تیمور؟" میں نے بالکل اچانک اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ان کے مطابق اب کوئی ہوپ (امید) نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے یوں کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

"میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کچھ بھی نہ ہو سکے۔ کچھ علاج تو ہوتا ہوگا۔" اب تک میں خود پر قابو پا چکی تھی۔

"علاج ہو تو جاتا ہے لیکن شروع کی کسی اسٹیج پر۔ کینسر کے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ شروع میں اس کا پتا چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً میرے ساتھ یوں ہوا کہ مجھے سر میں درد شروع ہوا۔ میں نے توجہ نہیں دی۔ سوچا کہ پڑھائی کی زیادتی اور نیند کی کمی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ جب درد زیادہ بڑھا تو ڈسپرین لے لی۔ ممی سے یونہی باتوں باتوں میں تذکرہ کیا تو وہ مُصر ہو گئیں کہ ڈاکٹر سے چیک اَپ کراؤ۔ میں ہنس پڑا کہ ذرا سے سر درد کے لیے اتنا نخرا مجھ سے نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ میری صحت کے بارے میں انہیں خواہ مخواہ وہم ہو گیا تھا۔

پھر ایک دن ممی نے دوپہر کے کھانے کے لیے بلوایا۔ میں نے ملازمہ سے کہہ دیا کہ آتا ہوں۔ سوچ رہا تھا کہ سر درد بگڑ گیا ہے۔ اس لیے یہ چیپٹر ختم کر کے کھانا کھا کر سو جاؤں گا اور نیند پوری کروں گا۔ ممی نے بار بار ملازم بھیجے۔ وہ چیپٹر درمیان میں چھوڑ کر میں اُٹھا۔ اس وقت تک سر درد ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا تھا بس اتنا اندازہ ہوا کہ میرا انتظار کر کے ممی خود ہی آ گئی تھیں۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ انہوں نے مجھے ڈانٹا بھی تھا کہ بار بار بلانے پر بھی میں کیوں نہیں آ رہا تھا۔ جب تک انہیں میری

حالت کا احساس ہوا' میں بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔

اس کے بعد بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ ممی کو سب کی صحت کی بہت فکر رہتی ہے۔ انہوں نے مکمل میڈیکل چیک اپ کرایا اور اس میں برین ٹیومر کا پتا چلا۔ یہاں کے ڈاکٹرز سے بھی مشورہ لیا۔ فوراً ہی امریکہ جانے کا بھی انتظام ہو گیا لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا اب بس یہ ممکن ہے کہ تکلیف کم کی جا سکے۔ زیادہ درد نہ ہو۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔" وہ یوں بتا رہا تھا جیسے یہ روزمرہ کا کوئی عام سا موضوع ہو۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"ریڈیو تھراپی یا کیمو تھراپی سے بھی فرق نہیں پڑ سکتا؟" کافی دیر بعد میں نے پوچھا۔

"نہیں' یہ سب دل کو بہلانے والی باتیں ہیں۔ کیمو تھراپی بہت تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ بلاوجہ ایسی کیا تکلیف اٹھانی جس کا نتیجہ صفر رہے۔"

"آپریشن؟"

"نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے تیمور۔ اتنا کچھ حاصل کر لیا ہے انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ کچھ تو علاج ہوگا۔"

"کوئی مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں پہنچ کر پر جل جاتے ہیں۔ اس سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکتا اور معجزوں کا دور گزر چکا ہے۔"

دور سے اس کی ممی آتی دکھائی دیں۔

"مجھے ممی کو اس طرح دیکھ کر بہت الجھن ہوتی ہے۔" اس نے دوبارہ کہا۔

میں سوچنے لگی کہ کچھ باتیں اس نے کتنی شدت سے محسوس کی تھیں اور بار بار ان کا اظہار کیا تھا۔

اسے شاید اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ زندگی کو ضائع مت کرو۔ اور ساتھ یہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے اپنی زندگی کے مختصر رہ جانے کا ملال نہیں تھا۔ کتنی مرتبہ اس نے کہا تھا کہ وہ ممی کو اس طرح پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ اس پریشانی کا ذمے دار خود کو ٹھہرا رہا تھا۔ اچانک سب کی زندگی بالکل ہی بدل گئی تھی۔ صرف اس کی وجہ سے اور وہ اس بوجھ کو اپنے ذہن سے ہٹانا چاہتا تھا۔

''ممی کی فکر تم چھوڑ دو۔ میں ہوں ناں' تم دیکھنا وہ بالکل پہلے جیسی ہو جائیں گی۔'' میں نے کہا۔

ہمارے قریب پہنچ کر انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

''سجیلہ! تمہارے پاپا تمہیں لینے آئے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''باہر ہی کار میں بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا بھی آنے کے لیے لیکن وہ آئے نہیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''میں نے ان سے کہا تو تھا کہ میں خود ہی آ جاؤں گی۔ بس تیمور میں ایک منٹ میں آتی ہوں ان سے کہہ کر کہ میں خود آ جاؤں گی۔'' میں اُٹھتے ہوئے بولی۔ اس سے دور جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

''نہیں سجو! کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تم جاؤ۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''انکل کو پریشان مت کرو۔ بلکہ چلو میں بھی ان سے مل لیتا ہوں۔''

اس لمحے مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے لیکن پھر بھی ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جو ہمیں باندھ دیتا۔ جس کے ناتے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ اپنی مرضی سے وقت گزارنے کا موقع مل سکتا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس بات کا میرے پاس کوئی اختیار نہیں تھا۔

خاموشی سے اس کے قدموں سے قدم ملاتے میں گیٹ تک پہنچ گئی۔ پاپا کے ساتھ نبیلہ بھی تھی۔ ہمیں آتے دیکھ کر وہ دونوں کار سے نکل آئے۔ نبیلہ ہمیشہ والی دوستی اور گرم جوشی کے ساتھ اس سے ملی۔ پاپا بھی پہلے کی طرح محبت اور شفقت سے ملے۔

گھر میں بھی میرا ذہن اسی کی طرف اُلجھا ہوا تھا۔ رات کے کھانے پر پاپا نے اس کی صحت کے بارے میں جاننا چاہا۔ جو کچھ اس نے مجھے بتایا تھا' وہ سب میں نے پاپا کو بتا دیا۔ پاپا اور نبیلہ اس بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کرنے لگے۔ پہلے کبھی جو ایسے واقعات سے ان کا سابقہ پڑا تھا یا کسی نے کینسر کی اس قسم کے متعلق بتایا تھا۔ میں خاموشی سے سنتی رہی۔ کھانا بھی مجھ سے کہاں کھایا جا رہا تھا۔ بس پاپا اور نبیلہ کی تسلی کے لیے ان کے ساتھ بیٹھ گئی

تھی۔

رات کو بستر پر لیٹ کر میں ایک مرتبہ پھر اسی کے بارے میں سوچنے لگی۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کتنی ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ ایک دن انہیں مرنا ہے یہ بھی نعمت ہے کہ ہمیں علم نہیں کس کو کب مرنا ہے۔ کچھ پیدائش کے ساتھ مر جاتے ہیں کچھ اتنے بوڑھے ہو کر مرتے ہیں کہ ان کے لیے اور زندہ رہنے کی چاہ ہی نہیں رہتی اور کچھ عین جوانی میں ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتے ہیں۔

شاید سب دکھ برداشت کرنا آسان ہوں کہ ایک لمحہ آیا اور سب کچھ چھین کر چلا گیا۔ لیکن وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ کل انہیں مر جانا ہے اور وقت پل پل بیتتا جاتا ہے وہ کس اذیت سے گزرتے ہوں گے اور وہ جو انہیں پیار کرتے ہیں' یہ لمحے ان پر کتنے بھاری ہوتے ہیں۔ بے بسی کیسے جکڑ لیتی ہے۔ چاہتے ہوئے بھی کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اپنی جان دے کر بھی بچایا نہیں جا سکتا۔

اور تیمور کتنا کمزور ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ میں سوچتی تھی کہ وہ ماڈلنگ کی طرف چلا جائے تو تہلکہ مچا سکتا تھا۔ بیماری اپنے قدموں تلے ہر حسن اور ذہانت کو روند سکتی ہے۔

''لیکن اب تیمور کی خاطر میں خود کو بدلوں گی۔'' میں نے تہیہ کیا۔ ''وہ ہماری شکستگی کا ذمے دار خود کو ٹھہراتا ہے۔ تنہائی میں نہ جانے کیا سوچتا ہو گا۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی ذہنی اذیت میں اضافہ کروں۔ اس کی زندگی میں اگر یہی چند دن باقی ہیں تو کم از کم یہ تو سکون سے گزریں۔ رو کر اور خود کو پریشان ظاہر کر کے میں اس کا بھلا نہیں کروں گی۔ اُلٹا وہ تکلیف میں مبتلا ہو گا۔

میں خود کو اس بات پر کبھی معاف نہیں کر پاؤں گی کہ وہ یہاں تکلیف سے تڑپتا رہا اور میں کراچی میں انجوائے کرتی رہی۔ اس وقت تنہائیوں میں اس نے مجھے یاد کیا ہو گا۔ میں کتنی بے خبر تھی کہ اسے بھلائے بیٹھی تھی۔ میں سمندر کے پانی میں کھیلتی رہی۔ قہقہے لگاتی رہی' گھومتی پھرتی شاپنگ کرتی رہی اور وہ تکلیف اُٹھاتا رہا۔''

میری آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے۔

صبح میں کپڑے استری کر رہی تھی کہ نبیلہ میرے پاس آ گئی۔

"اتنی صبح صبح کہاں کی تیاری ہے؟"

"سب سے پہلے پارلر جاؤں گی اور بال کٹواؤں گی دیکھو کیا حشر ہو گیا ہے ان کا۔"

"ویری گڈ۔ شکر ہے تمہیں بے زبانوں کا بھی خیال آیا۔" وہ خوش ہو گئی۔

"پھر اس کے بعد تیمور کی طرف جاؤں گی۔" میں نے اپنے پروگرام کا بقیہ حصہ بھی بتایا۔

نبیلہ کچھ چپ سی ہو گئی پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔ "کوشش کرنا کہ جلدی آ جانا۔ اب گھر میں تمہاری عادت ہو گئی ہے۔ تمہارے بغیر مجھ سے کام بھی نہیں ہوگا۔"

مجھے اس کا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے کپڑے استری کرتی رہی۔

تیمور نے مجھے دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ "آج تم پہلے والی جو لگ رہی ہو۔ اسی طرح رہا کرو۔"

میں زبردستی ہنس پڑی۔ "تھینک یو۔ ویسے آنٹی کہاں ہیں نظر نہیں آ رہیں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"انہیں تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے سونے کے لیے بھجوایا ہے۔"

"تم نے ناشتا کر لیا۔"

"بالکل کر چکا ہوں۔ ممی کروا کے گئی ہیں۔ ان کے سامنے انکار کی جرأت کہاں ہے۔"

"آج کل دن کیسے گزارتے ہو؟"

"بالکل بیکار رہ کر۔ اور سخت بور ہوتا ہوں۔ اس گھر میں میری کوئی نہیں سنتا۔ ڈرائیونگ ڈاکٹروں نے منع کر دی ہے۔ پڑھائی ممی نے۔ یہی دونوں شوق تھے میرے۔ لمبی چوڑی دوستیاں میری نہیں ہیں کہ دوستوں کے ساتھ وقت گزار دوں۔ بس ٹی وی ہے۔ کبھی دیکھ لیتا ہوں ورنہ ممی کے ساتھ باتیں کرتا رہتا ہوں یا پھر سوئمنگ پول چلا جاتا ہوں۔ ممی اس پر بھی خوش نہیں ہوتیں لیکن لڑ جھگڑ کر کم از کم اس بات کی اجازت لے لیتا ہوں میں۔ اس میں بھی مزا اس لیے نہیں رہتا کہ دو لائف گارڈز میرے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ ممی بھی وہیں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اتنی الجھن ہوتی ہے مجھے کہ تھوڑی ہی دیر میں اس کام سے بھی اکتا کر پانی سے نکل آتا ہوں۔

پاپا کو دل کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ جب انہیں میری بیماری کا علم ہوا تو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ تم اندازہ کر سکتی ہو ناں کہ ممی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ پاپا سے میری ملاقات کم ہی ہوتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ان کا ردعمل ممی سے بالکل مختلف ہے۔ ممی سارا وقت میرے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں اور گزارتی ہیں جبکہ پاپا میرے قریب نہیں آتے۔ وہ مجھے اس حال میں نہیں دیکھ سکتے۔ وہ تب آتے ہیں جب میں سو رہا ہوتا ہوں کبھی سونے کے علاوہ میرے پاس آئیں تو ان کے پاس کرنے کو کوئی بات نہیں ہوتی اور میں ان کے پاس جاؤں تب بھی خاموش رہتے ہیں۔ بس یوں زندگی گزر رہی ہے۔ ایک دم ڈل بورنگ' کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"واقعی یہ زندگی تو بہت ڈل ہوگی۔ اب تمہاری ڈرائیور میں بن جاؤں گی اور کتابیں بھی پڑھ کر سنا دیا کروں گی۔ کیسا آئیڈیا ہے۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن تم یونہی میری خاطر مجھے وہ موٹی موٹی اور خشک کتابیں پڑھ کر سناتی رہیں تو میرے مرنے تک تمہارا کچومر ہی نکل جائے گا۔" وہ ہنسا۔

غصے کی ایک تیز لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ "کیا یہی ایک موضوع رہ گیا ہے مذاق کے لیے؟ پہلے ہی بہت رُلایا ہے تم نے مجھے' ابھی تو میں نے وہ حساب بھی تم سے طلب نہیں کیا۔"

"اچھا اچھا خدا کے لیے جھگڑو مت۔ یہ اخبار سنا دو مجھے۔" اس نے مزید بات پھیلنے سے پہلے ہی جلدی سے اخبار میری طرف بڑھایا۔

بہت مشکل سے خود پر قابو پا کر میں نے اخبار کھولا اور اسے خبریں اور آرٹیکل سنانے لگی۔ پھر اخبار پھینک کر کار کی چابی اُٹھالی۔

"اُٹھو یوں چپ چاپ مت بیٹھے رہو۔ اس وقت مجھے اپنا آپ بہت احمق لگ رہا ہے۔ میں با آواز بلند پڑھ رہی ہوں۔ اور تم خاموشی سے مجھے تکے جا رہے ہو۔ چلو اُٹھو ہم باہر گھومیں پھریں گے۔"

وہ بھی فوراً تیار ہو گیا۔ کتنے دن بعد ہم یوں اکٹھے ڈرائیو پر نکلے تھے۔ مجھے تو لگتا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں ہمیں اس طرح اکٹھا ہوئے۔

باہر اب بھی موسم اچھا تھا۔ ہر چیز نکھری نکھری دُھلی دُھلی لگ رہی تھی۔ زندگی اپنے

پورے عروج پر تھی۔ سڑک پر گاڑیاں دوڑتی بھاگتی پھر رہی تھیں اپنی دھن میں مگن لوگ آ جا رہے تھے۔ شاپنگ سینٹرز پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ بینک کے باہر بل جمع کروانے والوں کی قطار تھی' ڈاکخانے کے باہر بھی رونق تھی۔ دنیا ویسے ہی چل رہی تھی جیسے پہلے چلتی تھی اور جیسے ہمیشہ چلتی رہے گی۔

''سجو! کتنی گہما گہمی ہے۔'' تیمور نے کہا۔

گویا جو کچھ میں نے محسوس کیا تھا وہی اس نے بھی محسوس کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا' نہ اس کے لہجے میں حسرت تھی' نہ چہرے پر۔

ہم بہت دیر تک گھومتے رہے۔ وہ زندہ دلی سے باتیں کرتا رہا۔ میں بھی خوش تھی کیونکہ وہ خوش تھا۔

''چلو لنچ کرنے مناج میں چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

میں نے کار اسی طرف موڑ لی۔ ہم کونے میں اسی میز پر جا بیٹھے جس پر بہت دن پہلے بیٹھے تھے۔ کتنی ہی باتیں تھیں کرنے کے لیے۔

''آفس چھوڑ دیا؟''

''ہاں ریزائن کر دیا۔ اب تو کافی دن ہو گئے ہیں۔''

''میری وجہ سے کیا تھا؟''

''ارے نہیں بس دل اکتا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ تیمور سے اس ملاقات کے بعد میرا زندہ رہنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ آفس جانا تو دور کی بات ہے۔

''فرو نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے میری وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی۔''

''وہ تو پاگل ہے نہ جانے کیا کیا کہتی ہے۔ تم نے بھی یقین کیا تو اس کی بات پر۔''

''پتا ہے اس کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔ اگلے مہینے کا غالباً دوسرا جمعہ ہے۔''

''اچھا؟ مجھے تو......'' میں کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میری ایک بات نے نیلوفر کو کتنا صدمہ پہنچایا تھا کہ وہ پھر مجھ سے ملنے بھی نہیں آئی۔

اس نے اپنا گلاس اُٹھا لیا۔

''تم تو کچھ کھا ہی نہیں رہے تیمور۔''

''میں تمہاری طرح ہر کھانے کو زندگی کا آخری کھانا سمجھ کر نہیں کھاتا۔ کہتے ہیں رزق

ایک حد تک لکھا ہوتا ہے اس لیے جلدی جلدی نہیں ختم کرنا چاہیے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کی ایسی باتیں مجھے اندر تک چبھتی تھیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر بے نیازی تھی اور شرارت کا ہلکا سا عکس تھا۔

''میں اس لیے زیادہ کھاتی ہوں تاکہ جنت کے لیے ایڈوانس بکنگ ہو جائے۔'' میں نے بھی اس کی شرارت کو صرف شرارت کی حد تک لیا۔

''پھر تو اپنے کھانے کی مقدار میں تھوڑا اور اضافہ کر دو تاکہ دونوں اکٹھے پرواز کر سکیں۔''

ہم دونوں اکٹھے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''وہاں ہماری بہت لڑائی ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''حوروں کے معاملے پر۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''میں نے اس دنیا اور اس دنیا کے لیے اللہ میاں سے صرف ایک حور کی فرمائش کی تھی۔ اس دنیا میں تو مل گئی اب آگے اس کے اعمال پر منحصر ہے۔ کہ میرے پاس جنت میں آئے یا جنت کی دیوار کے پار لینڈ کر لے گی۔''

''واہ یہ بھی خوب رہی۔ تم کیوں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ تمہاری پرواز ٹھیک جنت میں پہنچے گی؟ میں جیسے تمہیں جانتی نہیں ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہومیکس کے سامنے سے گزرتے ہوئے باچھیں چری جا رہی تھیں تمہاری۔''

''انسان کو خوش ذوق تو ہونا چاہیے۔'' وہ مزے سے بولا۔

یونہی باتیں کرتے ہم اس کے گھر پہنچے تو اس کی ممی گیٹ پر ہی کھڑی تھیں۔ ان سے ملتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ پریشان بھی تھیں اور غصے میں بھی۔ باہر تو وہ خاموش رہیں' لیکن جیسے ہی اندر ہم لیونگ روم میں پہنچے وہ پھٹ پڑیں۔

''کیوں باہر لے گئی تھیں تم تیمور کو؟ اتنی سی بھی سمجھ نہیں ہے تم میں' اسے کچھ ہو جاتا تو؟ اچانک طبیعت خراب ہو جاتی تو کیا ہوتا؟ کیا کر لیتیں تم؟''

میں پہلے تو ان کے اس طرح چلانے پر بوکھلائی پھر شرمندگی سے میرا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ پہلے کب کسی نے مجھے ایسے ڈانٹا تھا' کب اس لہجے

میں بات کی تھی۔ وہ مسلسل بول رہی تھیں۔

''میرے بیٹے کو کچھ ہو جاتا ناں تو میں تمہیں زندہ نہ چھوڑتی۔ تمہارا کیا ہے تمہیں تو بہت مل جائیں گے عشق کرنے کے لیے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میری زندگی اور میری خوشیاں صرف اسی سے وابستہ ہیں۔'' وہ روتی جا رہی تھیں۔

تیمور انہیں سنبھال رہا تھا اور میں مجرموں کی طرح شرمندگی کے مارے سر جھکائے کھڑی تھی۔

''گھر میں جگہ نہیں ہے کیا گھومنے کے لیے؟ اتنا بڑا لان ہے' پول ہے' کھانا گھر میں نہیں پکتا کیا کہ باہر سے کھانا ضروری تھا۔ خدانخواستہ میرے تیمور کو کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی' پڑھی لکھی لڑکی ہو تم' اتنی عقل تو استعمال کر لیتیں؟''

''ممی پلیز' بس کریں' وہ مجھے کہیں نہیں لے کر گئی تھی میں خود گیا تھا۔'' تیمور کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''تم مجھے جھٹلا رہے ہو' میرے بیٹے ہو کر مجھے جھٹلا رہے ہو؟ اس لڑکی کی خاطر میرے ساتھ ایسے لہجے میں بات کر رہے ہو۔'' وہ ہسٹیرک ہو گئیں۔

''ممی پلیز! ایسی کوئی بات نہیں ہے' آپ میرے ساتھ آئیں۔'' تیمور نے انہیں کہتے ہوئے مجھے وہاں سے کھسک جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس کی خواب گاہ میں چلی آئی۔ میرا زور زور سے رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ بہت مشکلوں سے میں نے خود پر قابو رکھا تھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو میں وہاں ایک پل رہنا بھی گوارا نہ کرتی۔ یہاں رکی ہوئی تھی تو صرف تیمور کی وجہ سے' وہ آتا اور اَپ سیٹ ہوتا تو اسے کون تسلی دیتا۔ اس کی ممی کی طرف سے میرا دل بہت برا ہوا تھا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ دوبارہ ان کی شکل بھی دیکھوں لیکن پھر خود ہی اپنے آپ کو سمجھانے لگی۔

''ان کی ذہنی حالت خراب ہے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھنا اور اس کے لیے کچھ نہ کر سکنا کتنا اذیت ناک امر ہے۔ وہ پل پل اس اذیت سے گزر رہی ہیں۔ ماں ہیں اور ماں کے لیے یہ سہنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ جس نے اتنی تکلیف اُٹھا کر جنم دیا' اپنا آرام حرام کر کے پالا پوسا' اپنی نیندوں کی قربانی دی۔ اپنی ساری خوشیاں اور امیدیں اسی سے وابستہ کیں۔ اس ماں پر کیا گزرے گی' جب وہ دھیرے دھیرے موت کو

اپنے بیٹے کی طرف بڑھتے دیکھے گی اور کچھ نہیں کر سکے گی۔''

یہ سب اپنی جگہ تھا' لیکن میرے اعصاب بری طرح کشیدہ تھے۔ میرے اندر بے چینی' گھبراہٹ اور اضطراب میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

کافی دیر بعد دروازہ کھول کر تیمور اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی تھی۔

''آئی ایم سوری سجو! ممی کو غلط مت سمجھنا' وہ بہت اَپ سیٹ ہیں' ان کی طرف سے میں سوری کرتا ہوں تم سے۔''

''نہیں تیمور! کچھ نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کس ذہنی اذیت سے گزر رہی ہیں۔''

''تمہارے گھر سے کئی مرتبہ فون آ چکا ہے۔ نبیلہ نے بار بار تمہارا پوچھا تھا اور میسج دیا تھا کہ جلدی گھر آ جانا۔''

''خیر تو ہے کیا ہوا گھر میں؟'' میں پریشان ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اس نے کہا تو تھا کہ خیریت ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں گھر جانا چاہیے۔''

میں گھر پہنچی تو پاپا اور نبیلہ لان میں بیٹھے ہوئے تھے کار سے نکل کر میں تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

''خیر تو ہے بیلا؟ کیا ہوا کیوں بلایا تھا مجھے؟''

نبیلہ کے ماتھے پر شکن اُبھر آئی۔

''صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے' کہا بھی تھا تم سے کہ جلدی گھر آ جانا' پھر بھی اتنی دیر کر دی۔''

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھی کی تھی کہ پتا نہیں کیا ہو گیا۔'' میں وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔

''دراصل تیمور کی زندگی بہت ڈل ہو گئی ہے۔ کچھ ایکٹیوٹیز پر ڈاکٹر نے پابندی لگا دی اور کچھ اس کی ممی کے وہم کا شکار ہو گئیں۔ وہ اس صورتِ حال سے بہت اَپ سیٹ ہے' لیکن ظاہر نہیں کرتا۔ ہم آج ڈرائیو پر نکل گئے تھے۔ میں اس کا ذہن ان سوچوں سے ہٹانا چاہتی تھی' جو فارغ رہنے اور ایک جیسے ماحول میں گھرے رہنے کی وجہ سے اس کے ذہن کو جکڑے ہوئے تھیں۔ آج وہ بہت فریش تھا۔ پتا نہیں اس کی ممی نے کتنے دن سے اسے گھر میں بند کیا ہوا تھا باہر نکل کر بہت خوش ہوا۔''

''اس کی ممی نے بند کیا ہوا تھا اسے لیکن کیا یہ تمہارا ہی فرض ہے کہ اس کی دیکھ بھال کرو۔'' نبیلہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا وہ خوش نہیں تھی۔ پاپا یوں اپنا پائپ صاف کرنے میں مصروف تھے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ ان دونوں نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا تھا۔

لیکن یہ جاننے کے لیے میں نے زیادہ سوچنے کی زحمت نہیں کی۔ نبیلہ کی بات اور لہجے نے مجھے حیرت میں تو مبتلا کیا ہی تھا۔ غصہ بھی کم نہیں آیا تھا۔ اس کا اظہار کرنے کے لیے میں فوراً ہی اُٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلی آئی۔ بعد میں بھی جب اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو میں اُکھڑی اُکھڑی ہی رہی۔

صبح میں تیمور کی طرف جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ نبیلہ میرے پاس آ گئی اسے نظر انداز کر کے میں آئی لائنر لگانے میں مصروف رہی۔

''ناراض ہو جو؟'' بالآخر اس نے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا' لیکن میرا انداز اور لہجہ میری بات کی نفی کر رہا تھا۔

''ناراض ہونا بھی مت' میں جو کچھ کہتی ہوں تمہارے بھلے کے لیے کہتی ہوں۔''

مجھے غصہ آ گیا۔

''تھینک یو' لیکن میرے لیے اتنی زحمت مت کرو۔ اپنا بھلا برا سوچنے کے لیے میں کافی ہوں۔''

میں مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''یہی تمہاری پرابلم ہے کہ تم خود کو عقلِ کُل سمجھنے لگی ہو حالانکہ نہ تم سوچ سکتی ہو نہ سمجھ سکتی ہو۔''

''بیلا پلیز! اس سے قبل کہ میں کوئی سخت بات کہہ دوں تم چلی جاؤ۔ میں اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''میں اس طرح نہیں جا سکتی۔ میں تمہاری بہن ہوں' کوئی راہ چلتا شخص نہیں جو تمہیں کنوئیں میں چھلانگ لگاتے دیکھ کر محض افسوس سے سر ہلا کر چلا جائے۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ تمہیں سننا بھی ہو گا اور اس پر عمل بھی کرنا ہو گا۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔'' میں نے اپنا ہیئر برش بیگ میں ڈالا اور بیگ کندھے سے لٹکا کر کار کی چابی اُٹھالی۔

''میں تیمور سے کہہ آئی تھی کہ اس وقت تک آ جاؤں گی' وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔''

''تم واپس آؤ گی تو تم سے خود پاپا بات کریں گے۔'' میرے پیچھے اس نے کہا۔

میں مڑی۔ ''کوئی دھمکی دے رہی ہو مجھے؟''

''نہیں' میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی' صرف تمہیں حالات سے باخبر کر رہی ہوں۔''

میں باہر نکل آئی۔ اس کے گھر تک جاتے جاتے میں نبیلہ کے انداز اور باتوں پر ہی غور کرتی رہی۔ وہاں پہنچی تو تیمور کی ممی بدستور مجھ سے خفا تھیں۔ میرا خیال تھا کہ رات بھر میں ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ میری غلطی اتنی بڑی بھی نہیں تھی کہ پہلے وہ اس قدر ناراضگی کا اظہار کرتیں اور بعد میں بجائے اپنے رویے پر افسوس کرنے کے وہ مجھ سے اتنا خفا بھی ہوتیں۔

بہرحال وہ مجھ سے بڑی تھیں اور ان کی ذہنی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی' اس لیے میں ہی ان سے گفتگو کرتی رہی۔ جب اس پر بھی ان کا انداز برقرار رہا تو میں نے ان سے معافی مانگ لی۔ بڑی مشکل سے ان کا مزاج ٹھیک ہوا' وہ بھی مجھے ایک بہت لمبا لیکچر دینے کے بعد کہ میری غفلت سے کیا کیا نقصان ہو سکتا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ سنتی رہی۔

تیمور سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی ممی کا حلیہ درست کراؤں گی۔ اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کہ یہ کام کس قدر مشکل ثابت ہو گا۔ بات بات پر وہ مجھے اتنا سخت ڈانٹ دیتی تھیں کہ میرا رونے کو دل چاہنے لگتا تھا۔ صرف تیمور اور اس کی خوشی کی خاطر میں سب کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کر جاتی تھی۔

انہیں کپڑے تبدیل کرنے کا کہتی تو وہ مجھ سے اُلجھ پڑتیں۔

''اتنا وقت کپڑے تبدیل کرنے میں صرف کر دوں' اور اگر ایسے میں میرے تیمور کو کچھ ہو جائے تو؟''

بڑی مشکل سے پیار' محبت اور رسان سے کپڑے تبدیل کرواتی پھر خود ہی ان کے بال سیٹ کرنے لگتی تو چڑ جاتیں۔

''تم نے تو مجھے باندھ کر رکھ دیا ہے یہاں۔ میرے بیٹے کو میری ضرورت پڑی تو کیا ہو گا۔ سوچے گا ماں کو میرے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔''

کبھی لپ اسٹک لگانے کو کہہ دیتی تو ان کا پارہ چڑھ جاتا۔

"تم تو اس لیے بن سنور کر آتی ہو کہ تمہارا کیا جا رہا ہے آج تیمور ہے کل کوئی اور مل جائے گا لیکن میرا تو وہ بیٹا ہے' مرنے کے قریب ہے' تم ماں نہیں ہو ناں' تمہیں کیا خبر کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے' کوئی ہے جو مجھ سے سب کچھ لے لے' بس میرا بیٹا مجھے دے دے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتیں۔

وہ ایسی باتیں کرتی تھیں تو مجھے لگتا تھا جیسے کوئی میرا دل چیر رہا ہو۔ میں سوچتی تھی کہ ہر رشتہ' ہر تعلق اپنی جگہ اہم ہوتا ہے۔ وہ کیوں نہیں سوچتی تھیں کہ وہ اس لیے آنسو بہا رہی تھیں کیونکہ ماں تھیں' میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا' پھر بھی میں اس کے لیے تڑپتی تھی ساری رات خاموشی سے آنسو بہاتی رہتی تھی تو کیا یہ بے وجہ تھا؟ جس دل سے میں تیار ہوتی تھی' میں ہی جانتی تھی۔ کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے دل مسلا جا رہا تھا' لیکن میرے لیے اپنے دکھ سے زیادہ اہم اس کی خوشی تھی۔ کاش اس کی ممی یہ سمجھ پاتیں۔

تب میں نے تیمور کے پاپا سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان سے میں کبھی نہیں ملی تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو ڈھیر سارے کام میں اُلجھا لیا تھا۔ وہ بہت دیر سے گھر آتے تھے۔ شاید وہ بھی فرار چاہتے تھے۔ خود کو کام میں اُلجھا کر ان سوچوں سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے' جنہوں نے ہم سب کو جکڑ رکھا تھا۔

"انکل پلیز! میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں' زیادہ وقت نہیں لوں گی آپ کا۔" میں نے ان سے فون پر کہا۔

"میں دیر سے گھر آتا ہوں۔" واضح طور پر انہیں ملنے میں تامل تھا۔

"میں آفس آ جاؤں گی پلیز' میرا آپ سے ملنا بہت ضروری ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔

انہوں نے مجھے لنچ ٹائم میں آنے کے لیے کہا۔ میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئی۔

ان کا بہت بڑا بزنس تھا۔ اسی حساب سے آفس بھی بہت شاندار تھا۔ وہ میرے منتظر تھے۔ کچھ دیر تک رسمی گفتگو کرنے کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آئی۔

"انکل! کتنا مشکل ہے یہ دکھ برداشت کرنا۔" میری آواز بھرا گئی۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"ہاں بہت مشکل ہے۔" انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی اور کوئی نہیں ہے' جس میں سننے کا حوصلہ ہو یا سمجھنے کی صلاحیت۔ میری آخری امید آپ ہیں۔"

"میں بھی شاید آپ کی کوئی مدد نہ کر سکوں۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں خود کو آہنی اعصاب کا مالک سمجھتا تھا' لیکن آج ایک ٹوٹا پھوٹا شخص ہوں۔ مجھ میں تو اتنا حوصلہ بھی نہیں کہ تیمور کے ساتھ باتیں کر کے اسے تسلی دے سکوں۔

میں نے سوائے پیسہ دینے کے آج تک اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہی ایک انسان کی سب سے بڑی ضرورت' سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ میں نے اسے سب آسائشیں دیں' اتنا پیسہ دیا کہ وہ اس سے کچھ بھی خرید سکتا تھا' کچھ بھی حاصل کر سکتا تھا اور جب میرے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا۔ بحیثیت شوہر اور بحیثیت باپ' میری جو ذمہ داریاں تھیں وہ سب میں نے پوری کر دی ہیں تو اسی وقت میری خوش فہمی کا محل نیچے آ گرا۔

جب میں امید کے ساتھ اسے ایک ایک ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا تھا' ان سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا' اپنا سارا پیسہ لٹانے کے لیے تیار تھا تب پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ اپنے بیٹے کے لیے میں نے کبھی کچھ نہیں کیا' اسے کچھ بھی نہیں دے سکا۔ یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہے' سب کچھ ہوتے ہوئے میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ وہ درد سے تڑپتا ہے' کراہتا ہے اور میں خاموشی سے دیکھنے' سننے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ پیسہ جسے میں ہر مسئلے کا حل اور ہر محرومی کا علاج سمجھتا تھا' کتنا بے کار ہے' جو میرے بیٹے کے کام نہیں آ سکا' وہ پیسہ کس کام کا۔

میں اس سے نگاہیں نہیں ملا سکتا۔ وہ کیا سوچتا ہو گا کہ ایسے بھی باپ ہوا کرتے ہیں جن سے اولاد ہمیشہ بے فیض رہتی ہے۔ کاش میں نے اس کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہوتا۔ وہ جب بھی میرے پاس بیٹھنا چاہتا تھا' مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا' میرے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ یا تو میں بزنس میں مصروف ہوتا تھا یا پھر اتنا کام کر کے تھک چکا ہوتا تھا' پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے بھی میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ اس کی دنیا میری دنیا سے الگ تھی' لیکن میں نے اس بات پر بھی توجہ نہیں دی کیونکہ اتنی چھوٹی باتوں پر توجہ دینے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔

اب میں کیا جاؤں اس کے پاس' کیا باتیں کروں جب اس کے پاس وقت تھا تب میرے پاس نہیں تھا۔ آج میں اپنا سارا وقت اپنے بیٹے کو دینا چاہتا ہوں تو اس کے پاس وقت نہیں رہا' یہ دیکھو وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔'' انہوں نے وال کلاک کی طرف اشارہ کیا۔

''دیکھو یہ سوئیاں کتنی تیزی سے بھاگ رہی ہیں اور یہ دیکھو۔'' انہوں نے ٹیبل کیلنڈر کا رخ میری طرف موڑا' جہاں جا بجا سرخ روشنائی سے تاریخیں کٹی ہوئی تھیں۔'' یہ دیکھو دن کیسے پر لگا کر اُڑ رہے ہیں۔

وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتا۔ کوئی شکوہ نہیں ہے اسے مجھ سے' کوئی سوال نہیں اس کے پاس پوچھنے کے لیے' کوئی حساب نہیں مانگتا وہ مجھ سے' کیوں نہیں کہتا وہ مجھ سے کچھ' کچھ تو کہے' وہ سارے سوال جو اس کے دل میں ہیں' وہ سب حق جو اسے ملنے چاہیے تھے اور میں نے نہیں دیئے' کیوں نہیں طلب کرتا وہ اپنے حق؟ وہ محبت جو اس کا حق تھی اور میں نے نہیں دی' کیوں نہیں حساب طلب کرتا اس کا؟''

میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ میں آج ابھی' اسی لمحے مرنا چاہتا ہوں' میں تب تک زندہ نہیں رہنا چاہتا جب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر بستر مرگ پر اپنے آخری سانس لے رہا ہو' میں اسے کندھا ملنے تک زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں وہ وقت نہیں دیکھنا چاہتا جب اس کے خوبصورت چہرے کو مٹی کی چادر ڈھانپ لے گی اور سب خالی ہاتھ لوٹ کر پھر اسی دنیا میں مگن ہو جائیں گے' میں وہ لمحے نہیں دیکھنا چاہتا۔''

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی چیخ چیخ کر رو پڑوں۔ تھوڑی دیر تک میں خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی پھر وہاں سے اُٹھ آئی۔ غموں سے چُور ان زندہ لاشوں کے پاس تیمور کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے غم کے پہاڑ تلے دبے ہوئے تھے۔ میرے دل پر ایک اور زخم لگ گیا تھا' جس سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

☆======☆======☆

کتنے دن ہو گئے تھے مجھے باقاعدگی سے تیمور کی طرف جاتے ہوئے۔ میں منتظر تھی کہ پاپا' نبیلہ میں سے کوئی ایک پھر اس دن کی طرح مجھے منع کرے گا' لیکن اتنے دن خیریت سے گزر گئے تھے۔ اس شام اچانک پاپا نے مجھے طلب کر لیا۔ نبیلہ بھی ان کے پاس ہی تھی۔

''بیٹا! آپ کا اتنی دیر تک تیمور کے پاس رہنا ٹھیک نہیں۔'' انہوں نے رسان سے کہا۔

اگر ان کا لہجہ اتنا نرم نہ ہوتا تو شاید میرا لہجہ بھی سخت ہو جاتا لیکن اب ان کے انداز میں اتنی محبت تھی کہ میں چاہتے ہوئے بھی اپنا لہجہ سخت نہ کر سکی۔

''کیوں پاپا؟ یاد ہے وہ کتنی دیر تک ہمارے گھر رہا کرتا تھا۔ میں بھی چھٹی والے دن کتنی دیر تک اس کے ساتھ لائبریری میں وقت گزارا کرتی تھی۔''

''تب بات اور تھی۔''

''کیا فرق پڑ گیا پاپا تب اور اب میں؟''

''سجو بیٹا! میں نے آپ لوگوں کو خود غرضی کا سبق کبھی نہیں دیا' اب بھی نہیں دے رہا' لیکن کبھی زندگی میں کچھ فیصلے انسان کو اپنے لیے بھی کرنے پڑتے ہیں' اور بروقت کرنے پڑتے ہیں' وقت گزر جائے تو سوائے پچھتانے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔''

''پاپا پلیز! کھل کر بات کریں۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ تیمور کی زندگی بہت مختصر ہے۔ اتنی مختصر کہ پلک جھپکنے میں گزر جائے لیکن آپ کے سامنے بہت طویل زندگی پڑی ہے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں' نہ آپ کی ماں ہے اور نہ بھائی کہ آپ کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس دنیا میں اکیلی عورت کا رہنا بہت مشکل ہے۔ جب تک باپ' بھائی یا شوہر سر پر ہوں تب تک لوگوں کی آنکھوں میں کچھ نہ کچھ شرم رہتی ہے' وہ نہ ہوں تو راستے میں بہت درندے ملتے ہیں' قدم اُٹھانا دُشوار ہو جاتا ہے۔

سجو بیٹا! آپ نے تیمور کا انتخاب کیا تھا' میں نے وعدہ نبھایا' اس لیے کہ مجھے آپ اور آپ کی خوشیاں بہت عزیز ہیں' لیکن اب حالات بہت بدل گئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اب انتخاب کا حق آپ مجھے دے دیں۔''

پاپا کے الفاظ نرم تھے' لہجے میں شفقت تھی' لیکن میرے لیے وہ پھانسی کا حکم تھا۔ مجھے لگا غم سے میرا دل پھٹ جائے گا میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ نبیلہ نے گھبرا کر میرا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سجو! کیا ہوا' ٹھیک تو ہو ناں؟''

''آئی ایم آل رائٹ۔'' میں نے اس سے ہاتھ چھڑا لیا اور ریزہ ریزہ ہوتے دل کو

سنبھالتے ہوئے پاپا کو مخاطب کیا۔

''پاپا! یہ کینسر بھی عجیب مرض ہے' جب تک پتا چلتا ہے کہ کوئی بیماری حملہ آور ہو گئی ہے تب تک اس حد تک پھیل چکا ہوتا ہے کہ علاج کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہو جاتا ہے' ہے ناں پاپا؟''

''ہوں۔''

''اور کس کو علم کہ یہ قیامت کب' کس گھر پر ٹوٹ پڑے' ہے ناں پاپا؟''

''ہوں۔''

''اور پاپا! کل آپ کو یہ علم ہو کہ آپ کی بیٹی نبیلہ کے جسم میں کہیں کینسر پھیل گیا ہے' تو کیا آپ اسے کہیں دور مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیں گے؟''

''اللہ نہ کرے بجو! کیوں ایسی بری بات منہ سے نکالتی ہو۔'' نبیلہ ہول گئی۔

''پاپا بتائیں ناں؟ کیا رشتے صرف صحت اور چلتی سانسوں کے ساتھ قائم ہوتے ہیں؟ یہ نہ رہیں تو کیا محبتیں دم توڑ جاتی ہیں؟''

''بیٹا! یہ سب فضول اور جذباتی باتیں ہیں۔''

''پاپا! جذبات اتنے غیر اہم بھی نہیں ہوتے۔'' میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

''میں آپ کو اس کنویں میں گرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میرے لیے آپ اور آپ کی زندگی کسی بھی اور شخص سے زیادہ اہم ہے۔ میں نے آپ سے بہت محبت کے ساتھ وہ حق طلب کیا تھا' جس میں یوں بھی ایک باپ ہونے کے ناتے میرا حصہ ہے' آپ نہیں دیں گی تو میں خود ہی یہ حق اپنے ہاتھ سے لے لوں گا۔''

''پاپا! بس مجھے یہ بتا دیں' ممی کی وفات کے بعد آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟''

''وہ ایک الگ بات ہے۔ ہمارے درمیان محض جذباتی تعلق نہیں تھا۔ ایک مضبوط رشتہ تھا۔''

''رشتے کیا ہوتے ہیں' مجھے علم نہیں' اس لیے کہ محبت کے بغیر رشتے بھی بے کار ہیں۔ کبھی اخبار کے اندر والا صفحہ کھول کر پڑھیں' بیٹے نے ماں کو قتل کر دیا۔ بھائی نے بہن کے ٹکڑے کر ڈالے' بیوی شوہر کے ہاتھوں ہلاک ہوئی یا شوہر کو بیوی نے مار دیا۔ کہیں کسی نے

اولاد پر چھری چلا دی اور کہیں اولاد نے والدین پر' یہ رشتے نہیں ہیں کیا؟ یا پھر آپ کے رشتے ان رشتوں سے زیادہ مضبوط ہیں؟

پاپا رشتے ہوتے ہیں محبت کے ساتھ' میرے اور تیمور کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے' جسے معاشرہ یا مذہب قبول کر سکے' لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کبھی یہ رشتہ قائم ہی نہ ہو سکے۔ میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ اس کی زندگی مختصر ہے' بہت سے لوگوں کی زندگی مختصر ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ انہیں پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ آپ کہتے ہیں کہ میری زندگی طویل ہے۔ یہ کس کو علم ہے پاپا کہ میں تیمور سے زیادہ لمبی زندگی پاؤں گی' ممکن ہے میں اس سے پہلے مر جاؤں۔ آپ اس بات کو جاننے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں۔ جس کا علم صرف ایک ہستی کو ہے۔ پلیز پاپا آپ انتخاب کا حق مجھ سے مت واپس لیں۔ آپ کی خاطر میں اپنے حق سے دستبردار ہو سکتی ہوں' لیکن کوئی ایسا تعلق قائم نہیں کر سکتی جسے میرا دل اور میرا ذہن قبول نہ کرے اور جس کی بنیاد میں میری طرف سے منافقت اور جھوٹ شامل ہو۔''

''اسی بات کا ڈر تھا مجھے' یہی خوف تھا۔'' نبیلہ بہت پریشان تھی۔

''بیلا! یہ گارنٹی مجھے کون دے سکتا ہے کہ جسے تم لوگ میرے لیے منتخب کرو گے۔ اس کی عمر تیمور سے زیادہ لمبی ہو گی۔''

''گارنٹی تو کوئی نہیں دے سکتا۔ البتہ امید کی جا سکتی ہے۔ ایک طرف کھلی حقیقت ہے اور دوسری طرف امید ایسے میں میرے خیال میں امید کا چانس لے لینا زیادہ بہتر ہے۔'' نبیلہ نے کہا۔

''کاش آپ میں سے کوئی اس اذیت سے گزر رہا ہوتا' جس سے میں گزر رہی ہوں۔'' میں نے دھندلی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ ہم میں سے ہر کوئی اپنے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ تیمور کی ممی جو چند دن قبل تک میری منتیں کر رہی تھیں۔ اب طعنوں پر اتر آئی تھیں۔ بعض اوقات تو شاید انہیں خود بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ میری اہمیت ان کی نظر میں صرف اتنی تھی کہ میں ان کے بیٹے کی خواہش تھی۔ وہ میرے ساتھ خوش رہتا تھا۔ آج تک انہوں نے اپنے بیٹے کی ہر خواہش پوری کی تھی اور اب جب اس کے پاس صرف چند سانسیں باقی بچی تھیں تو وہ کیسے اس کی

خواہش رد کر سکتی تھیں۔

پاپا کی نظر میں تیمور کی اہمیت صرف میرے حوالے سے تھی۔ وہ میرے انتخاب سے مطمئن تھے اور اس بارے میں خود سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے پھر جب انہیں علم ہوا کہ اب تیمور کچھ دن کا مہمان ہے تو اس کی اہمیت صفر رہ گئی۔ انہیں اس سے ہمدردی تھی' کیونکہ ان کے اندر ایک حساس اور ہمدرد دل تھا' لیکن اپنی اولاد کے مقابلے میں ان کے لیے کسی کی کوئی اہمیت' کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اور میں تھی جو ہر گزرتے پل کے ساتھ تیمور سے زیادہ شدت سے محبت کرنے لگی تھی۔ جب یہ احساس ہو کہ ہم اپنی سب سے محبوب ہستی کھونے لگے ہیں تو محبت کی شدت میں اسی طرح اضافہ ہوا کرتا ہے۔ کاش میرے بس میں ہوتا' میں اس کی زندگی بچانے کے لیے کچھ کر سکتی' لیکن میں بالکل تہی دست تھی۔ کچھ نہیں تھا' میرے پاس' سوائے اس محبت کے جو اس کے لیے میرے دل میں تھی اور ان خوشیوں کے جو میں اسے دے سکتی تھی اور اس بارے میں' میں کسی بخل سے کام نہیں لینا چاہتی تھی۔

نبیلہ رات کے کھانے کے لیے بلانے آئی۔ میں نے انکار کر دیا۔ ایسے میں کس کا دل چاہ سکتا تھا کھانا کھانے کے لیے۔ وہ بغیر اصرار کے واپس چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد پاپا آ گئے۔ وہ بہت افسردہ اور بجھے بجھے سے تھے۔ مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔

''سجو! آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کے ساتھ برائی کر رہا ہوں۔''

''نہیں پاپا! ایسا تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی' لیکن پاپا کوئی میری بات سمجھتا ہی نہیں ہے۔ کوئی اس دکھ کو محسوس ہی نہیں کرتا' جس سے میں گزر رہی ہوں۔ کوئی بھی کیوں نہیں سمجھتا میری بات کو؟'' میں رو پڑی۔

''میں سمجھتا ہوں اس لیے کہ میں بھی ایسے دکھ سے گزر چکا ہوں۔'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ ''آپ لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ سب لوگوں کی طرح آپ کے کوئی رشتہ دار کیوں نہیں ہیں اور میرے جھوٹ سے آپ کبھی مطمئن نہیں ہوئے۔ مگر اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ آج میں آپ کو سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے نبیلہ کو بھی وہیں بلوالیا۔ ہماری اس بارے میں رائے محض ایک گمان پر مبنی تھی

اور یہ حقیقت تھی کہ ہم بہنوں نے کبھی ان پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ ہم کیا سوچتے تھے۔ اب ہم منتظر تھے کہ اصل بات ان کے منہ سے سن سکیں۔

''میں اور آپ کی مما اکٹھے پڑھتے تھے۔ جی سی سے انگریزی میں ماسٹرز کرنے سے قبل ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔ آپ کی مما گل رعنا بہت اچھی تھیں بہت خوبصورت اور بہت ذہین۔ ان کی انہی خوبیوں نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا تھا۔ ان کا تعلیمی پس منظر بھی بہت اچھا تھا۔ ان کی اسکولنگ کانونٹ میں ہوئی تھی۔ پھر وہ کنیرڈ کالج میں گئیں اور ماسٹرز کے لیے جی سی آ گئیں۔ وہ انگریزی میں شاعری کرتی تھیں۔ پینٹنگ ان کا شوق تھا۔ بہت سلجھی ہوئی تھیں۔ بہت دھیمے انداز میں بات کرتی تھیں۔ میوزک کا بھی شوق تھا انہیں۔ ستار اور پیانو بہت اچھا بجاتی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب عام گھرانوں میں لڑکیاں میٹرک کر لیتیں تو سمجھا جاتا تھا کہ بہت پڑھ لکھ گئی ہیں۔

ان کے چار بھائی تھے۔ چاروں بڑے اور شادی شدہ تھے' والد ڈاکٹر تھے' والدہ گھریلو خاتون تھیں۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ان کے والد پہلے شخص تھے جنہوں نے اس روایت سے بغاوت کی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی انہیں بہت پیاری تھی۔ پیسہ بھی بہت تھا' اس لیے رعنا کی تعلیم و تربیت میں کم از کم کوئی مالی مشکل کبھی حائل نہیں ہوئی۔ اس کی خاطر انہوں نے قدم قدم پر خاندان سے ٹکر لی تھی۔ ان کا خاندان سخت پردے کا قائل تھا۔ والد نے ان پر کبھی یہ پابندی نہیں لگائی۔ وہ شوفر کے ساتھ آتی تھیں اور باوردی شوفر باہر ہی ان کا انتظار کرتا رہتا تھا۔

ہمارا خاندان بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پیسہ اتنا نہیں تھا لیکن مزاج کچھ ایسا ہی تھا۔ نہ لڑکوں کو بہت زیادہ آزادی حاصل تھی اور لڑکیوں کو آزادی ملنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ہم تین بھائی تھے اور دو بہنیں۔ ایک بھائی بہت نکما اور آوارہ مزاج تھا' جس کی وجہ سے ہر روز گھر میں فساد ہوتا تھا۔ ایک بھائی انجینئرنگ پڑھ رہا تھا اور میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ بہنیں ہم سے چھوٹی تھیں۔ ہر وقت گھر کے کاموں میں اُلجھی رہتی تھیں۔ ہمارے سامنے ان کے سر سے دوپٹا بھی نہیں سرکتا تھا۔ اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ اس معاملے میں ہماری اماں بہت سخت تھیں۔

مجھے اپنے گھر کا یہ ماحول پسند نہیں تھا۔ وہاں بہت گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ میری بہنیں

بہت خوبصورت تھیں' لیکن ان کے ذہن بالکل بند تھے۔ کبھی میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کیا پا رہی ہیں۔ وہ مجھے بھیڑ بکریاں لگتی تھیں۔ کچھ کام کیا' کچھ کھایا پیا' کچھ ڈانٹ پھٹکار برداشت کی اور پھر سو گئیں یہ تھی ان کی زندگی۔ شادی ہو جاتی تو ہمارے گھر کی طرح کا ایک اور گھر وجود میں آ جاتا۔ ہماری اماں کی طرح' وہ بھی اسی گھٹن میں مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتیں۔ پھر بھی یہ جال کاٹنے کے بجائے اسے اور مضبوط کرتیں۔ اپنے بچوں کے لیے ایک ایسا ہی ماحول بنتیں' اپنی محدود عقل سے ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتیں اور وہ مزاحمت کرتے تو یہ نئے زمانے کو کوستیں' جس میں ماں کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہی۔

ایسے ماحول میں رہنے والے ایک فرد کے لیے گل رعنا میں بہت کشش تھی۔ بہت جلد ہم میں دوستی ہو گئی۔ ہمارا دس گیارہ طلبہ کا ایک گروپ تھا۔ ہم جہاں جاتے اکٹھے جاتے' ''گزٹ اور راوی'' کے آفس میں بیٹھ کر نئے ادیبوں اور شاعروں کے کام پر تبادلہ خیال کرتے۔ رعنا کا کلام بہت باقاعدگی سے گزٹ میں چھپا کرتا تھا۔ جس دن گزٹ چھپ کر ہمارے ہاتھوں میں آتا تھا اس دن اوول میں ہماری تنقیدی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ جی سی ڈی سی گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب کے وہ دونوں سالانہ ڈرامے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا جن میں رعنا نے حصہ لیا تھا اور بہت خوبصورت پرفارمنس دی تھی۔

کچھ ہی عرصے میں ہم دونوں کی دوستی اتنی گہری ہو گئی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہو گئے۔ رعنا کے حصول کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ میں کچھ بنتا' سو میں نے بہت محنت کی۔ شروع سے میرا ارادہ سول سروس میں جانے کا تھا۔ رعنا نے بھی میری بہت مدد کی۔ ہر قدم پر مجھے حوصلہ دیا۔ وہ نہ ہوتی تو میں شاید کبھی سول سروس کا امتحان پاس نہ کر سکتا۔

ماسٹرز کے پرچوں کے بعد مجھے سول سروس کا امتحان دینا تھا۔ دوسری طرف اس کے والد اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ جس شخص کو انہوں نے منتخب کیا تھا۔ وہ ان کے خاندان کا ہی تھا۔ اتنی بغاوت کر لینے کے بعد اس کے والد کی ہمت یہاں جواب دے گئی تھی۔ وہ خاندان کی اس روایت سے بغاوت نہیں کر سکتے تھے کہ لڑکی کی شادی صرف خاندان میں ہو گی۔ یہ نہیں کہ میں رعنا کا امیدوار تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ شخص کسی طور پر رعنا کے قابل نہیں تھا۔ وہ بہت وسیع جائیداد کا مالک تھا۔ کتنے مربعے زرعی اراضی تھی اس کی لیکن رعنا جیسی ذہین اور خوش ذوق لڑکی کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

وہ بہت پریشان تھی۔ اپنی پریشانی کا اظہار بھی مجھ سے کیا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بابا جان اچانک اتنے اہم معاملے پر اس قدر سخت ہو جائیں گے۔ میں اسی خوش فہمی کا شکار رہی کہ جہاں انہوں نے سب کی مخالفت برداشت کر کے مجھے اتنا کچھ دیا ہے' اتنا پڑھایا لکھایا ہے۔ وہیں اس معاملے میں بھی وہ میری رائے کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔''

میں تو گنگ ہی رہ گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے رعنا؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں نے بہت شائستگی کے ساتھ بابا جان کے سامنے اس رشتے سے انکار کیا مگر ان کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''تم بس چند دن کے لیے یہ مسئلہ ٹال دو۔ میں اپنے گھر میں بات کرتا ہوں۔ جلد ہی اماں اور ابا جی کو تمہاری طرف بھیجوں گا۔''

میری اتنی سی یقین دہانی سے ہی وہ مطمئن ہو گئی۔ میں نے گھر میں بات کی تو طوفان ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے تو یہی بات سب کے لیے ناقابلِ قبول تھی کہ میں اپنے منہ سے اپنی شادی کی بات کر رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ لڑکی بھی میں نے خود پسند کی تھی۔ وہ بھی ایسی جو ایم اے تک پڑھ چکی تھی۔ ہمارے گھر میں یہ جرائم ایسے نہیں تھے جو معاف ہو سکتے۔

ابا جی یوں بھی کچھ جلاد صفت واقع ہوئے تھے وہ تو مرنے مارنے پر تُل گئے۔ اماں سینہ پیٹتے ہوئے بَین کرتی جاتی تھیں اور رعنا کو کوستی جاتی تھیں۔ جس نے ان کے معصوم بھولے بھالے بیٹے کو پھانس لیا تھا۔ ساتھ ہی یہ شکر بھی ادا کرتی جاتی تھیں کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو تعلیم نہیں دلوائی تھی ورنہ رعنا کی طرح وہ بھی یہی گل کھلاتیں اور اماں خاندان بھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتیں۔

''میری ایسی بیٹی ہوتی تو زندہ زمین میں گاڑ دوں۔ کیسے بے غیرت ماں باپ ہیں کہ کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ جائیں اور جا کر کالجوں میں بھولے بھالے لڑکوں کو پھنسائیں۔'' اماں بار بار کہہ رہی تھیں۔

اس وقت میں نے سوچا کہ رعنا خوش فہم تھی تو اس کی کوئی وجہ تھی۔ اس کے بابا جان نے بہت ٹکر لی تھی سب سے۔ میں خوش فہم تھا تو اس کی کیا وجہ تھی؟

کوئی نہیں۔ شاید میں زیادہ پریکٹیکل نہیں تھا اس لیے۔ شاید میں نے وہی سوچنا اور محسوس کرنا چاہا تھا جس طرح کی زندگی گزارنے کا میں خواہش مند تھا اس لیے۔ وجہ بہر حال جو کچھ بھی تھی' میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ گھر والوں کا ردِعمل اتنا شدید ہوگا۔

میری مایوسی کی انتہا نہیں تھی۔ اچانک جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گیا تھا میں۔ ابا جی پستول نکال لائے تھے۔ میرا اور میاں والا بھائی ہمارے بیچ آ گیا۔

''ابا جی کیا کرتے ہیں۔ اپنی بات کہنے اور سمجھانے کے اور بہت سے طریقے بھی ہوتے ہیں۔''

لیکن ابا جی کے پاس ہمیشہ ایک ہی طریقہ رہا تھا۔ سب سے بڑے آوارہ مزاج بھائی کی خاطر ہر دوسرے دن وہ اماں کو مارا کرتے تھے۔ یہ خطا انہوں نے بہت آسانی کے ساتھ اماں کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ اب میرے جرائم تو اس سے بھی زیادہ کڑے تھے۔ وہ پستول نہ نکالتے تو کیا کرتے۔

''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ خون پی جاؤں گا اس کا۔ کیا سمجھ کر اس نے یہ بات کی ہے۔ کالج کی پڑھی آوارہ' بدچلن لڑکی کو اس خاندان کی بہو بنائے گا۔ اس کے ساتھ عشق بازی کرتی رہی ہے تو نہ جانے اور کس کس کے ساتھ پینگیں بڑھائی ہوں گی۔ اس کے ساتھ شادی کرے گا یہ۔''

میں نے سوچا میں کس قدر پاگل تھا' گل رعنا جیسی نفیس ذہین اور پیاری سی لڑکی کو اس جہنم میں جھونکنا چاہتا تھا وہ تو یہاں آ کر پاگل ہی ہو جاتی۔ ابا جی نے اسے آوارہ اور بدچلن کہا تو میرے دماغ کا فیوز ہی اُڑ گیا۔ میں نے ان کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور پستول چھین کر پرے پھینک دیا۔

''رعنا آوارہ اور بدچلن نہیں ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

میرا ذہن بری طرح سے منتشر تھا۔ جائے پناہ ہوسٹل کے علاوہ کوئی نہیں تھی۔ نیو ہوسٹل پہنچا تو دوست ایسی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہیں سے میں نے بہت مشکل کے ساتھ رعنا سے رابطہ کیا اور اسے کالج آنے کے لیے کہا۔

وہ آئی تو ہم دونوں لوگارڈن میں جا بیٹھے۔

''بہت پریشان لگ رہے ہو۔ خیریت ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی لیکن گھر والے نہیں مانے۔''

وہ ہونٹ کاٹنے لگی پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔ ''ممکن ہے تم پھر بات کرو تو مان جائیں۔ سب والدین کو اولاد سے کچھ توقعات ہوتی ہیں' وہ پوری نہ ہوں تو تھوڑی دیر تک وہ اس صدمے سے ہی باہر نہیں نکل پاتے۔ ممکن ہے بعد میں ان کا ذہن اس بات کو قبول کر لے۔''

''تم جانتی نہیں ہو رعنا! وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جیسے لوگوں کے بیچ تم رہ رہی ہو۔ اگر میں راوی اور گزٹ آفس میں بیٹھ کر سب کو اپنا نقطہ نظر سمجھا سکتا ہوں۔ ڈبیٹ کے دوران پورے ہال کو اپنا ہمنوا بنا سکتا ہوں تو کیا اتنی سی بات اپنے گھر والوں کو نہیں سمجھا سکتا؟ لیکن کوئی سنے بھی۔ پورے گھر میں اولاد کے سننے اور بزرگوں کے بولنے کی روایت ہے۔ یہ روایت ٹوٹنے لگے تو بولنے والے اتنا شور مچاتے ہیں کہ کسی اور کو بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

میں اگلے دس سال بھی بولنے کی کوشش کرتا رہوں۔ تب بھی کچھ نہیں بنے گا۔ ریڈیو کی آواز اسی کان تک پہنچتی ہے جو اسے سننا چاہے' جو سوئچ آف کر دے۔ اس کے کان کیا خاک سنیں گے کہ کیا نشر ہو رہا ہے۔''

وہ سخت اپ سیٹ ہو گئی۔ ''پھر؟''

''پھر یہ کہ میرے گھر والے نہیں آ سکتے لیکن میں خود تمہارے گھر آؤں گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں تک میرا ساتھ دو گی؟''

''تمہارا آنا بیکار ہوگا لیکن یقین کرو میں وہاں تک تمہارا ساتھ ضرور دوں گی جہاں تک تم چل سکو گے۔''

''اور اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو؟''

''یہ بات میں ابھی بھی جانتی ہوں کہ وہ نہیں مانیں گے۔''

''پھر کہیں' کسی وقت پچھتاؤ گی تو نہیں؟''

''نہیں۔ میری زندگی کا ایک ہی سادہ سا اصول ہے۔ جھوٹ کو اپنی زندگی میں داخل نہیں ہونے دینا اور بس یہ طے ہے کہ میں ایک ایسی زندگی نہیں گزاروں گی جس میں میری طرف سے جھوٹ اور منافقت شامل ہو۔

وہ شخص جو بابا جان کا انتخاب ہے جیسا بھی ہے میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں

دوں گی لیکن میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں اسے دھوکا دوں۔ جھوٹ سے یہ بندھن قائم تو ہو سکتا ہے مگر چل نہیں سکتا۔''

''پھر میں کب آؤں تمہارے گھر؟''

''چاہو تو ابھی میرے ساتھ چلو۔ اچھا ہے یہ حجت بھی پوری ہو جائے۔ کم از کم میرے دل میں کبھی یہ ملال تو نہیں آئے گا اگر بابا جان تم سے مل لیے ہوتے تو ممکن ہے' ہمیں ان کی دعائیں مل جاتیں۔'' وہ خاموش ہوگئی پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔ ''بہت برا کیا بابا جان نے مجھے یہ سب دے کر۔ سچ اور جھوٹ میں تمیز سکھا کر۔ زندگی گزارنے کا ہنر سکھا کر۔ خاندان میں' میں سب سے مختلف لڑکی ہوں۔ شاید کسی سے بہتر نہ ہوں لیکن میری اور باقی خاندان والوں کی سوچ میں اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو اسے پاٹ نہیں سکتی۔ میں ان کے درمیان انہی کے انداز سے رہنے کے قابل نہیں رہی۔ اگر بابا جان نے مجھے انہی میں شامل کرنا تھا تو انہی جیسا رہنے دیا ہوتا۔

اب وہ مجھ سے ناراض ہیں کہ جس بیٹی کے لیے انہوں نے خاندان کے اتنے اصول توڑے جسے وہ کچھ دیا۔ جو آج تک خاندان کی کسی لڑکی کو نہیں مل سکا۔ آج وہی بیٹی اپنے باپ کے سامنے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی خواہش کا احترام نہیں کر رہی۔

وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے مجھے اس لیے تعلیم دی تھی تاکہ میں زندگی کی مشکلوں سے آسانی کے ساتھ نبرد آزما ہو سکوں۔ اس لیے نہیں کہ میں اپنی من مانی کروں۔ کاش انہوں نے مجھے ویسے ہی رہنے دیا ہوتا جیسے سب تھے۔ اب میں درمیان میں معلق ہوگئی ہوں۔ پرواز سکھا کر پر کاٹ دینا بہت بڑی ناانصافی ہے۔ کاش میں نے اُڑنا نہ سیکھا ہوتا پھر آج میں اور بابا جان دونوں مطمئن ہوتے۔''

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

''اٹھو' تمہارے گھر چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کالج کے باہر اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے شوفر سے چلے جانے کے لیے کہا۔

''لیکن بی بی آپ؟''

''میں آجاؤں گی۔ تم جاؤ۔''

کار گل رعنا کے بغیر گھر پہنچی تو اس کے والد پریشان ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم پہنچے تو ان کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ خیر اس کے گھر کا ماحول اس حد تک مختلف تھا کہ وہ ہمیں اندر ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ میں نے سوچا کہ ہمارا گھر ہوتا تو وہیں دروازے پر شور شرابا اور ہنگامہ شروع ہو جاتا۔

رعنا نے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔

''رعنا تم اندر جاؤ۔'' اس کے والد کو یقیناً اس کی یہ جسارت بری لگی تھی۔

''بابا جان آپ کی اجازت کے ساتھ میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم موڑ ہے۔'' اس کے انداز میں بغاوت نہیں ہمیشہ والی نرمی تھی لیکن لہجہ مضبوط تھا۔

اس کی بات سن کر انہیں جو غصہ آیا اسے وہ خاموشی سے پی گئے۔ میں نے ان کے سامنے مدعا بیان کیا۔

''برخودار! ہم خاندانی لوگ ہیں اور ایسے گھروں میں اس انداز میں رشتے نہیں بھیجے جاتے۔ یوں بھی ہماری بیٹی کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ شریفوں میں زبان دے کر پھرنے کی روایت نہیں ہوتی۔''

میں نے ان سے بحث کرنی چاہی۔ انہیں قائل کرنا چاہا۔ رعنا نے بھی میرا ساتھ دیا لیکن انہوں نے کچھ سننا گوارا نہیں کیا۔

''میرے صبر کا مزید امتحان مت لو۔ وہ باہر کا راستہ ہے۔ خود نہیں جاؤ گے تو میرے ملازم تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔''

رعنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''بابا جان یہ طے ہے کہ میں جھوٹی زندگی نہیں گزاروں گی۔'' وہی مضبوط لہجہ۔

''میرے لیے تمہاری زندگی سے اہم وہ قول ہے جو میں دے چکا ہوں۔ محض چند کتابیں پڑھ لینے سے شریفوں کے اطوار نہیں بدل جاتے۔'' پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

''اب یہاں پھر کبھی مت آنا۔''

رعنا نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے چلے جانے کے لیے کہا۔

جوانی میں جوش بہت ہوتا ہے۔ مخالفت جتنی بڑھتی ہے۔ جذبوں میں اتنی ہی شدت آ

جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ رعنا میرے لیے زندگی میں سب سے اہم ہوگئی تھی۔ نہ میں خود اس دنیا میں ایک جاہل اور سوچ سمجھ سے عاری خاندان کا اضافہ کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ گل رعنا جیسی نفیس اور خوش ذوق لڑکی ساری زندگی گاؤں کی ایک ایسی حویلی کی چار دیواری میں قید ہو جائے جہاں سورج کی کرنوں کا داخلہ بھی ممنوع ہوتا ہے۔

میں نے اس سے رابطہ کیا۔ وہ بہت مشکل سے آسکی۔

''کیا اب بھی اس وعدے پر قائم ہو کہ جہاں تک میں چل سکا وہاں تک میرا ساتھ دو گی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں جو کچھ کہتی ہوں' بہت سوچ سمجھ کر کہتی ہوں اور صرف وہی کہتی ہوں جس پر عمل کر سکوں۔''

''کیا اب بھی کوئی گنجائش ہے کہ تمہارے بابا جان مان جائیں؟''

''نہیں۔''

''میں نے شادی کا انتظام کیا ہے لیکن اس بارے میں ابھی سوچ لو۔''

''میں نے اس بارے میں بہت کچھ سوچا ہے کیونکہ اتنے دنوں سے میرے پاس سوچنے کو اور کچھ تھا بھی نہیں۔ میں تیار ہوں۔''

''تم سے میرے بارے میں کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس روز کے واقعے کے بعد سے میں اپنے گھر نہیں گیا۔ ابھی تک میں نے کمانا شروع نہیں کیا۔ تن کے ان کپڑوں کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم ایسی زندگی کی عادی نہیں ہو۔ یہ زندگی بہت سخت ہوگی۔''

''میں زندگی کی سختیوں سے نہیں گھبراتی۔ مجھ میں بہت زیادہ قوتِ برداشت ہے۔ بس مجھے ایک چیز گوارا نہیں اور وہ ہے جھوٹ۔''

''شادی کا انتظام آفریدی نے کیا ہے اور کچھ عرصہ تک ہم اس کی طرف چترال میں ہی رہیں گے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''اب تم جہاں لے جاؤ۔''

شادی بہت سادگی سے ہوئی۔ ہمارے کلاس فیلوز بہت خوش تھے۔ آفریدی ہمارا گروپ فیلو تھا اور چترال میں ان کے خاندان کی وسیع جائیداد تھی۔

''یہ ہمارے سیشن کا پہلا جوڑا ہے۔ سب ان سے آشیرباد لے لو۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ

رہے تھے۔

جب تھوڑا سکون ہوا تو رعنا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''شاید اب تمہارے گھر والوں کا غصہ اتر جائے تم ان سے رابطہ کر کے تو دیکھو۔''

''اب تو ان کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا ہوگا۔ میں ان سب کو جانتا ہوں۔ یہ جرم ناقابل معافی ہے۔''

''تم کوشش تو کرو۔ بلکہ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ممکن ہے مجھے دیکھ کر وہ قبول کر لیں۔''

مجھے اس کی خوش فہمی پر ہنسی بھی آئی۔ اسے سمجھایا بھی بہت لیکن وہ مسلسل مجھے قائل کرتی رہی۔

''تم چاہتی ہو تو چلی جاؤ لیکن خواہ مخواہ تماشا بنے گا۔'' میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ہم گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے کہ گویا آتش فشاں پھٹ گیا۔ وہ ہنگامہ ہوا کہ خدا کی پناہ۔ میرے ساتھ تو ابا جی جو کرنا چاہتے تھے' سو کرنا چاہتے تھے' جب وہ رعنا کو مارنے کے لیے آگے بڑھے تو میں درمیان میں آ گیا۔

''یہ میری بیوی ہے اور اپنی بیوی کی عزت کرانا مجھے آتا ہے۔''

مجھے درمیان سے ہٹا کر انہوں نے رعنا پر ہاتھ اٹھانا چاہا۔ اس بات کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کر انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا کر لگے اور انہیں چوٹ بھی آگئی۔

اس وقت سارے ہنگامے پر ایک آواز غالب آگئی۔ اماں کی آواز جو روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''جیسا دکھ تُو نے اپنے ماں باپ کو دیا ہے وہ کسی نے نہ دیا ہوگا۔ اللہ کرے کہ تیرا کوئی بیٹا نہ ہو۔ تُو ترستا رہے بیٹے کے لیے۔''

پھر ابا جی نے کہا۔ ''آج سے تُو مر گیا ہمارے لیے۔ پھر کبھی ہمارے پاس مت آنا۔''

میں رعنا کو لے کر وہاں سے چلا آیا۔ ہم اس کے والدین کے بھی گھر گئے۔ وہاں ویسا ہنگامہ نہیں ہوا لیکن کوئی بھی ہماری صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ اس کی ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ انہیں ہماری آمد کی خبر ہوئی تو انہوں نے باہر برآمدے میں آنا چاہا۔ پر اس کے

"اپنے گھر کا کام کر کے کون تھکتا ہے۔"

پھر ہماری زندگی میں نبیلہ آئی۔ اس کی آمد سے جیسے زندگی بالکل ہی بدل گئی۔ رعنا کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ اتنی پیاری بیٹی پا کر اتنے خوش تھے کہ بیان سے باہر ہے۔

"پتا نہیں ہم اب تک بیلا کے بغیر کیسے رہتے رہے ہیں۔ لگتا ہے جیسے اب زندگی مکمل ہوئی ہے۔ ہمارا گھر مکمل ہوا ہے۔ اس کے بغیر کتنی خاموشی چھائی رہتی تھی یہاں۔"

اس کی بات سن کر میں ہنس پڑتا تھا۔

اور کبھی وہ بہت اداس ہو جاتی تھی۔ میں پوچھتا تو وہ اسی قدر کہتی تھی۔

"میں اپنی بیٹی کی بہترین طریقے سے پرورش کروں گی۔ اسے اُڑنا سکھاؤں گی تو سیکھ لینے کے بعد اس کے پر نہیں کاٹوں گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ ہمیں کوئی دکھ نہیں دے گی۔ پرندے کو قید کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ اُڑ جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے اسے محبت سے اپنا بنا کر رکھا جائے تو ہر اُڑان کے بعد لوٹ آتا ہے۔"

میں اسے سمجھاتا تھا کہ وہ پرانی باتوں کو بھول جائے۔ خود میں بھی بھول چکا تھا۔ وہ گھر جس میں ہر روز ایک نیا فتنہ جنم لیتا تھا۔ ہر روز ایک نیا جھگڑا ہوتا تھا۔ اسے چھوڑ کر میں بہت سکون میں تھا‘ لیکن وہ کچھ نہیں بھولی تھی۔ میں اتنا تو جانتا تھا کہ وہ انہیں نہیں بھولی تھی مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ پرانی باتیں دیمک بن کر اس کے وجود کو لگ چکی تھیں۔

اگلی مرتبہ جب ہمیں خوشخبری ملی اور میں نے اس سے کہا۔

"بس ہمارے دو ہی بچے ہوں گے۔ چاہے اب کے بیٹا ہو یا بیٹی‘ دو بچے ہی کافی ہیں۔"

تو وہ اچانک ہی اَپ سیٹ ہوگئی۔

"میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری نہیں کرتی لیکن اب میں بیٹا چاہتی ہوں۔"

اور پھر اس نے کتنی مرتبہ کہا۔

"اس مرتبہ بیٹا ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مجھ سے یہ غم برداشت نہیں ہو گا۔"

"کمال کرتی ہو تم بھی۔ بیٹا ہو یا بیٹی‘ یہ اللہ کی دین ہے۔ میں پھر یہ بات نہ سنوں

تمہارے منہ سے۔" میں اس سے اُلجھ گیا۔

"میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم بیٹے جیسی نعمت سے محروم رہو۔"

"رعنا! کیسی باتیں کرتی ہو۔ جب میرے نزدیک یہ کوئی محرومی ہی نہیں ہے تو اس کا اظہار کیوں کرتی ہو۔"

اس پورے عرصے میں وہ حد سے زیادہ اَپ سیٹ رہی۔ میں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا لیکن وہ میری اماں کی بددعا بھول نہیں پائی تھی۔

جب پیدائش کا وقت قریب آیا تو اس کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو چکا تھا۔

"میں اب نہیں بچوں گی۔ پلیز میرے بچوں کا خیال رکھنا۔ کاش میرے بس میں ہو اور میں تمہیں بیٹا دے سکوں۔ سنو میرے بچوں کو اُڑان سکھاؤ تو ان کے پَر مت کاٹنا۔ انہیں غصے کے ساتھ خود سے جدا نہ کرنا۔ ان کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو ہمارے ساتھ ہوا‘ ورنہ یہ دکھ انہیں ختم کر دے گا۔ پلیز وعدہ کرو۔"

وہ لیبر روم میں جانے سے پہلے مجھ سے کہہ رہی تھی۔

پاپا کہتے کہتے رک گئے۔ ہم دونوں بہنیں یوں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ جیسے ابھی ابھی اپنی ماں سے بچھڑی ہوں۔ پاپا نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"رعنا نے مجھے یہ تحفہ دیا لیکن خود ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔" انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "مجھے لگا جیسے زندگی وہیں ٹھہر گئی ہو۔ میرے لیے سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ رعنا جیسی بیوی کے چلے جانے کے بعد زندگی میں کیا رہ گیا تھا۔

اور تب اپنی اس محرومی کا بدلہ میں نے اپنی اس گڑیا سی بیٹی جو سے لیا۔ میں نے اسے ہی رعنا کی موت کے لیے قصوروار ٹھہرایا۔ میرے لیے یہ کچھ بھی نہیں تھی میں نے اسے کچھ نہیں سمجھا تھا اپنا۔ یہاں تک کہ اس کا نام رکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رعنا کو یوں بھی بیٹی نہیں چاہیے تھی اس لیے یہ نہ رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ اب رعنا نہیں رہی‘ ہوتی تب بھی یہ لڑکی اس کے غم میں اضافے کا باعث بنتی۔

کتنا بے وقوف تھا میں۔ کیا رعنا جیسی محبت کرنے والی ہستی‘ وہ ماں اپنی بیٹی کے لیے ایسے سوچ سکتی تھی لیکن میری سوچ سمجھ کے تمام دروازے بند ہو گئے تھے۔ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میں نے ملازمہ رکھ لی تھی۔ وہ جو کو فیڈر دے دیتی تھی تو ٹھیک تھا نہیں دیتی

تھی تو مجھے پروا نہیں ہوتی تھی میں صرف نبیلہ کا خیال رکھتا تھا۔ اس کے سلسلے میں ملازمہ کی معمولی سی کوتاہی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ بیلا سے رعنا بہت پیار کرتی تھی۔

ملازمہ کو بھی میرے رویے کے فرق کا اندازہ تھا۔ وہ بہت اچھی تھی، خود ہی سجو کا خیال رکھتی تھی۔ میں تو اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ بیلا کی ایک ایک حرکت مجھے بہت پیاری اور معصوم لگتی تھی اور سجو کی ہر خوبصورت بات بھی میں یوں نظر انداز کر دیتا تھا جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ پاپا...... پاپا کرتے ہوئے میرے پاس آتی اور میں اسے ایک جھٹکے کے ساتھ خود سے الگ کر دیتا۔

پھر ایک روز ملازمہ نے مجھ سے کہا۔

''صاحب جی! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''کہو۔''

وہ کچھ ڈر بھی رہی تھی۔ بہر حال کہنے لگی۔

''کتنے گھروں کے آنگن اللہ میاں بچوں کی ہنسی سے بھر دیتا ہے اور کچھ گھر اس ہنسی سے محروم ہی رہتے ہیں۔ وہ جی میرا بھائی فوجی ہے۔ ایک کرنیل صاحب کا اردلی ہے۔ وہ بے چارے بچوں کے لیے ترستے ہیں۔ کہتے ہیں کہیں سے بچہ گود لے لیں گے۔ جی اگر چھوٹی بی بی......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

مجھے تعجب ہوا کہ اس نے اپنا جملہ کیوں پورا نہیں کیا تھا۔ لے جانا چاہتی تھی تو بے شک لے جاتی۔

''چھوٹی کو انہیں گود دینے کے لیے کہہ رہی ہو؟''

میرے انداز سے اس کے اندر کچھ حوصلہ پیدا ہوا۔

''جی صاحب۔''

''تو لے جاؤ۔''

میں زیادہ لمبے چوڑے چکروں میں نہیں پڑا اور وہ لوگ آ کر سجو کو لے گئے۔

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بیلا نے پوچھا۔

''پاپا، سجو کہاں گئی؟''

میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ کبھی بیلا بہل جاتی اور کبھی زور زور سے رونے لگتی کہ سجو کو لاؤ۔ خود میرا بھی عجیب حال ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے بیلا کو سلا کر خود سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے میری کوئی قیمتی شے کھو گئی ہو جیسے رعنا آج پھر مر گئی ہو۔ وہ رات کیسے انگاروں پر گزری۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ بچی جو سوا دو سال تک میری نفرت کا نشانہ بنتی رہی۔ وہ اچانک آج دل کے اتنے قریب کیسے آ گئی۔ دو دن تک میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بیلا کو بھی بہلاتا رہا لیکن تیسرے دن تک میں اپنی بیٹی کے بغیر پاگل پن کی حدوں کو جا پہنچا تھا۔

اگلے روز صبح صبح میں ان کرنل صاحب کے گھر جا پہنچا۔ سجو باہر لان میں کھیل رہی تھی۔ وہ کرنل صاحب اور ان کی بیگم فجر کی نماز پڑھ کر وہیں چہل قدمی کر رہے تھے۔ سجو کے ساتھ کھیل بھی رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو سجو اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر میری طرف دوڑی آئی۔

پاپا...... پاپا!'' وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

میری گڑیا جیسی بیٹی سینے سے لگی تو تین دن سے اندر لگی ہوئی آگ جیسے پل میں بجھ گئی۔ اب تک ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا تھا جب میں نے اس سے پیار کیا ہو پھر بھی وہ میرے طرف ایسے بڑھی جیسے، جیسے......''

پاپا کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

میں اور نبیلہ خاموش تھے۔ پاپا نے میرے ماتھے پر پیار کیا۔

''یہ لمبی داستان ہے کہ میں سجو کو کیسے واپس لایا لیکن لے آیا۔ وہ جو مجھے لگتا تھا کہ رعنا کی روح بے چین ہو گئی تھی۔ اپنی بیٹی کی حالت پر تڑپ رہی تھی۔ وہ مجھے حقیقت لگتی تھی، کوئی وہم نہیں۔ میں نے رعنا کی روح سے بہت معافی مانگی۔ اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی بیٹیوں کو کوئی دکھ نہیں دوں گا۔ میں تو سجو کے اس لمحے کا قرض ساری زندگی نہیں چکا سکتا۔ جب پاپا کہتے ہوئے اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے مجھے چھوا تھا۔

بیٹا اب بتاؤ میں کیسے جانتے بوجھتے تمہیں اس کھائی میں گرتے دیکھ سکتا ہوں۔ میں رعنا کو کیا جواب دوں گا۔ میرے دل پر پہلے ہی بہت بوجھ ہیں۔ رعنا سوچتی ہو گی کہ میں نے اس کی بیٹیوں کو کچھ نہیں دیا۔ کوئی ایک خوشی بھی نہیں۔''

میں رو پڑی۔ ''پاپا! جو کچھ آپ نے ہمیں دیا ہے وہ تو کوئی باپ بھی اپنی بیٹیوں کو نہیں

دے سکتا۔ میں کوئی ایسا گھر نہیں جانتی جہاں کسی کے پاپا اپنی بیٹیوں سے اتنی محبت کرتے ہوں۔ وہ کون سا گھر ہوگا جہاں لڑکیاں اس طرح اپنے پاپا سے سب کچھ کہہ دیتی ہوں گی۔ جیسے وہ ان کے دوست بھی ہوں اور راہنما بھی۔ جہاں کوئی کمیونی کیشن گیپ نہیں ہوگا۔ پاپا ایسا گھر صرف ہمارا ہے جہاں ہم تینوں ایک ہی ہیں۔''

نبیلہ نے پاپا کو اٹھانا چاہا۔ ''چلیں پاپا! آئیں آرام کریں۔ آپ تب دل پر بوجھ رکھیں جب ہمیں آپ سے شکوہ ہو۔ آئیں آپ آرام کریں۔''

پاپا سو گئے۔ میں اور نبیلہ ساری رات ان کے قریب بیٹھے رہے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ اپنی اپنی دنیا میں گم۔

☆======☆======☆

صبح میں تیمور کی طرف جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئی۔ نبیلہ پاپا کو چائے دیتے دیتے رک گئی۔

''تم نے اپنا ارادہ نہیں بدلا جو؟''

''نہیں۔ بلکہ میرا ارادہ اور پختہ ہوگیا ہے۔ زندگی اتنی طویل نہیں ہوتی کہ ہم محبتوں کو یوں کھو دیں۔ یہ جہاں ملیں' لے لینی چاہئیں' اپنا دامن بھر لینا چاہیے۔'' پاپا خاموش رہے۔

میں ہنس پڑی۔ ''میں بھی اسی ماں کی بیٹی ہوں جس نے تکلیف اور دکھ برداشت کیے لیکن اپنی زندگی میں جھوٹ اور منافقت کو داخل نہیں ہونے دیا۔''

ناشتا کر کے پاپا اور نبیلہ کو پیار کر کے خدا حافظ کہہ کر میں تیمور کی طرف آگئی۔ وہ میرا ہی منتظر تھا۔ کتنی دیر سے وہ اپنی ممی سے سو جانے کے لیے کہہ رہا تھا جو ساری رات اس کے سرہانے جاگتی رہی تھیں۔ میں آئی تو انہیں کچھ تسلی ہوئی اور مجھے ڈھیر ساری ہدایات دے کر وہ سونے کے لیے چلی گئیں۔

''رات خیریت سے گزری؟''

''ہوں' بس خیریت ہی سمجھو کہ صبح تک زندہ ہوں رات کو کافی درد رہا سر میں۔ ممی بھی بہت پریشان ہوگئی تھیں۔'' پھر اس نے میرا جائزہ لیا۔ ''رات کو روتی رہی ہو یا جاگتی رہی ہو۔ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ تمہاری۔''

''بس یونہی سو نہیں سکی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب بھی فریش ہوں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ممی کو کیسے مطمئن کروں۔ وہ ہر وقت ایک ہی بات سوچتی رہتی ہیں۔''

''میرے پاس ایک ترکیب ہے۔'' رات بھر لگا کر میں نے جو فیصلہ کیا تھا۔ اب میں اسے پورا کرنا چاہتی تھی۔

''کیا ترکیب؟''

''وعدہ کرو اس سے انکار نہیں کرو گے۔ جیسے کہوں گی ویسے کرو گے' بغیر بحث کے۔''

''کہو تو کیا ترکیب ہے۔ میں ممی کو خوش کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''تم مائنڈ مت کرنا لیکن میرے لیے تم کسی بھی فرد سے زیادہ اہم ہو اور ہر بات تمہارے حوالے سے سوچتی ہوں۔ کاش تیمور میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اس سے زیادہ ہوتا جو میں تمہیں دے رہی ہوں' اور دینا چاہتی ہوں۔ کیسی بے بسی ہے یہ۔'' میری آواز کانپنے لگی تھی۔ میں خاموش ہوگئی۔

''کیوں تم نے خود کو اذیت میں مبتلا کیا ہوا ہے جو۔''

''تم میری یہ اذیت کم کر سکتے ہو' پلیز جو میں کہوں اس سے انکار مت کرنا۔''

''کہہ دو جو کچھ کہنا چاہتی ہو۔ کیا مجھ سے بات کرنے کے لیے بھی تمہیں تمہید باندھنے یا میری منت کرنے کی ضرورت ہے۔''

''بہت پہلے میں نے ایک کہانی پڑھی تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''ایک راجکماری کی جس کے ماں باپ نے اس کا نام شیو دیوتا کی بیوی ستی کے نام پر ستی ساوتری رکھا تھا۔ وہ راجکماری ایک راجکمار کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ دونوں اپنی محبت میں سرشار تھے کہ اچانک یم راج' موت کا دیوتا آگیا تا کہ راجکمار کو اپنے ساتھ لے جائے۔ ستی ساوتری نے یم راج کی منت کی کہ وہ راجکمار کو چھوڑ دے۔ یم راج کو ترس آگیا اور اس نے راجکمار کو زندگی کے دو سال دے دیئے۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔

محبت کرنے والوں کے لیے دو سال کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ بس پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ اب کے یم راج کے ساتھ اگنی' آگ کا دیوتا بھی تھا۔ انہوں نے راجکمار کو طلب کیا۔ ستی نے پھر منت کی لیکن اب کے وہ نہ مانے اور راجکمار کو اپنے ساتھ لے چلے۔ محبت کی ماری بیوی ستی ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ وہ ان کی منت کرتی جاتی تھی۔ یم راج نے راجکمار کی جان

کے بدلے اسے بہت کچھ دینے کی کوشش کی لیکن اسے صرف اپنا محبوب شوہر چاہیے تھا۔ بالآخر ایک مقام پر یم راج نے راجکمار کو آگ میں جھونک دیا۔

معلوم ہے راجکماری ستی ساوتری نے کیا کیا؟ وہ اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے آگ میں کود گئی اور وہاں سے اسے زندہ سلامت نکال لائی۔''

تھوڑی دیر تک تیمور مجھے دیکھتا رہا پھر ہنس پڑا۔ ''تم میری خاطر اس آگ میں اترنا چاہتی ہو؟''

''کسی کی خاطر کوئی بھی آگ میں نہیں کودتا۔ میں صرف اپنی محبت کی خاطر اس آگ میں کودنا چاہتی ہوں۔''

''کہانی کہانی ہوتی ہے ورنہ کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ موت کا ایک وقت معین ہے۔ وہ وقت آ جائے تو کسی کی جان نہیں بچا سکتا اور جب تک نہ آئے تب تک کوئی کسی کی جان نہیں لے سکتا۔'' اس نے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتی' میں ہر وقت تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ ایک لمحے کے لیے تمہیں اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی۔ کتنی بے بسی ہوتی ہے جب تمہیں چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں تمہیں موت کے بے رحم پنجوں سے نہیں بچا سکتی لیکن میں تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو مجھے تسلی رہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں تمہیں بچا لوں گی۔ کچھ نہیں ہونے دوں گی تمہیں۔ جب میں تمہارے پاس نہیں ہوتی تو تمہیں کیا خبر کہ کس اذیت سے گزرتی ہوں۔ اپنی تمام تر محبت کے باوجود بھی میں اس وقت بے بس ہو جاتی ہوں۔ جب کوئی سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہے کہ تم تیمور کی کون ہو؟ میں اپنے اور تمہارے تعلق کو کسی رشتے میں بدلنا چاہتی ہوں' اسے کوئی عنوان دینا چاہتی ہوں۔'' میں رو پڑی۔

''سجو! میں اتنا خود غرض کیسے ہو جاؤں۔ میں تمہاری راہیں تاریک نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ افسردہ ہو گیا۔

''پلیز تیمور! میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا۔ پہلی مرتبہ کچھ مانگ رہی ہوں۔ دیکھو وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ دیر مت کرنا کہ پھر ہم دونوں کے ہاتھ چند دن کی خوشیاں بھی نہ آ سکیں۔''

مجھے نہیں خبر تھی کہ اس کی ممی کب آ گئی تھیں۔ شاید سوتے میں انہیں کوئی ڈراؤنا خواب

پھر تیمور کے کمرے تک لے آیا تھا۔ خواب گاہ کا دروازہ کھلا تھا اور ہم دونوں میں سے کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔

''تیمور!'' انہوں نے آواز دی۔

ہم دونوں ہی چونک گئے۔ ہمارا نہیں خیال تھا کہ وہاں ہم دونوں کے علاوہ تیسرا فرد بھی موجود تھا۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آ گئیں۔

''تیمور! سجیلہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔''

وہ ماں تھیں۔ ان کی غرض مجھ سے مختلف تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس وقت وہ میری آواز بن گئی تھیں۔ ڈانٹ' پیار' منت' دھمکی' وہ ہر حربہ آزما کر تیمور کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میرے ساتھ وہ ذہنی سطح پر گفتگو کرتا تھا۔ اپنی ممی کے ساتھ اسے جذباتی سطح پر بات کرنی پڑتی تھی اور یہ کام اس کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا۔ سب سے آسان حل اسے یہ لگتا تھا کہ وقتی طور پر بات ٹال دے لیکن یہ ایسا موضوع تھا کہ وہ ٹلنے پر راضی نہیں تھیں۔

بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس کے لیے اسے کتنی دلیلوں' کتنے آنسوؤں سے قائل کرنا پڑا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔

میں شام کو گھر پہنچی تو تھوڑی ہی دیر بعد تیمور کی ممی کا فون آ گیا۔ وہ اور اس کے پاپا آنا چاہتے تھے۔ وہ کیوں آنا چاہتے تھے' یہ گھر میں سبھی کو معلوم تھا۔

''آپ کسی وقت بھی آ جائیں' جب مناسب سمجھیں۔'' پاپا نے کہا۔

''ہم آج ہی آئیں گے۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ کتنی تیزی سے گزرتا ہے یہ وقت بھی۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔

''جیسے آپ کی مرضی۔''

''آپ برا نہ مانیں تو میں تیمور کو بھی لے آؤں؟ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی گھر میں۔ دیکھ بھال کے لیے نرسیں ہیں' نوکر بھی ہیں لیکن ماں ہوں ناں کسی اور پر اعتبار نہیں ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے اسے نظروں سے اوجھل کرنے کو دل نہیں چاہتا۔''

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔'' پاپا نے کہا۔

میں ایکس ٹینشن پر یہ گفتگو سن رہی تھی۔ فون رکھ کر لاؤنج میں آئی تو نبیلہ رو رہی تھی۔

"آپا اسے منع کرنے کے بجائے آپ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ تو پاگل پن کا شکار ہوگئی ہے۔ آپ کیوں نہیں اسے سمجھاتے۔ وہ اپنی زندگی تباہ کررہی ہے۔"

"اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ آپ چائے وغیرہ کا انتظام کریں۔" انہوں نے کہا۔

مجھے دیکھ کر نبیلہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ کچن میں لے گئی۔

"سجو پلیز' جذباتی فیصلہ مت کرو۔ تمہیں ایک لمحے سکون نہیں ملے گا۔ اس گھر میں۔ ایک مرتے ہوئے شخص کی ذہنی اور جسمانی ضرورتیں پوری کرتے کرتے تم پاگل ہو جاؤ گی۔ پھر وہی نہیں ہے۔ اس کی ماں' نیم پاگل ہو چکی ہے۔ باپ کا بھی پتا نہیں لیکن میں ان کی حالت کا اندازہ کرسکتی ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ جس راستے کا انتخاب تم کررہی ہو وہ کتنا کٹھن ہے۔"

"بیلا! میں سب جانتی ہوں۔ ہر بات کا اندازہ ہے مجھے۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں کہاں تک تیمور کا ساتھ دے پاؤں گی۔ شاید راستے میں ہی سانس پھول جائے اور ہتھیار ڈالنے پڑیں۔ بٹ آئی وانٹ ٹو گواٹ آ ٹرائی۔ محبت تھوڑی ہو یا زیادہ' جب اور جہاں سے ملے لے لینی چاہیے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ ہماری راہیں کوئی بھی ہوں' ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے۔

تم نہیں جانتیں کہ تیمور مجھے کس حد تک چاہتا ہے میرے پاس اسے دینے کے لیے اس ایک خوشی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ کسی صحیفۂ آسمانی میں تحریر نہیں ہے لیکن انسانیت کے ناتے انسانوں پر ایک دوسرے کے لیے یہ قرض ہوتا ہے کہ مرتے ہوئے شخص کی آخری خواہش پوری کی جائے۔ خواہ وہ اپنے ہونٹوں سے اس بات کا اظہار کرے یا نہیں۔ اسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ضروری دینی چاہیے۔"

نبیلہ نے فون کر کے نیلوفر کو بھی بلالیا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ تمہارا فیصلہ اچھا ہے یا برا۔ یہ بھی نہیں پتا کہ اس پر خوشی کا اظہار کروں یا غم کا۔ اتنی ہمت اور اس قدر حوصلہ مجھ میں نہیں ہوسکتا تھا کہ شادی سے قبل ہی مجھے اپنی یقینی ....." وہ چپ ہوگئی۔

شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ "اپنی یقینی بیوگی کا علم ہوتا اور میں پھر بھی یہ بندھن باندھ لیتی۔"

رات کو وہ تینوں آئے۔ پاپا اور نبیلہ نے ان کا استقبال کیا۔ میں اور نیلوفر کچن میں

چائے اور رات کے کھانے کی تیاری کررہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں نبیلہ بھی ہمارے پاس آ گئی۔

"تم بیٹھتیں وہاں' ہم سب کرلیں گے۔" نیلوفر نے ہنڈیا میں چمچ چلاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں بیٹھ سکتی ہوں۔" وہ چڑچڑی ہوگئی تھی۔

اسی وقت تیمور نے کچن میں جھانکا۔

"اس خالص زنانہ مجلس میں حاضر ہونے پر معذرت خواہ ہوں لیکن ڈرائنگ روم میں اتنی رسمی باتیں ہورہی ہیں کہ مجھے ہنسی آرہی ہے۔ لمبی چوڑی تمہیدیں باندھی جارہی ہیں۔ ان اشیاء اور آسائشوں کی فہرست گنوائی جارہی ہے جو صرف ممی کی بہو کا حق ہوگی۔" وہ اندر آ گیا۔

"یہاں کچن میں بہت گرمی ہے۔ تم خوامخواہ اے سی سے اٹھ آئے۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"میں موم کا بنا ہوا نہیں ہوں۔" وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور میرے ہاتھ سے چھری لے لی۔ "لاؤ سلاد میں بنا دیتا ہوں۔"

"کیوں اپنی ممی کے سامنے میرا امپریشن خراب کرتے ہو۔ تمہیں کیا پتا یہ مولیاں گاجریں کیسے کاٹتے ہیں۔ کوئی چھوٹی کاٹ دو گے اور کوئی موٹی۔ واپس کرو مجھے چھری۔" میں نے پلیٹ اپنی طرف سرکالی۔

"یہ کون سا مشکل کام کررہی ہو تم۔ ان مولیوں گاجروں کے پھول اور موم بتیاں وغیرہ میں بھی بنا سکتا ہوں چاہو تو آزمالو۔" پھر خود ہی اس نے سلاد کو تختۂ مشق بنانا شروع کیا۔

میں کچھ اور سلاد لے آئی اور دوسری چھری لے کر پھر مولیوں کے پھول بنانے لگی۔

"آج تم ممی کو دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔" اس نے کہا۔

"کیوں' کیا ہوا؟"

"میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ نے اسی حلیے میں وہاں جانا ہے تو رہنے دیں۔ سجیلہ اور اس کے گھر والے بہت باذوق ہیں' کیا معلوم سجو یہ ساس قبول کرنے سے ہی انکار کر دے۔ خوامخواہ ہاتھ ملتی رہ جائیں گی آپ۔ بس اس دھمکی نے کام کر دکھایا۔ ملازماؤں کی پریڈ شروع ہوئی۔ بلا مبالغہ پندرہ جوڑے استری کروائے گئے۔ جیولری کا انتخاب کیا گیا۔ بال

بنوائے گئے۔ پھر مجھ سے فائنلی ان پندرہ میں سے ایک سوٹ منتخب کروایا گیا۔ اس کے ساتھ جیولری' میک اپ اور وہ سب کچھ جو ممی کی شخصیت کا حصہ تھا' واپس آ گیا۔"

میں ہنس پڑی۔ "بہت زوردار دھمکی تھی۔ میرے ہی کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی تھی تم نے؟ اب کل میں تمہاری طرف آؤں گی تو میری خیر نہیں۔ پھر خود ہی بچانا مجھے۔"

ہم باتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ نیلوفر بھی لقمے دیتی جا رہی تھی لیکن نبیلہ خاموشی سے کام میں مصروف تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس روز میں بہت خوش تھی یا بہت اداس۔ جب اس نے میری انگلی میں ہیرے کی وہ بے حد خوبصورت انگوٹھی ڈالی تو میرے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔

"اللہ میاں' پلیز تیمور کو لمبی زندگی دینا۔ تُو چاہے تو میری زندگی کے سب برس' سب لمحے اسے دے دے' آج' ابھی' اسی وقت لیکن میرے تیمور کو بچا لے میں اسے پل پل موت کے قریب ہوتے کیسے دیکھ پاؤں گی۔"

میرے اندر اس وقت جو طوفان اُٹھ رہے تھے باہر میں نے کسی کو ان کی خبر نہیں ہونے دی۔ تیمور بہت خوش تھا اور میں بس اسے اسی طرح خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی وہ ہنسی جو مجھے بہت عزیز تھی۔ میری سماعت میں رس گھول رہی تھی۔ اس کی ممی بھی بے انتہا خوش تھیں۔ تیمور نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ خاصے اہتمام سے تیار ہوئی تھیں لیکن ان کے چہرے پر نہ وہ پہلے والی رونق تھی اور نہ اطمینان۔ امارت نے ان کی آنکھوں میں جو چمک بھر رکھی تھی' وہ تو اسی دن ختم ہو گئی تھی جب انہیں احساس ہوا تھا کہ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ اپنے بیٹے کی زندگی نہیں خرید سکتیں۔

اگلے جمعہ کو ہمارا نکاح تھا۔ اتنی جلدی دھوم دھام سے کوئی تقریب منعقد کرنا تو ممکن نہیں تھا لیکن پاپا نے پھر بھی کافی اہتمام کیا تھا۔ اس کی ممی نے بھی پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ تیمور کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کر سکتی تھیں۔ مجھے اتنی دھوم دھام کی خواہش نہیں تھی لیکن اس معاملے میں مَیں نے تعرض نہیں کیا۔ میں اسی طرح صبح سے شام تک کا وقت تیمور کے ساتھ گزارا کرتی تھی۔

جمعہ کو صبح کے وقت ہمارا نکاح ہوا اور رات کو جم خانہ میں رخصتی کا انتظام تھا۔ اتنے کم وقت میں عروسی جوڑا بننا ممکن نہیں تھا' نہ ہی میں نے اس سلسلے میں کوئی دلچسپی لی تھی۔ اس

وقت جو بھاری کام والا سرخ غرارہ میں نے پہنا تھا' وہ میری ساس کا تھا۔ وہ اب تک بہت اسمارٹ تھیں اور مجھے ان کا کوئی بھی جوڑا پورا آ سکتا تھا۔ زیوروں کے بھاری سیٹ بھی سب انہی کے تھے۔ انہوں نے جہیز کے نام پر ایک تنکا تک لینے سے انکار کر دیا تھا۔

تیمور کے پہلو میں بیٹھی میں سوچ رہی تھی کہ منگنی سے شادی کے درمیان جو چند دن کا عرصہ تھا۔ اس میں مجھ پر کتنا دباؤ رہا تھا۔ ہر کوئی جیسے بھاگا چلا آ رہا تھا۔

"تم جانتی ہو اس کی میڈیکل رپورٹس کیا کہہ رہی ہیں۔ اس کی فزیکل کنڈیشن کیا ہے پھر بھی شادی کر رہی ہو۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔"

"خواہ مخواہ کا پاگل پن۔" سہیلیاں کہتیں۔ "جوتُو تو بہت Cool تھی' کب سے اتنی سینٹی مینٹل ہو گئی۔ اس پاگل پن سے باہر نکل آ۔"

"ہاں ایسا ہی شادی کا شوق ہے تو ہم پر چھوڑ دے مسٹر رائٹ کی تلاش۔ مانا کہ وہ بہت ہینڈسم ہے لیکن ہم بھی خاص بندہ ڈھونڈیں گے تیرے لیے۔ دیکھنا سب کی آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی۔"

ان سے مجھے کوئی شکوہ نہیں تھا جنہوں نے اسے پاگل پن سمجھا تھا لیکن وہ جو دبے دبے لفظوں میں سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے۔

"دولت مند جوان بیوہ کی اپنی ہی حیثیت ہوتی ہے۔ بہت اونچا ہاتھ مارا ہے۔ خوب فائدہ اُٹھایا ان بے چاروں کے جذبات کا۔"

اور میں سوچتی تھی کہ یہ سب کتنے بے حس لوگ ہیں۔ کل تک ان کی نگاہیں میرے انتخاب پر خیرہ ہو رہی تھیں اور آج اچانک جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔ یہ محبت کتنی بے وقعت چیز ہوتی ہے جسے ہر روز کپڑوں کی تبدیلی کے ساتھ بدل دیا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی کی وہاں تک رسائی ہی نہیں تھی۔ جہاں میرے اور تیمور کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔

لوگ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے۔ میں مطمئن تھی۔ اپنے اس قدم پر نہ مجھے ملال تھا نہ افسوس' نہ پچھتاوا۔ یہ مجھے کرنا ہی تھا' چاہے حالات کیسے بھی ہوتے۔ تیمور ٹھیک اور صحت مند ہوتا تب بھی یہ شادی ایک جوا ہوتی' اب بیمار تھا تب بھی ایک جوا ہی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں اسے ایک عام شادی کی طرح لینا چاہتی تھی' صرف یہی ایک صورت تھی کہ میں اور تیمور ہم دونوں خوش رہتے۔

تیمور نہیں چاہتا تھا کہ یہ شادی ہو۔ اس لیے نہیں کہ یہ اس کی خواہش نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس کے خیال میں یہ میری زندگی اور مستقبل تباہ کرنے کے مترادف ہوتا لیکن اب جب ہم اس بندھن میں بندھ گئے تھے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ عمومی حالات میں وہ صرف اپنے بہت قریبی لوگوں کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ باقی سب کے سامنے اپنے محسوسات چھپالیا کرتا تھا۔ مگر آج اسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک ایک لمحے کی خوشی اپنے اندر اُتار رہا تھا۔ نبیلہ اور میری سہیلیوں نے جتنی رسمیں کیں، وہ ایک ایک رسم سے لطف اندوز ہوا۔

ہم گھر پہنچے تو اس کی خواب گاہ بہت خوبصورتی سے سجی ہوئی تھی۔ اس کی ممی نے مجھے پیار کے ساتھ وہاں لا بٹھایا۔

"تھک تو نہیں گئیں؟ بھاری کپڑوں اور زیوروں میں گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی؟ کسی چیز کے لیے دل تو نہیں چاہ رہا؟"

وہ بار بار یہ اور ایسے کتنے سوال پوچھ رہی تھیں ان کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ ان کا مجھ سے عجیب تعلق تھا۔ پہلی مرتبہ مجھ سے ملنے کے بعد وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ اپنی بہو میں جو صفات وہ دیکھنا چاہتی تھیں ان میں سے بیشتر مجھ میں موجود نہیں تھیں، وہ تیمور کو میری طرف بڑھنے سے باز رکھنا چاہتی تھیں۔

اور اب حالات کے پیش نظر انہیں مجھے بہو بنانا پڑا تھا۔ اب بھی میرے متعلق ان کی سوچ نہیں بدلی تھی۔ وہ بے بس ہو گئی تھیں۔ اپنے بیٹے کی بیماری کے ہاتھوں۔ یہ صرف ان کی غرض تھی۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں تھی۔ مجھے انہوں نے وہ دوا یا ٹانک سمجھا تھا جو ان کے بیٹے کے لیے ضروری تھا، یا وہ کھلونا جو اسے خوشی دے سکتا تھا، یا پھر صرف ایک حرف تسلی۔ جونہی ان کا یہ مفاد ختم ہوتا۔ میری حیثیت صفر ہو جاتی۔ وہ مجھ سے اسی قدر محبت کرتی تھیں۔ جتنی کسی بھی Life Saving Drug سے کی جاتی ہے۔ میں جانتی تھی کہ ابھی میں نے تیمور کے سلسلے میں ان کی کسی ایک ہدایت کی بھی خلاف ورزی کی تو ایک لمحے میں ان کے لہجے کی مٹھاس تلوار کی دھار بن جائے گی۔

میں سوچ رہی تھی کہ ان کے مزاج کے مطابق چلنا کتنا مشکل کام ہو گا۔ وہ اپنے بیٹے کو پل بھر کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ایسے میں کتنے لمحے ہوتے جو

صرف میرے اور تیمور کے ہوتے۔

ان مشکلات کے متعلق پہلے بھی اسی کمرے میں بیٹھ کر میں نے کئی مرتبہ سوچا تھا۔ تیمور کی ممی کا رویہ اب میرے لیے حیران کن امر نہیں تھا۔ یہ سب باتیں میں اتنے دن میں جان چکی تھی۔ صبح سے شام، جب تک میں وہاں رہتی تھی۔ بمشکل دو ڈھائی گھنٹے وہ ہم سے الگ ہوتی تھیں۔ جب وہ زبردستی انہیں سونے کے لیے بھجواتا تھا، اس کے بعد کوئی ڈراؤنا خواب انہیں بیدار کر دیتا تھا اور وہ ننگے پاؤں ہی تیمور کے لیے بھاگی آتی تھیں۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہی تھا۔

لیکن آج نہ جانے کیا ہوا تھا۔ شاید ایک نئے بندھن میں بندھ کر جب میں کمرے میں رکھے صوفے سے اُٹھ کر تیمور کے بیڈ پر آ بیٹھی تھی تو مجھے ان مشکلات کا اندازہ پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے ہونے لگا تھا۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ میں ان مسائل سے کیسے نمٹوں گی۔ اب تک میرے ذہن میں اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں آئی تھی کہ میں سب مشکلوں پر قابو پاؤں گی کیسے؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔

صرف صبر کے ساتھ میں نے سوچا تھا۔ پھر خود ہی ہنسی آ گئی۔

"صبر؟ آخر کتنا صبر؟ کوئی افسانہ یا فلم تو ہے نہیں کہ پچیس صفحوں یا تین گھنٹوں کے بعد حد آ جائے اور کردار اپنے صبر کے ساتھ سرخرو ہو سکیں۔ سچائی کا بول بالا اور برائی کا منہ کالا ہو، صبر کرنے والوں کو اس کا میٹھا پھل مل جائے۔ میں جلد باز نہیں۔ صبر میں بھی کرتی ہوں لیکن کہیں کسی وقت انسان اپنی پریشانی میں تنگ بھی پڑ جاتا ہے۔ چڑچڑا بھی ہو جاتا ہے۔ اسے غصہ بھی آ جاتا ہے۔ وہ خود ترسی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ کبھی غم سے کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ کتنے سارے جذبے ایک انسان کے اندر بیک وقت پرورش پاتے ہیں۔ بہت کٹھن امتحان ہے یہ۔ میں اس میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہوں، یہ تو میرا اللہ ہی جانتا ہے لیکن میرے لبوں پر ایک ہی دعا ہے۔ یا اللہ مجھے اس امتحان میں سرخرو کرنا۔ میرے سہاگ، میرے تیمور کو سلامت رکھنا۔ بس اس زندگی سے اس سے زیادہ کی تمنا نہیں ہے۔"

"آج میں اتنا خوش ہوں کہ کیا بتاؤں۔ وہ سب جو میں نے تم سے کہنے کے لیے سوچا تھا۔ ایک پل میں بھول گیا ہوں۔ جب لکھتا یا بولتا تھا تو خود کو لفظوں کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ آج اس وقت اس کے علاوہ کوئی بات ذہن میں نہیں ہے کہ میں بے انتہا خوش ہوں۔ بہت خود

غرض ہوں ناں میں تجو۔ میری خوشی جتنی بڑھتی جاتی ہے یہ احساس بھی اتنا ہی قوی ہوتا جاتا ہے کہ میں نے صرف اپنے متعلق سوچا۔ صرف اپنی خوشی اور اپنی غرض کی پروا کی کیا میرا حق تھا اس قربانی پر جو تم نے میری خاطر دی ہے؟'' تیمور نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

''نہیں تیمور! ہم میں سے کسی کا ایک دوسرے پر اتنا حق نہیں ہوتا کہ قربانی طلب کریں' نہ ہی ہم میں سے کوئی اتنا مہان دیوتا ہوتا ہے کہ کسی کے لیے قربانی دے۔ میں نے کوئی قربانی نہیں دی' نہ ہی میں قربانیاں دینے کی قائل ہوں۔ ہم دونوں نے بہت پہلے پلان کیا تھا کہ ہم شادی کریں گے۔ مجھے ایسا ہی کرنا تھا اور میں نے اسی طرح کیا۔ اس شادی کو بھی عام شادی کی طرح ٹریٹ کرنا چاہتی ہوں اور ایسا ہی کروں گی بھی۔

تم خوش ہو تو یہ کوئی خود غرضی نہیں ہے۔ خود غرض تو تب ہوتے جب اپنی خوشی کی خاطر تم نے مجھے اس شادی پر مجبور کیا ہوتا۔ جب ایسا نہیں ہے تو پھر کیسی خود غرضی؟ پلیز پھر کوئی ایسی بات مت کرنا میں نہیں چاہتی کہ ہم دونوں خود پر اور ایک دوسرے پر ترس کھا کھا کر یا اپنے اور ایک دوسرے کے حوالے سے اس بارے میں صفائیاں پیش کر کے وقت برباد کریں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ہمارے پاس زیادہ بہتر اور اہم باتیں ہیں کرنے کے لیے۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''مثلاً یہ کہ آج تم بہت حسین لگ رہی ہو۔ تمہارے گال کے اس تل پر ثمر قند و بخارا بھی قربان کیا جا سکتا ہے اور۔''

میں اس کے قصیدوں پر ہنسے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میرے ذہن پر جو سوچیں اور فکریں سوار تھیں' وہ سب کہیں تحلیل ہو گئی تھیں۔ ہم دونوں خوش تھے' بہت خوش۔

اسی وقت میری آنکھ لگی تھی کہ انٹر کام کا بزر بج اُٹھا۔ ایک دم میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سمجھ ہی نہ سکی یہ کیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر بے اختیار گہری نیند سوئے تیمور پر پڑی۔ اسے خیریت سے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ میں تیزی سے اٹھی۔ مجھے ڈر تھا کہ تیمور ڈسٹرب ہو گا۔

''جی!'' میں نے کہا۔

''نبیلہ! تیمور ٹھیک ہے ناں؟'' اس کی ممی نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

''جی آنٹی! سو رہا ہے۔''

''کیا کر رہی ہو' انہیں پریشان مت کرو۔'' پیچھے سے اس کے پاپا کی مدھم سی آواز

اُبھری۔

''چھوڑو' مجھے پتا کرنے دو۔'' وہ اس کے پاپا کے ساتھ اُلجھ رہی تھیں پھر عجلت میں مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''نبیلہ پھر دیکھو' اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ۔''

''آنٹی! وہ بالکل ٹھیک ہے' خیریت سے ہے اور اطمینان سے سو رہا ہے۔'' میں نے بہت رسان کے ساتھ انہیں تسلی دی۔

میں سمجھ سکتی تھی کہ ان کے دل کی کیا حالت تھی۔

''تم یونہی کہہ رہی ہو دیکھے بغیر۔ تم نے قریب جا کر اسے نہیں دیکھا۔ کیسی بیوی ہو تم اتنا سا خیال نہیں رکھ سکتیں اس کا۔ تمہارا کیا بگڑے گا اگر اسے کچھ ہو گیا' تکلیف تو مجھے ہی ہو گی ناں میں خود آ رہی ہوں اس کے پاس تم اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔'' وہ پھر ہسٹیرک ہو رہی تھیں۔

''پاگل ہوئی ہو تم۔'' انکل نے کہا اور انٹر کام بند ہو گیا۔ شاید انہوں نے ممی کے ہاتھ سے چھین کر واپس رکھ دیا تھا۔

میں دوبارہ بستر پر لیٹ گئی لیکن نیند آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ دل پر پھر وہ بوجھ آ پڑا تھا۔ جو تیمور کی محبت نے کہیں تحلیل کر دیا تھا۔ سوچ کے دروازے کھلے تو رخصتی کا منظر آنکھوں میں اُبھر آیا۔ وہ پاپا کا میرے ماتھے کو بوسہ دے کر کہنا۔

''اللہ نگہبان ہو۔''

اور نبیلہ کی آنکھوں میں تیرتے آنسو جو مجھے گلے لگاتے وقت سب بند توڑ کر اس طرح باہر نکلے کہ پھر رو کے نہ رکے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری رخصتی پر نہیں بیوگی پر آنسو بہا رہی ہو۔

میں نے ایک نگاہ قریب سوئے تیمور پر ڈالی۔ ''اللہ میاں جی! یہ کیسی دنیا ہے تیری۔ خود ہی اتنے چاند سے چہرے اتارتا ہے اور خود ہی انہیں ان کے پیاروں سے جدا بھی کر دیتا ہے۔ کیسے کیسے دل چھلنی کرتا ہے۔ کیا ایسا تو نے میرے تیمور کے ساتھ ہی کرنا تھا؟ میں نہیں جانتی کہ تیمور نہ ہوتا تو کون ہوتا میں بہت خود غرض ہوں۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر میرا تیمور ہی کیوں؟ کیا تیری اس دنیا میں کوئی معجزہ ممکن نہیں؟'' میرے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔

جب یہ سوچتی تھی تو خود پر قابو نہیں رہتا تھا۔ بعض اوقات اپنے کمرے کے بند

دروازے کے پیچھے میں آواز سے بھی رو پڑتی تھی لیکن آج تیمور میرے اتنے قریب تھا کہ مجھے اپنی چیخیں اور سسکیاں اپنے اندر ہی دفن کرنی تھیں۔ ہونٹوں سے ایک سسکی' ایک آہ نکالے بغیر میں آنسو بہاتی رہی۔

ایک مرتبہ پھر رات کے سکوت کو انٹرکام کی بزر نے توڑا۔ میں تیزی سے اٹھی۔

''جی!۔''

''تیمور ٹھیک ہے؟'' اس کی ممی نے سرگوشی میں پوچھا۔

''جی آنٹی! بالکل ٹھیک ہے' آرام سے سو رہا ہے۔'' میں نے اپنی آواز پر قابو پانا چاہا کہ کہیں اس میں آنسوؤں کی نمی شامل نہ ہو جائے۔

لیکن نہ جانے کیسے انہیں اندازہ ہو گیا۔ وہ جو مدہم آواز میں مجھ سے مخاطب تھیں کہ کہیں اس کے پاپا کو خبر نہ ہو جائے' ایک دم چلانے لگیں۔

''کیا ہوا؟ تم رو رہی ہو؟ کیا ہوا میرے بیٹے کو۔ کیا ہوا میرے تیمور کو؟ کیوں رو رہی ہو تم؟ میں' میں ابھی آ رہی ہوں۔'' ان کی آواز میں اندیشے ہی اندیشے تھے' خوف ہی خوف تھا۔

''آنٹی! کچھ نہیں ہوا۔ سنیں پلیز' کچھ نہیں ہوا تیمور کو۔'' میں نے کہا لیکن دوسری طرف انٹرکام بند ہو چکا تھا۔

میں پریشان تھی۔ ''وہ ابھی یہاں آ جائیں گی۔ کتنا مشکل ہو گا انہیں سنبھالنا۔ تیمور کس قدر ڈسٹرب ہو گا' اتنی ٹینشن میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی تو کیا ہو گا۔''

میں منتظر رہی لیکن وہ نہیں آئیں۔ شاید تیمور کے پاپا نے انہیں روک لیا تھا۔

صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی اور میں نیند سے بے حال ہو رہی تھی پھر بھی سونا نہیں چاہتی تھی۔ تیمور کی ممی نے میرے دل میں وہم ڈال دیا تھا۔ دلہن بن کر بیٹھے رہنے کی اپنی ایک تھکن ہوتی ہے۔ ابھی میں نیند کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی والی تھی کہ ایک مرتبہ پھر بزر بجنے لگا۔

''جی۔'' میں پھر الرٹ ہو گئی۔

''تیمور ٹھیک ہے؟'' پھر وہی سوال۔ لہجہ سرگوشیانہ۔

میں نے اپنی آواز حتی الامکان خوشگوار بنائی تاکہ انہیں کوئی وہم نہ ہو۔ ''جی آنٹی بالکل ٹھیک ہے۔ سکون سے سو رہا ہے۔''

''پلیز بجیلہ! میں آ کر ایک نظر اسے دیکھ لوں؟'' ان کے لہجے میں منت تھی۔ ''میں خود نہیں دیکھوں گی تو مجھے تسلی نہیں ہو گی۔ تیمور کے پاپا مجھے آنے نہیں دے رہے۔ اب سوئے ہیں تو پلیز مجھے آنے دو۔ انہیں مت بتانا۔''

ایسے منت بھرے لہجے کے بعد میرا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ یوں بھی یہ ایک ماں کا حق تھا' میری اجازت کیا معنی رکھتی تھی۔

وہ خاموشی سے آئیں اور مجھے نظرانداز کر کے تیمور کے پاس بستر پر بیٹھ گئیں۔ اس کے ماتھے پر پیار کیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ میں کھڑی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جلدی چلی جائیں گی لیکن وہ بیٹھی رہیں تو میں نے اپنے لیے صوفہ کھسکا کر بستر کے قریب رکھ دیا اور خود اس پر بیٹھ گئی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کوئی بات چیت چہل پہل نہیں تھی۔ تھکن الگ تھی۔ نتیجہ یہ کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کی ممی کے نزدیک یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔ ان کی کڑک دار آواز نے میری آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔

''سو رہی ہو تم؟ یہ محبت ہے تمہیں اپنے شوہر سے۔ بیویاں ایسی ہوتی ہیں؟ تمہیں اپنی نیند پیاری ہے اس سے کیا غرض کہ تیمور کا کیا حال ہے۔ تم پر کیا اعتبار کروں میں۔ تم پڑی سوتی رہو گی کسی دن یونہی اور ــــ میرا بچہ تڑپتا رہے گا۔''

اس چیخ پکار سے تیمور کی آنکھ بھی کھل گئی۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ پایا کہ ہوا کیا تھا۔ جب حالات کا کچھ اندازہ ہوا تو اس نے اپنی ممی کو روکنے کی کوشش کی جو مسلسل مجھے ڈانٹ رہی تھیں۔

''ممی' دیکھ لیں میں بالکل ٹھیک ہوں' کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ پلیز ممی بس کریں۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔''

وہ آرام سے انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کچھ سننے پر تیار نہیں تھیں۔ میں خاموش کھڑی تھی۔ بولتی بھی تو کیا بولتی۔

اچانک ہی تیمور کا صبر جواب دے گیا۔ ''ممی! بس کریں اب بہت ہو گیا۔ آپ بلاوجہ ڈانٹ رہی ہیں بجو کو۔'' سمجھانے والے انداز کی جگہ جھلاہٹ نے لے لی۔ لہجے کی نرمی سختی میں بدل گئی۔

اس کی آواز بلند ہوئی تھی تو ممی خاموش ہو گئی تھیں۔ پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف

دیکھ رہی تھیں۔ وہ خاموش ہوا تو رونے لگیں۔

"ابھی تو پورا ایک دن بھی نہیں ہوا شادی کو کہ اس لڑکی نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔ پہلے بھی اسی کی وجہ سے مجھ سے لڑا تھا۔ آج بھی اسی کی وجہ سے مجھے ڈانٹ دیا۔"

میں عجیب مصیبت میں گرفتار تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ سر کسی دیوار سے سر پھوڑ لوں۔

"ممی! خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔" تیمور کی جھلاہٹ بڑھ رہی تھی۔

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس کی ممی تمام تر الزام میرے سر دھر رہی تھیں۔ بہت ہمت کر کے میں آگے بڑھی تیمور کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ مزید کچھ نہ بولے اور اس کی ممی کو خود سے لپٹا لیا۔

"پلیز آنٹی! مت روئیں۔ آئی ایم سوری' میرا قصور تھا۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ پلیز آنٹی۔"

وہ مجھ سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگیں۔

"میں کوئی اس کا برا چاہتی ہوں؟ بتاؤ؟ تم سو جاؤ اور اسے کچھ ہو جائے تو کیا ہو گا؟"

میں نے تیمور کو اشارہ کیا۔

"آئی ایم سوری ممی! میں بھلا آپ کو ڈانٹ سکتا ہوں؟ اچھی بھلی نیند ٹوٹ گئی تھی' اس لیے جھلا گیا۔ پلیز آپ مت روئیں۔"

بڑی مشکلوں سے ہم نے انہیں چپ کرایا۔ اس دوران بھی وہ مسلسل مجھ سے شکوے شکایات کرتی رہیں۔ میں خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔

"تم سو جاؤ بیٹا! میں ہوں تمہارے پاس ہی۔" انہوں نے پھر تیمور سے محبت سے کہا۔

تیمور نے میرے تھکن زدہ چہرے اور سرخ آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کا مجھ سے اظہار ہمدردی کرنا' یا مجھے سو جانے کے لیے کہنا گویا پھر زلزلہ لانے کے مترادف تھا۔ سو خاموش ہو گیا۔

اس شور شرابے اور ہنگامے کے صرف چند منٹ بعد ہی تیمور کے پاپا اس کی ممی کو لینے کے لیے آ گئے لیکن یہ چند منٹ گزارنے میرے لیے عذاب ہو گئے تھے۔ تیمور کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ مسلسل یہ ثابت کر رہی تھیں کہ میں ایک نالائق بیوی تھی جسے اپنے شوہر کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں تھا۔ ساتھ ساتھ وہ مختلف ہدایات بھی جاری کر رہی تھیں۔ میرا تھکن

اور نیند سے برا حال تھا۔ ان کے الفاظ میرے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ میں پوری آنکھیں کھولے بیٹھی بند ہوتی پلکوں اور جمائیوں کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑ رہی تھی۔

چند منٹ بعد اس کے پاپا آئے اور ان کے چہرے پر شرمندگی واضح طور پر تحریر تھی۔ میری طرف معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھ کر وہ ممی سے مخاطب ہوئے۔

"تم سوئی نہیں ہو' تھک جاؤ گی۔ تھوڑی دیر آرام کر لو۔"

"میں آرام کروں گی تو تیمور کا خیال کون رکھے گا۔"

"اب ماشاء اللہ اتنی اچھی بیوی آ گئی ہے تیمور کی۔ اس کے ہوتے ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" انہوں نے بازو سے پکڑ کر ممی کو اُٹھانا چاہا۔

"ہونہہ! اچھی بیوی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سو رہی تھی' تیمور کو کچھ ہو جاتا تو؟" انہوں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اگلے پانچ منٹ تک ان خدشات پر روشنی ڈالی جو میری کوتاہی کے باعث حادثات بن سکتے تھے۔

تیمور کچھ کہنے لگا تھا کہ میں نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ ان کے ساتھ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور بلاوجہ کی بے نتیجہ بحث میری برداشت سے ہمیشہ ہی باہر رہی تھی۔

"ابھی تمہیں اتنا بڑا فنکشن کنڈکٹ کرنا ہے شام کو۔ آرام نہیں کرو گی تو یہ تمام ارینج منٹس کیسے کر پاؤ گی۔ باقی سب کی تو خیر ہے لیکن تمہارے سب سسرالی رشتے دار خوش ہوں گے کہ تم اکلوتے بیٹے کے ولیمے کا کوئی اچھا انتظام نہیں کر سکیں۔" اس کے پاپا نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"نیلوفر کی امی کے دل کی کلی ضرور کھلے گی۔ پھوپھو تو جتا بھی دیں گی لیکن خیر' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک فنکشن انہی کے گھروں کے جیسا عام سا ہو جائے تو انہیں باتیں نہیں بنانا چاہئیں۔ بہرحال اپنی اپنی عادت کی بات ہے۔" تیمور نے مسکراہٹ دباتے ہوئے انہیں اکسایا۔

تیمور کی ممی پریشان ہو گئیں۔ یہ رسی جل گئی تھی پر بل نہیں گیا تھا۔ انہیں کہاں گوارا تھا کہ ایسے کسی مقام پر ان کی سبکی ہوتی۔

''پھر میں کیا کروں؟ ایک تو اس گھر میں کوئی شخص کسی کام کا نہیں ہے۔ ہر کام کے لیے مجھے ہی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے ہی اپنی جان مارنی پڑتی ہے۔ نہ نوکر کسی کام کے ہیں' نہ یہ دونوں نرسیں اور اب بہو بھی۔''

''ابھی تیمور کی طبیعت ٹھیک ہی ہے۔ تم تھوڑی دیر آرام کرلو۔ تم نہیں دیکھ بھال کروگی تو شام کا فنکشن بالکل تباہ ہو جائے گا۔''

بہلا پھسلا کر اس کے پاپا انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ تیمور نے میری طرف دیکھا۔

''اوہ سجو! آئی ایم سوری۔ ممی کی طرف سے میں تم سے سوری کرتا ہوں۔ کیا کروں میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی باتوں کو نظرانداز کر کے میں بستر پر گر گئی۔

''بعد میں تیمور میں تم سے لڑوں گی بھی اور تمہاری صفائیاں بھی سنوں گی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی مجھے سونا ہے۔''

ایک لمحے میں ہی میں نیند کی وادیوں میں اُتر گئی۔

یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ دن میں تیمور کی ممی نیند کی گولی لے کر کافی نیند پوری کر لیتی تھیں اور رات کو کبھی انٹر کام پر بار بار تیمور کے متعلق پوچھتی تھیں اور کبھی خود آ جاتی تھیں۔ ان کے آنے کے بعد میرے سو جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلی ہی رات کے اس سلسلے میں مجھے کافی سبق مل گیا تھا۔ ان کے ہوتے تو میں جماہی تک نہیں لے سکتی تھی۔ صبح انہیں زبردستی نیند کی گولی دے کر سلایا جاتا۔ ایک آدھ دن تو چل گیا تھا لیکن ظاہر ہے' ہر روز تیمور کے جاگ جانے کے بعد میرا سونا ممکن نہیں تھا۔ وہ سونے کے لیے کہتا رہتا تھا مگر میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اس کی ممی کے جاگنے کے دوران تو ہم کہیں باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ سو جب وہ سو جاتی تھیں تو ہمیں کچھ آزادی نصیب ہوتی تھی۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ہم کبھی پاپا کی طرف چلے جاتے تھے اور کبھی ڈرائیو پر نکل جاتے تھے۔

ایسے میں بھی میرا دل زور زور سے دھڑکتا رہتا تھا۔

''اگر تیمور کی ممی اُٹھ گئیں اور انہوں نے ہمیں وہاں موجود نہیں پایا تو کیا ہوگا؟''

اب ایسے میں ساتھ گھومنے پھرنے کا خاک مزا آتا تھا۔

شادی کے بعد میں میکے رہنے بھی نہیں گئی تھی۔ کتنا دل چاہ رہا تھا کہ تیمور کی ممی کی نگاہوں سے دور کچھ دن ہم پاپا کی طرف گزاریں اور جب نبیلہ نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا تو کتنا دل مار کر کہنا پڑا تھا۔

''تیمور کی ممی پریشان ہو جاتی ہیں' اس لیے بہت مشکل ہے ہمارا یوں رہنے کے لیے آنا۔ ویسے ان شاء اللہ آتے جاتے رہیں گے۔''

اور میں جو اسے ایک عام شادی کی طرح ٹریٹ کرنا چاہتی تھی کہ اس شادی کے قائم رہنے کی یہی ایک صورت تھی' اب حیران بھی تھی اور پریشان بھی کہ ایسے حالات میں کیا کروں۔ ایک تو مسلسل تیمور کی فکر ستائے جاتی تھی' اس کے چہرے پر تکلیف کی ایک لکیر بھی ابھرتی تو میری بے قراری کی انتہا نہیں رہتی تھی۔ اس کی ممی بھی ہر وقت میرے اعصاب پر سوار رہتی تھیں۔ خود میرا دل یہ سوچ کر ہی غم سے پھٹنے لگتا تھا۔ تیمور بس چند دن کا مہمان ہے۔

مجھ میں بہت حوصلہ اور بہت صبر تھا' لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں ایک عام انسان تھی۔ تمام کجیوں اور خامیوں کے ساتھ' اس لیے کبھی کبھار بہت چڑچڑی ہو جاتی تھی' جھنجھلا جاتی تھی۔ کسی اور پر کہاں بس چلتا تھا۔ کبھی گھر کے نوکروں کی شامت آتی اور کبھی تیمور کی دیکھ بھال کرنے والی نرسوں کی۔ بعد میں مجھے خود افسوس ہوتا تھا' یہ بھی احساس تھا کہ میں دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی ہوں اور صبر کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہے' مگر کوشش کے باوجود بھی میں اپنی ان خامیوں پر قابو پانے میں ناکام تھی۔

ہاں' تیمور اور اس کے والدین کے ساتھ میں بہت حوصلے اور صبر کا مظاہرہ کرتی تھی' اس کی ممی خواہ کچھ کہہ دیتیں میں خاموشی کے ساتھ نہ صرف برداشت کرتی تھی بلکہ غلطی نہ ہونے کے باوجود بھی خود ہی سوری کرتی تھی۔ خود چاہے تھکن' نیند' ذہنی کوفت اور پریشانی سے کتنا ہی برا حال ہوتا تھا' مگر تیمور کے لیے ہر دم مستعد۔

اس ایک مہینے میں صحت کی طرف سے تیمور کے سلسلے میں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھار سر میں درد بڑھ جاتا تھا' لیکن وہ اتنا شدید نہیں ہوتا تھا' جتنا کہ عموماً برین ٹیومر میں ہوا کرتا ہے۔ تیمور کی ممی نے بتایا تھا کہ ایسے میں درد کی شدت اس قدر بڑھ جاتی تھی' کہ اس کے لیے برداشت کرنا محال ہو جاتا تھا۔ میں دل ہی دل میں خوفزدہ تھی اور دعا مانگتی رہتی تھی کہ اللہ میاں اسے کبھی اس طرح کوئی تکلیف نہ برداشت کرنی پڑے۔

تیمور کے پاپا سے اس دوران میری خاصی دوستی ہوگئی تھی' وہ بہت اچھے تھے۔ میرا خیال بھی بہت رکھتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ میں کن پریشانیوں میں گھری ہوئی تھی۔ ساتھ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ممی کی موجودگی میں ہم گھر سے باہر تک نہیں نکل سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس روز ڈنر کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''تم لوگ ہر وقت گھر میں کیوں بند رہتے ہو؟ بھئی باہر نکل کر گھوما پھرا کرو۔''

میرا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ پہلے ہی مجھے یہ سوچ کر الجھن ہو رہی تھی کہ ساری رات بھر انٹر کام بجتا رہے گا یا ممی خود چلی آئیں گی' اوپر سے اس وقت ممی کی موجودگی میں انہوں نے وہ بات کر دی تھی جس کے بعد آتش فشاں پھٹنا ضروری تھا۔

میں خاموشی سے سر جھکا کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ایسے وقت میں چپ رہنے میں ہی عافیت تھی۔

''میں تو اس قید خانے میں تنگ آ گیا ہوں۔ اب تو یوں لگنے لگا ہے' جیسے پھانسی کا قیدی اپنی سزا کا منتظر ہو۔'' تیمور کے انداز میں تلخی آ گئی۔

میرا دل بہت دکھا۔ میرے ساتھ تو جو ہو رہا تھا سو ہو رہا تھا۔ مگر تیمور بھی کتنی گھٹن کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ کبھی ایسی بات نہیں کرتا تھا' آج کی تھی تو میں سمجھ سکتی تھی کہ اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہونے کو تھا۔ دوسری طرف اس کی ممی کو تاؤ آ گیا۔

''اپنی ماں کا دل دکھاتے تمہیں ذرا تکلیف بھی نہیں ہوتی؟ کیا میں تمہارا برا چاہتی ہوں' کیا تکلیف ہوتی ہے تمہیں گھر میں رہتے ہوئے؟ ہر چیز میسر ہے یہاں' باہر کچھ ہو جائے تو کیا ہوگا؟ پہلے بھی تمہارے دماغ میں یہ کیڑا نہیں گھسا تھا' مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ اب تم کس کی زبان بول رہے ہو۔''

''ممی! خدا کے لیے سجو کو مت گھسیٹا کریں ان باتوں میں۔ آپ خواہ مخواہ اس کی خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔''

میں نے ٹیبل کے نیچے اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں مارا۔ خوامخواہ بات کو بڑھانے کا کیا فائدہ تھا' لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ ایک لمحے میں ہی ممی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے۔

''مرتے رہو' میں خواہ مخواہ پاگل ہو رہی ہوں تمہارے لیے۔ ماں کا احساس نہیں ہے تمہیں۔ بیوی زیادہ پیاری ہوگئی ہے' وہ دن کو رات کہہ دے' تم پر فرض ہو جاتا ہے کہ اس بات

پر یقین کرلو۔ محبت وغیرہ تو ڈھونگ تھا' تم تو ساری جائیداد اس کے نام لکھنے پر تیار ہو' کہ تم مرو تا کہ جلد از جلد ہر چیز پر قبضہ کر لے۔ وہ ماں ہوگی جو تمہارے پیچھے روئے گی۔ لکھوا لو مجھ سے کہ تمہارا کفن میلا نہیں ہوا ہوگا کہ یہ اطمینان سے دوسری شادی رچا کر بیٹھ جائے گی۔''

یہ اس تقریر کے صرف چند نکات تھے جو انہوں نے کی اور اس کے ایک ایک نکتے پر انتہائی فصاحت و بلاغت سے روشنی ڈالی' پھر نپکن میز پر پھینک کر کرسی جھٹکے سے پیچھے کر کے' روتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم سے واک آؤٹ کر گئیں۔

اس قسم کی باتیں روزمرہ کا معمول بن چکی تھیں اور میں نے انہیں سنجیدگی سے لینا چھوڑ دیا تھا' لیکن پہلے کبھی انہوں نے یہ سب تیمور کے پاپا کے سامنے نہیں کہا تھا شرمندگی کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے پاپا الگ پشیمان ہو گئے۔ تیمور کو بہت غصہ آیا تھا' لیکن نکالتا کس پر۔

''ایکسکیوز می۔'' میں نے کہا اور اُٹھ کر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

تیمور میرے پیچھے اُٹھ رہا تھا' لیکن پاپا نے اسے روک لیا۔

راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ کیا کروں؟ جتنا میں تیمور کو نارمل زندگی کے قریب لانے کی کوشش کرتی تھی' اس کی ممی اسے اسی قدر دور کر رہی تھیں۔ بار بار اسے یہ باور کروا رہی تھیں کہ وہ موت کے قریب تھا' اسے ایک صحت مند زندگی کے بجائے بیمار زندگی دے کر خود ترسی میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اب تک تو وہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس بیماری سے پریشان نہیں ہے۔ موت کے اتنے قریب ہونے کے باوجود بھی خوفزدہ نہیں ہے' لیکن ان حالات میں وہ اپنی ظاہری حالت بھی قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں اس دن سے ڈر رہی تھی جب اچانک اس کے صبر اور ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا۔

''جس روز تیمور نے خود کو بیمار اور موت کی دہلیز پر کھڑے سمجھ لیا' اس روز سے ہمارے رشتے میں دراڑیں پڑنے لگیں گی۔'' میں نے سوچا۔

اپنی سوچوں سے میں اس وقت چونکی جب تیمور دروازہ کھول کر خواب گاہ میں داخل ہوا۔

''اب تم سے سوری بھی کیا کروں کہ یہ تو روز کا معمول بن گیا ہے۔'' وہ میرے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہاری ممی کتنی پریشان ہیں۔ ہر

انسان کی طرح تھوڑی دیر تو مجھے بھی غصہ آتا ہے' دکھ بھی ہوتا ہے' لیکن پھر میں سوچتی ہوں کہ ان کی جگہ میں ہوتی تو شاید میری ذہنی حالت اس سے بھی زیادہ بری ہوتی۔''

''نہیں اب میں نے پاپا سے کہا ہے کہ انہیں سمجھائیں۔ آج کے دن تک ہم نے مل کر ڈھنگ سے ایک بات بھی نہیں کی۔ ہر روز کا یہ شور شرابہ میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ گھر میں رہو تو ممی کی ٹینشن باہر نکلو تو ان کی ٹینشن۔ تم سے بات کرتا ہوں تو تمہاری توجہ میری بات پر کم اور ممی سے ہونے والی اگلی ملاقات پر زیادہ ہوتی ہے۔''

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ہم باہر نکلتے تھے تو تھوڑی ہی دیر میں' میں پریشان ہو جاتی تھی۔

''جلدی گھر چلو تیمور! ممی نہ جاگ جائیں'' کی گردان میرے ہونٹوں پر رہتی تھی۔

اور گھر میں ہوتے تھے تو میرا ایک ایک لمحہ ممی کی ہدایات کی روشنی میں گزرتا تھا' پھر بھی یہ ٹینشن کہ خدا جانے وہ کون سی غلطی پکڑ لیں گی۔ تیمور پر میری توجہ بہت ہی کم ہوتی تھی۔

آج اس نے دبے لفظوں میں جتا دیا تھا' کل مجھ پر چیختا چلاتا تو میں کیا کر سکتی تھی۔

''پاپا نے ہمارے سوئٹزر لینڈ کے ٹور کا بندوبست کیا ہے اور آج وہ یہی بتانا چاہتے تھے کہ یہ ہنگامہ ہو گیا۔ بہرحال اگلے ہفتے ہمیں جانا ہے' اسی لیے پاپا نے تم سے تمہارا پاسپورٹ بھی مانگا تھا' تم تیاری کر رکھنا۔''

میں مانتی ہوں کہ اس وقت میرا یہ بات کرنا حماقت تھا' لیکن ایسا میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا' وہ فکریں جو ہر وقت ذہن پر سوار رہتی ہیں' آخر کہیں تو انسان کے اندر سے باہر نکل ہی آتی ہیں۔ سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بجائے اس کے کہ میں خوشی کا اظہار کرتی' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''اور ممی!''

تیمور کو تو پہلے ہی غصہ تھا' وہ بالکل ہی بھڑک اٹھا۔

''وہ کون سا جوڑا ہے جو ہنی مون پر اپنی ماؤں کو بھی ساتھ لے جاتا ہے' تم دونوں عورتیں مل کر مجھے پاگل کر دو گی۔''

''ویسے ہی پوچھ لیا تھا میں نے' تم نے تو ڈانٹ ہی دیا۔'' میں نے کہا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو باہر لان میں واک کرتے ہیں۔''

''موڈ آف کر کے رکھ دیتے ہو تم لوگ۔''

''اچھا' اب بس بھی کرو۔ چلو واک کرتے ہیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔

☆======☆======☆

ہفتہ بھر میں اس کی ممی کے بدترین چڑچڑے مزاج کا شکار رہی۔ انہیں تیمور کے سلسلے میں مجھ پر ذرا بھر بھی اعتبار نہیں تھا اور یہ خدشہ بری طرح سے ان کے ذہن پر سوار تھا کہ میری نالائقی اور بے توجہی کی وجہ سے خدانخواستہ اسے کچھ ہو جائے گا۔ ہر وقت کی ایک ہی کل کل سن کر ایک دو مرتبہ تو میرا دل چاہا کہ پلٹ کر انہیں ایسا سخت جواب دوں گی کہ اگلی مرتبہ وہ بھی بات کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچیں' لیکن پھر وہی عادت کہ اپنے سے پہلے دوسرے کی ذہنی کیفیت کے متعلق سوچ کر خاموش ہو جانا۔ اس عادت نے مجھے نقصان ہی پہنچایا تھا۔ خود بری طرح کڑھتی رہتی تھی' مگر کسی کو کچھ کہتی نہیں تھی۔

سوئٹزر لینڈ کے لیے جہاز پر چڑھتے وقت اتنا بوجھ میرے سامان کا نہیں تھا' جتنا ان نصیحتوں اور ہدایات کا تھا' جو تیمور کی ممی نے مجھے دی تھیں۔

شادی کے بعد پہلی مرتبہ جہاز میں' میں نے سکون اور آزادی کا سانس لیا۔

''کم از کم ایک مہینے تک میں اس عذاب سے دور رہوں گی۔'' میں نے ٹیک لگاتے ہوئے طمانیت سے سوچا۔

جنیوا میں اس سرخ چھت والے خوبصورت سے ہٹ میں پہنچنے تک میں سوئٹزر لینڈ کے حسن کی اسیر ہو چکی تھی۔ پھر ساتھ من پسند شریک سفر ہی نہیں' شریک زندگی بھی تھا۔ ممی کی تیز نگاہوں اور تلخ زبان کا خوف نہ تھا' زندگی ایک دم ہی حسین ہو گئی تھی۔ وہ سارا چڑچڑاپن اور ذہنی کوفت پاکستان میں ہی رہ گئی تھی۔ یوں لگا جیسے ابھی اسی لمحے ہم نے زندگی کا نیا سفر شروع کیا ہو۔ تیمور بھی قید سے نکل کر آزاد ہوا تھا تو اس میں پرانی شوخی پھر عود کر آئی۔ اب یہ شوخی پہلے سے زیادہ دلچسپ لگنے لگی تھی' جو فاصلے پہلے تھے' اب وہ مٹ گئے تھے۔ آزادی تھی' تنہائی تھی' خوبصورتی تھی' اس کے علاوہ کیا چاہیے تھا۔

ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہم جنیوا کے بازاروں میں گھومتے' جھیل کی سیر کرتے' دھلی دھلی نکھری نکھری فضا میں گہرے سانس لیتے۔

جھیل میں تیرتے' راج ہنسوں کے جوڑے کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ بات کہنے کے لیے اس سے موزوں جگہ اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

''میں سوچ رہی ہوں تیمور کہ ہماری شادی کو ایک مہینہ پورا ہوگیا ہے' لیکن ابھی تک ہم نے فیملی شروع کرنے کے لیے کچھ پلان نہیں کیا۔''

اس کے چہرے پر بکھری شوخی اور شرارت کو اچانک سنجیدگی کی دھند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سطح آب پر نگاہیں جما کر اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

اس کا یہ جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔

''کیا مطلب؟'' میں واقعی سمجھ نہیں پائی تھی۔

''مطلب سادہ سا ہے۔'' جنگلے سے ٹیک لگا کر اس نے میری طرف دیکھا۔

''میری زندگی کے دن انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ میری مرضی کے بغیر تم اس جہنم میں اتر آئیں' لیکن اپنی مرضی سے کسی تیسرے فرد کو میں اس آگ میں نہیں جھونک سکتا۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر خدا نہیں ہوتے' اندازے کی غلطی بھی ہوسکتی ہے' بیماری کا علاج بھی دریافت ہوسکتا ہے اور کیا میں یا تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے انکار کرسکتے ہیں؟ کوئی معجزہ بھی رونما ہوسکتا ہے۔''

قبل اس کے کہ میں دوسری بات بھی کہتی' اس نے تلخی سے میری بات کاٹ دی۔

''ہونہہ معجزہ! میں کوئی ولی اللہ نہیں ہوں کہ میرے ساتھ معجزہ رونما ہوگا۔ حقیقت کو قبول کرلینا ہی بہتر ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میری زندگی مختصر نہیں مختصر ترین ہے۔''

اس کی تلخی محسوس کر کے میں نے اس موضوع پر گفتگو ملتوی کردی۔

رات کو کھانا کھا کر ہم ریسٹورنٹ سے پیدل ہی اپنے ہٹ کی طرف چل پڑے۔ ہلکی ہلکی ہوا ہمارے چہروں سے ٹکراتے ہوئے بہت خوشگوار اثر چھوڑ رہی تھی۔ تیمور کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کس انداز سے بات کروں کہ وہ میری بات سننے پر بھی تیار ہوجائے اور اس کی سوچوں پر کوئی منفی اثر بھی نہ پڑے۔

''کہاں گم ہو؟'' اس نے میری خاموشی محسوس کر کے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں' بس یہی سوچ رہی تھی کہ اس طرح تمہارے ساتھ چلنے سے زیادہ دلچسپ

کام اور کیا ہوسکتا ہے؟''

''زندگی میں ایک ہی فرد کو اپنی محبت کا مرکز و محور نہیں بنانا چاہیے' اس طرح محبت کرنا بھی تکلیف دہ ہوجاتا ہے۔''

''کم از کم ابھی یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم خود کو اس وقت کے لیے تیار کرلو جب میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا اور ممکن ہے تمہیں تنہا ہی چلنا پڑے۔''

ہم ہٹ تک پہنچ چکے تھے۔ پورے چاند کی شفاف روشنی میں' میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تو کیوں مجھے تنہا چھوڑتے ہو' مجھے اس دن سے بہت خوف آتا ہے تیمور' مجھے کھو دینے' بچھڑ جانے سے ڈر لگتا ہے۔ میں کیسے رہ پاؤں گی۔'' میری آواز کانپ رہی تھی۔ بہت مشکل سے میں نے خود پر ضبط کر رکھا تھا۔

''سجو!'' اس نے اپنے' زندگی کی حرارت سے بھرپور ہاتھوں سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''کاش! یہ میرے بس میں ہوتا۔ مجھے اپنی مختصر زندگی کا کوئی افسوس نہیں ہے' لیکن جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو میں نے دن میں کتنی مرتبہ یہ دعا مانگی ہے کہ صرف تمہارے لیے میری زندگی کے چند دن بڑھ جائیں' لیکن سجو میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''ایسا ہوسکتا ہے تیمور' جسم فانی ہوتا ہے' لیکن جو تعلق جو رشتہ ہم دونوں کے بیچ ہے' اس کی روح ابدی ہوتی ہے۔ اولاد اس رشتے کو امر کردیتی ہے۔ اپنی زندگی تمہارے اختیار میں نہیں' لیکن یہ تو تمہارے اختیار میں ہے ناں کہ مجھے تنہا مت چھوڑو۔ دیکھو کتنی بھیڑ ہے اور میں ایک کمزور' بہت عام سی لڑکی' اتنے لوگوں میں اکیلی رہ جاؤں گی تو خود سے بھی بچھڑ جاؤں گی۔ خود کو بھی نہیں ڈھونڈ سکوں گی۔''

اس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

''چلو اندر چلیں۔'' لہجہ جذبات سے عاری ہوگیا۔

''پلیز تیمور!'' میں نے بازو سے پکڑ کر اسے روکا۔

''میں نہیں چاہتا کہ میری اولاد یتیم ہو' آئندہ مجھ سے اس موضوع پر گفتگو مت کرنا۔''

وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے چل پڑی۔

☆======☆======☆

رات کو خواب گاہ کی کھڑکی کے پردے برابر کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ مجھے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے ابھی تو بہت آزمائشیں ہیں' چلو یہ بھی ایک آزمائش ہی سہی' اگر ہم سب اس کی وجہ سے پریشان ہیں تو کیا وہ اپنی بیماری کے باعث تلخ نہیں ہوگا۔ تھوڑی سی برداشت کی قوت کچھ حوصلہ اور ذرا سی ہمت۔

ہمیں جنیوا آئے دس دن ہو چکے تھے' لیکن یوں لگتا تھا جیسے ابھی پل بھر پہلے آئے ہوں۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ دن بھر میں ممی کے کم از کم تین چار فون ضرور آتے تھے۔ زیادہ تر ایسے وقت جب ہم گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ ہر روز ایک مرتبہ ہم بھی باقاعدگی سے انہیں فون کیا کرتے تھے۔

نہ جانے بیٹھے بٹھائے تیمور کو کیا خیال آیا' رات کے کھانے کے دوران بولا۔

''چلو فرانس چلتے ہیں۔''

''فرانس!'' میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ممی نے تو جنیوا سے باہر نکلنے پر سختی سے پابندی لگائی ہوئی تھی اور ہم باقی سوئٹزرلینڈ بھی نہیں گھوم پھر سکتے تھے اور وہ فرانس جانے کی بات کر رہا تھا۔

''بس یوں گئے اور یوں آئے۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''لیکن ہم کیسے جا سکتے ہیں' ممی نے منع کیا ہوا ہے۔''

''تم میری بیوی ہو یا ان کی؟''

''شٹ اَپ' کیا فضول باتیں کرتے ہو۔'' میں ہنس پڑی تھی۔

''بس ہم فرانس جا رہے ہیں۔ گھر جاتے ہی میں انتظام کرتا ہوں۔ یہاں تک آ گئے ہیں تو فرانس سے ہوتے ہوئے بغیر کیسے جا سکتے ہیں۔''

''کیوں مجھے مرواتے ہو' آرام سے یہیں جھیل اور مشہور عمارتیں دیکھو۔''

''تم کیوں ممی کے خوف سے مری جاتی ہو' کچھ نہیں ہوگا۔ فون جیسے ہم یہاں سے کرتے ہیں وہاں سے بھی کہہ لیں گے' انہیں کیا خبر ہوگی کہ ہم کہاں ہیں؟''

''بات ممی کے خوف کی نہیں ہے' یہاں تمہارے پاپا نے اسپتال میں بھی سب انتظام کر رکھا ہے کہ کسی پرابلم کی صورت میں دقت نہ ہو' کہیں اور تمہیں کچھ ہوا تو میں کیا کروں گی۔ میں ایسا رِسک نہیں لے سکتی۔'' میں نے صاف انکار کر دیا۔

''آل رائٹ' تم نہیں جاؤ گی تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔''

''کیا کرتے ہو' دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟''

''وہی تو خراب ہوا ہے۔ ممی کی قید میں جانے سے پہلے میں ایک ایک لمحے سے لطف لے لینا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''اچھا لطف ہے تمہارا جو بیوی کے بغیر ہے۔''

''میں نے تو بیوی کو آفر دی ہے۔ بکنگ بھی کروا دوں گا۔ باقی بیوی کی مرضی ہے کہ وہ ساتھ چلتی ہے یا نہیں۔''

''اور وہاں جا کر تم نے کہہ دیا کہ لندن بھی چلنا ہے تو پھر؟''

''واہ! بیوی ہو تو ایسی عقل مند اور ذہین۔ بالکل ایسا ہی کچھ میرا پروگرام ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

پھر میں چیختی رہ گئی' مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔

''میں نے تو پروگرام بنا لیا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ ساتھ دیتی ہو یا نہیں۔''

اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی' مگر سب بے کار رہا اور اسے اکیلے بھیج دینا تو یوں بھی ناممکن تھا۔

میں نے کبھی چھپ کر کوئی کام نہیں کیا تھا' اب جب ممی کی ہدایات نظر انداز کر کے جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی' تو میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

پیرس پہنچ کر میں قدم قدم پر خیریت کی دعا کر رہی تھی۔ ایمرجنسی کی صورت میں اسپتال کے انتظام کے سوا اس نے ہر انتظام کر دیا تھا اور جب میں نے اس سے کہا تھا کہ اس سلسلے میں بھی احتیاطاً انتظام کر لے تو وہ چڑ گیا تھا۔

''جب مرنا ہوگا تو کوئی اسپتال' کوئی میڈیکل ایڈ کام نہیں آئے گی۔ دو دن تو مجھے سکون سے میری مرضی کے ساتھ گزار لینے دو۔''

وہ تمام چڑچڑا پن جو وہ اپنی ممی کے سامنے نہیں کر سکتا تھا' میری ایسی چھوٹی سی بات پر

ظاہر کرنے لگا تھا۔

اور اب جب شانزے لیزے میں پھرتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہاں لوگ اول تو انگریزی سمجھتے ہی نہیں اور سمجھ لیں تو بھی فرانسیسی غوں غاں سے باہر نہیں نکلتے تو میری پریشانی یقینی تھی۔ ایسے میں تیمور کو خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو میں کسی کو کچھ سمجھا بھی نہ پاتی۔ شہر اجنبی' راستے اجنبی' لوگ اجنبی' زبان اجنبی۔ میں تیمور کی رفاقت کا خاک لطف اٹھاتی۔ جب ذہن سے یہ پریشانی چمٹی ہوئی تھی۔

''تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟'' بالآخر تیمور بھی جھنجھلا گیا۔

''میں محسوس کر رہی تھی کہ جس روز سے میں نے فیملی شروع کرنے کی بات کی تھی' اسی دن سے اپنی صحت کے معاملے میں وہ ضدی سا ہو گیا تھا۔ میں اس کی صحت کے بارے میں ذرا بھی فکرمندی ظاہر کرتی تو وہ فوراً ہی چڑچڑے اور ضدی پن پر اُتر آتا۔

ہم گھوم پھر کر ہوٹل واپس آئے تو بستر میں گھسنے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بے چین سا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا تیمور؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میری طبیعت کو کیا ہونا ہے؟'' پل کے پل میں وہ بھڑک اٹھا۔

''میں نے سوچا تھک گئے ہو۔'' جلدی سے میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

میں واقعی تھکی ہوئی تھی۔ صبح سے ہم کتنا گھومے پھرے تھے۔ اس کی طرف سے فکرمندی بھی تھی' لیکن نیند آئی تو پتا بھی نہ چلا کہ کب سوئی ہوں۔ گہری نیند میں بس اتنا اندازہ ہوا کہ میرے بازو پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی اور ابھی کروٹ بدلنے کا ارادہ باندھ ہی رہی تھی کہ تیمور کی کراہوں سے آنکھ کھل گئی۔

''تیمور' کیا ہوا؟'' میں تیزی سے اس کی طرف پلٹی۔ خواب گاہ کی تاریکی میں کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ صرف اتنا اندازہ تھا کہ تیمور شدید تکلیف میں مبتلا تھا۔ لیمپ کا سوئچ ڈھونڈنے میں بھی مجھے خاصی دقت ہوئی۔ روشنی میں میری نگاہ تیمور پر پڑی۔ شدت درد سے اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے اسے سانس بھی ٹھیک سے نہیں آ رہا تھا۔

''تیمور...... تیمور!'' میں چلائی۔

''اس کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا اور کراہیں بھی پہلے سے بلند ہو گئی تھیں۔ میں نے تیزی سے

روم سروس کو صورت حال سے بتا کر مدد کی درخواست کی۔

ایمبولینس آنے اور تیمور کو اسپتال تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی' لیکن مجھے لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ میرے سامنے اب سے قبل اسے ایسا دورہ نہیں پڑا تھا۔ پریشانی اور خوف سے میرا برا حال تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ ساری رات اور اگلا آدھا دن اسی طرح گزرا۔ تیمور کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہاں طبی سہولتیں تو موجود تھیں' لیکن زبان کا مسئلہ ہر جگہ آڑے آ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں سمجھا پائی کہ تیمور کی رپورٹس جنیوا کے اسپتال میں ہیں۔ وہاں سے رپورٹس فیکس کی گئیں۔ کتنی دیر بعد جب تیمور کی حالت ذرا سنبھلی تو مجھے خیال آیا کہ گھر فون کر کے ممی' پاپا کو اطلاع دینی چاہیے۔ شکر ہے کہ فون اس کے پاپا نے ریسیو کیا' ورنہ نہ میں پوری بات کر سکتی' نہ وہ پوری بات سنتیں۔

انہوں نے بہت تحمل سے میری بات سنی۔ ذہنی پریشانی اور رونے کی وجہ سے جو کچھ بتانا میں بھول رہی تھی' انہوں نے خود سوال کر کے پوچھ لیا۔ مجھے تسلی دی اور بتایا کہ وہ جلد سے جلد آ جائیں گے۔

جب تک اس کے ممی پاپا آئے اس کی طبیعت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ہاں وہ پہلے سے بہت زیادہ کمزور لگ رہا تھا۔ چہرے پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس دوران کچھ پاکستانی فیملیز بھی اسے دیکھنے کے لیے آئی تھیں' جن سے تیمور کے پاپا کی واقفیت تھی۔ وہ لوگ وہاں مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت لگ رہے تھے۔ ان لوگوں کی موجودگی میں زبان کے مسئلے سے بھی دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔

جب تک ہم فرانس میں رہے' نہ جانے کیسے ممی نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ ان کی موجودگی میں پھر وہی ٹینشن میرے ذہن پر سوار ہو چکی تھی۔ مجھ سے بات کرنا انہوں نے چھوڑ رکھا تھا اور کبھی جہاں میں اس بات پر سخت کوفت اور اُلجھن کا شکار ہوتی تھی۔ وہیں کبھی کبھی میں سکون کا سانس بھی لیتی تھی۔

لیکن پاکستان پہنچتے ہی انہوں نے پھٹ پڑنے میں دیر نہیں کی۔ جرائم کی فہرست طویل بھی تھی اور ناقابلِ معافی بھی۔

ہم جنیوا سے فرانس گئے تھے۔ یہی نہیں وہاں سے فون کر کے ممی کو تسلی بھی دی تھی کہ ہم خیر خیریت سے جنیوا میں ہی تھے اور اس کے بعد وہی ہوا جس کا انہیں خدشہ تھا۔ یعنی میں سو

رہی تھی اور تیمور درد سے تڑپ رہا تھا۔ میری وجہ سے اس نے اتنی تکلیف اُٹھائی' اگر اسے کچھ ہو جاتا تو؟

ان میں سے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا کوئی الزام بھی ایسا نہیں تھا' جس سے میں خود کو بری الذمہ ثابت کر سکتی۔ وہ چیخ رہی تھیں' چلا رہی تھیں' اور میں اپنے دفاع میں ایک لفظ کہنے کے بھی قابل نہیں تھی۔ تیمور جو کبھی میری طرف داری کر لیتا تھا' وہ بھی اپنی خواب گاہ میں تھا۔

لیکن ان سب سے زیادہ جو بات کانٹا بن کر میرے دل میں پیوست ہو رہی تھی وہ ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں پاپا اور نبیلہ کی موجودگی تھی۔ تیمور کی ممی کی آواز اتنی بلند تھی کہ یہ ممکن نہیں تھا کہ پاپا اور نبیلہ کی سماعت میں نہ اُترتی۔

غصے' دکھ اور شرمندگی سے میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس لمحے یا انہیں مار دوں یا خود مر جاؤں۔

اپنے اوپر برداشت کرنا میں نے سیکھ لیا تھا۔ ممی کی ذہنی حالت کو جواز بنا کر صبر اور برداشت کرنے کے لیے ایک بہانا بھی گھڑ لیا تھا' لیکن پاپا اور نبیلہ کے کانوں میں یہ سب پہنچنا میرے لیے بھی ناقابل برداشت تھا۔ میری گھریلو زندگی جیسی بھی تھی میں اس سے خوش نہیں تھی لیکن مطمئن تھی۔ صرف اس لیے کہ تیمور میرا اپنا تھا' مگر اب پاپا کیا سوچ رہے ہوں گے؟ میں کس طرح سر اُٹھا کر ان کے سامنے جاؤں گی؟ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی؟

میں ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی' جب ڈرائنگ روم میں پاپا اور نبیلہ کے پاس پہنچی۔ وہ دونوں مروت کے مارے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں پہنچی تو نبیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہم چلتے ہیں جو! پھر آ جائیں گے''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جو کانٹے تھوڑی دیر پہلے دل میں ترازو ہوئے تھے' ان سے لہو رسنے لگا تھا۔

''ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو سلام بھی نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔

پاپا نے اُٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ کتنا کمزور لمحہ تھا یہ۔ میرا دل چاہا کہ آنسوؤں کے دریا بہا دوں۔ وہ سب تکلیفیں جو میں تنہا برداشت کر رہی ہوں' انہیں پاپا اور نبیلہ سے کہہ دوں' ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔

لیکن میں نے پھر خود پر قابو پا لیا اور پاپا سے الگ ہو گئی۔ نبیلہ کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''کتنی کمزور پیلی پیلی سی ہو رہی ہو جو! مجھے تو تم بھی بیمار لگ رہی ہو۔''

''نہیں' بس تھکن ہے' تیمور ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا' بس تم اس کے لیے دعا کرو۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا اور اس کی پاگل ماں بھی' لیکن تمہیں ہم کھو دیں گے۔'' نبیلہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

پاپا نے سرزنش کے انداز میں اسے دیکھا' اس نے منہ پھیر لیا۔

''تیمور یہیں آنا چاہ رہا تھا' لیکن میں نے اسے کہا کہ میں آپ لوگوں کو بیڈ روم میں لے آؤں گی' وہیں چلتے ہیں۔'' میں نے ان کی باتوں اور انداز کو نظر انداز کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

تیمور اب کافی بہتر تھا' لیکن بیماری آہستہ آہستہ اس کے اوپر اپنے نشان چھوڑنے لگی تھی۔ فی الحال ممی نے اسے بستر سے اٹھنے سے منع کر رکھا تھا۔ پاپا اور نبیلہ کو وہ اسی طرح ملا جیسے جیل میں بند قیدی کے لیے ملاقات آ جائے۔ وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہے' جب اُٹھنے لگتے تیمور پھر اصرار کر کے انہیں بٹھا دیتا۔ اس کے اتنے اپنائیت بھرے رویے نے نبیلہ کے سب نہیں تو کچھ شکوے ضرور دھو دیئے تھے۔

واپسی پر میں انہیں گیٹ تک چھوڑنے گئی تو نبیلہ مجھ سے کہنے لگی۔

''دو ایک دن کے لیے ہماری طرف آ جاؤ۔ جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے۔ تسلی سے ایک مرتبہ بھی آ کر نہیں بیٹھیں اور رہنے سے تو صاف انکار کر دیا۔ چند دن کے لیے ذہن سے سب کچھ نکالو' بھول جاؤ سب کچھ۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نروس بریک ڈاؤن کے بالکل کنارے پر ہو۔ تمہارے لیے بہت ضروری ہے کہ چند دن کے لیے ذہن کو بالکل آرام دو' سب بوجھ اُتار پھینکو۔''

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا تیمور ٹھیک ہو جائے تو چکر لگائیں گے' آ کر رہ نہیں سکتی۔ تم تو میری مجبوری کو سمجھتی ہو ناں۔ تیمور کو یوں نہیں چھوڑ سکتی میں' بس تم اس کے لیے دعا کرتی رہو۔''

''فرد کی شادی میں تو آ رہی ہو ناں؟''

"فرو کی شادی؟ کب ہے اس کی شادی؟"

"اسی جمعے کو ہے' تمہیں اور تمہاری ساس کو الگ الگ کارڈ دیے ہیں۔ شاید تب تم لوگ یہاں نہیں تھے مجھے کل ہی بتایا ہے اس نے۔"

"ظاہر ہے فرو کی شادی پر تو ضرور آؤں گی۔ بس اللہ کرے تیمور ٹھیک ہو جائے کتنے فرینڈز اور کالج فیلوز سے ملاقات ہو گی۔"

نیلوفر اور ہمایوں کی شادی کے دونوں طرف سے کارڈز آئے ہوئے تھے۔ تیمور کی دونوں طرف رشتہ داری تھی۔ ہمایوں کے ساتھ خالہ زاد کا رشتہ تھا اور نیلوفر کے ساتھ چچا زاد کا۔

"میں سوچ رہی ہوں کون سے کپڑے پہنوں گی اور تم کیسے کپڑے پہنو گے۔"

ساتھ بیٹھی تیمور کی ممی میرا جوش و خروش دیکھ کر تلملا اٹھیں۔

"آرام سے گھر میں ٹکو' بہت شوق ہے تمہیں گھومنے پھرنے کا۔ پہلے بھی میری بات نہیں مانی تھی اور نقصان ہی اٹھایا تھا۔ بزرگ جب کچھ کہتے ہیں تو بکواس نہیں کرتے۔ کوئی وجہ ہوتی ہے جو تم جیسے پتھر کے ساتھ سر پھوڑتے ہیں۔"

"ممی! آپ کبھی تو ہم دونوں کو آپس میں کوئی بات کر لینے دیا کریں۔ اس بات کا فیصلہ ہمیں کرنے دیں کہ ہمیں جانا ہے یا نہیں۔" وہ یک دم بھڑک اٹھا۔

یہ فساد تو روزمرہ کا معمول بن چکے تھے ہر مرتبہ تیمور بالآخر خاموش ہو جاتا تھا۔ کبھی خود ہی اور کبھی میرے اشارے پر لیکن اب تو یوں لگ رہا تھا' جیسے نہ ممی خاموش ہوں گی اور نہ وہ۔ میں نے جب بھی جنگ بندی کی کوشش کی۔ دونوں طرف کے گولہ بارود کی زد میں آ گئی۔

ممی جتنا چاہتی تھیں کہ وہ گھر پر آرام کرے' وہ اتنا ہی چڑنے لگا تھا۔ پہلے وہ شادی بیاہ قسم کی تقاریب میں جانے کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا اور کہیں بہت ضروری جانا بھی پڑتا تھا تو زیادہ دیر نہیں رکتا تھا' مگر نیلوفر اور ہمایوں کی شادی میں اس نے بھرپور حصہ لیا۔ ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہوا تھا۔ دوسری طرف ٹینشن کے مارے میرا یہ حال تھا کہ کسی سے ٹھیک طرح سلام دعا بھی نہ کر سکی۔ ممی کی تیز نظریں ہمیں پر لگی ہوئی تھیں۔ میں خواہ مخواہ ہی خود پر پابندیاں عائد کر رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ گھر جا کر سب الزام میرے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔ غیر شعوری طور پر ان سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تقریب میں گانا گانا تو دور کی بات ... نے کسی سے ہنس کر بات کر لی تب بھی ممی یہ ضرور کہیں گی کہ تیمور جو پہلے

ایسی تقاریب میں کبھی نہیں جاتا تھا' اب صرف میرے کہنے پر بستر سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔ اپنے شوق کی خاطر میں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔

اس دوران نبیلہ میرے ساتھ ساتھ رہی۔ وہ میری پرابلم کو سمجھ رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ بھی نہ ہوتی تو شاید کسی لمحے گھبرا کر میں رو ہی پڑتی۔ تقریب کے چار دن یہی صورتِ حال رہی۔

ولیمے سے واپسی پر گھر آتے ہوئے میں نے تیمور کی بے چینی پھر محسوس کی۔

"تھک گئے ہو تیمور؟" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"ہوں" پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا۔

"سجو! میرے سر میں بہت درد ہونے لگا ہے۔"

میں ایک دم گھبرا گئی۔

"ڈرائیور گاڑی کلینک لے چلو۔"

ہماری گاڑی کو موڑ مڑ کر گھر تک جانے کے بجائے آگے بڑھتے دیکھ کر ہمارے پیچھے آنے والی ممی' پاپا کی گاڑی ہمارے ساتھ چلنے لگی۔ شاید انہیں بھی صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔

تیمور کی حالت دم بدم خراب ہو رہی تھی اور میری بے بسی کہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"کار تیز چلاؤ' جلدی کرو۔" میں ڈرائیور پر برس پڑی۔

کلینک پہنچنے تک وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

اور شاید یہی وہ مقام تھا جہاں وہ مجھ سے دور ہونے لگا تھا۔ ایک ہفتہ ایڈمٹ رہ کر آنے کے بعد وہ بالکل بدل گیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی تکلیف اس کی اپنی تھی' اس میں کوئی حصہ دار نہیں بن سکتا تھا۔ سب اس کے لیے رو سکتے تھے' آنسو بہا سکتے تھے' مگر اس سے بڑھ کر کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اکیلے تکلیف سے گزرنا تھا اور تنہا ہی موت کی وادی میں اترنا تھا۔

وہ جس نے اب تک اپنی بیماری کو بہت بہادری سے لیا تھا' آہستہ آہستہ اپنی بیماری کے آگے ہتھیار پھینکنے لگا تھا۔ یہ عمل آہستہ تھا لیکن مسلسل تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ خود ترسی میں

مبتلا ہو کر اپنی زندگی کے یہ چند دن بھی بوجھ بنا لے۔ میں چاہتی تھی کہ جب تک وہ زندہ تھا' تب تک اپنی زندگی سے خوش رہے۔ اس سے خوشیاں کشید کرے' لیکن میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے کہیں یہ بند کھولنے کی کوشش کرتی تو گھر کی فضا اور مکدر ہو جاتی۔

کلینک سے گھر آنے کے بعد میں نے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ زیادہ تر خاموش رہنے لگا تھا۔ میں گفتگو کرتی تو بھی اس کا جواب ہوں' ہاں سے زیادہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھار آنے والے مہمانوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ روکھا پھیکا ہو گیا تھا۔ ممی کسی بات پر شور شرابہ کرتیں تب بھی وہ چپ چاپ آنکھیں موند لیتا تھا۔

اس روز اس کی اسٹڈی ٹھیک کرتے ہوئے مجھے اس کے بنائے ہوئے کچھ نوٹس ملے۔ میں نے اکٹھے کر لیے اور انہیں لے کر لان میں نکل آئی۔ اس وقت وہ ممی کے ساتھ کلینک گیا ہوا تھا۔ نوٹس پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ تو اچھے خاصے مضامین تھے۔ میں نے ہمایوں کو فون کیا۔

''کسی اخبار میں تمہاری کوئی واقفیت ہے؟''

''واقفیت؟ ارے بھئی سمجھو کہ اخبار ہی ہمارا ہے۔ ویسے تمہارے اپنے میاں کی بھی کم واقفیت نہیں ہے۔''

''نہیں' میں تیمور کو سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔ دراصل آج یونہی اس کی اسٹڈی میں گھسی تو اس کے نوٹس ہاتھ لگ گئے۔ ابھی پڑھ رہی تھی تو اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھے لکھے ہوئے تھے۔ میں چاہ رہی تھی کہ بطور آرٹیکل پبلش ہو جائے۔''

''ہاں یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ڈرائیور کے ہاتھ مجھے آفس ہی میں بھجوا دو۔''

جس روز اس کا پہلا آرٹیکل چھپا' میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ میں اخبار لے کر اس کے پاس پہنچی۔

''میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

''ہوں۔''

''یہ سوکھا سا منہ بنا کر 'ہوں' کہہ دینا کیا مطلب؟ مجھے بتاؤ کیا سرپرائز ہو سکتا ہے۔''

میں اس کے قریب ہی فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

''مجھے کیا معلوم۔'' وہ بیزار ہو گیا۔

''اتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو اور اب تک اتنی سی انڈر اسٹینڈنگ بھی نہیں ہوئی' یہ دیکھو۔'' میں نے اخبار کا صفحہ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

اسے حیرت ہوئی' پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری اور اس کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔

اس کے یہ تینوں انداز ایسے تھے کہ میری کتنے دن کی پریشانی کا ایک لمحے میں خاتمہ ہو گیا۔

''مجھے پڑھنے میں دقت ہو رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''دو' میں سنا دیتی ہوں۔'' میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے لیا اور آرٹیکل سنانے لگی۔ ختم کر کے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ یقین [illegible] مری اسٹڈی پر چھاپہ مار کر برآمد کیا' اور پھر چھپنے کے لیے بھجوایا ہو گا۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ یہ نوٹس تھے میرے اور بس یونہی لکھ دیئے تھے میں نے۔ میں بہت گنجائش تھی ٹھیک ہونے کی۔'' وہ بولا۔

''اچھا یہ تو مجھے پتا نہیں تھا۔ مجھے تو ٹھیک ہی لگے تھے۔''

''تمہیں تو ٹھیک لگنے ہی تھے۔ ظاہر ہے آرٹ کے علاوہ تمہیں کیا آتا ہے؟''

میں ہنس پڑی۔

''اچھا جانے دو' تمہارے اور نوٹس بھی پڑے ہوئے ہیں۔ آؤ چل کر انہیں دیکھتے ہیں۔ ان کی نوک پلک سنوار کر وہ چھپنے کے لیے بھیجیں گے۔ اُٹھو بھی۔'' میں نے زبردستی اُسے اٹھایا۔

ہم دونوں اسٹڈی میں آ گئے۔ یہ مشغلہ اچھا تھا' اس کا ذہن نہ صرف بٹ گیا تھا بلکہ اس طرح اس میں یہ احساس پھر جاگ سکتا تھا کہ وہ زندہ تھا اور اس کی زندگی کا کوئی مصرف تھا۔

میں اسے پڑھ کر سنا رہی تھی اور وہ جگہ جگہ اضافہ و ترمیم کروا رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اس کے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کا آرٹیکل ٹائپ کرنے لگی۔ وہ میرے

ئند تھے کے پیچھے سے اسکرین پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ کتنے دن بعد میں نے پھر اس میں جوش اور ولولہ کی لہر دیکھی تھی۔

دو تین دن تک ہمارا یہ مشغلہ جاری رہا۔ جب ممی سونے چلی جاتی تھیں تو ہم اسٹڈی میں آ جاتے تھے۔ اسٹرکچر تو پہلے ہی بنا ہوا تھا۔ اب صرف نوک پلک سنوارنے کا کام تھا جو کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس دوران ہم نے چھ آرٹیکل تیار کر لیے۔ پھر اچانک اس کی ممی کو خبر ہو گئی۔ لکھنا پڑھنا وہ تیمور کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دے چکی تھیں۔

اب کے یہ الزام اپنے سر لینے کا مجھے کوئی غم نہیں تھا۔

شام کو پہلی مرتبہ میں نے اس سلسلے میں ان سے بات کرنے کا ارادہ بنایا اور ان کے پاس لیونگ روم میں آ گئی۔

''آنٹی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' میں نے قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

''میں محسوس کر رہی ہوں کہ تیمور اپنی بیماری اپنے ذہن پر مسلط کر رہا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا مشغلہ نہیں ہے جو بیماری کی طرف سے اس کا ذہن ہٹا کر اسے کسی تعمیری سرگرمی کی طرف لے جائے۔ یہی صورتِ حال رہی تو وہ خود ترسی کا شکار ہو جائے گا اور ایسا ہوا تو زندگی کے یہ چند دن بھی اس کے لیے بوجھ بن جائیں گے۔ زندگی کے بجائے موت کی خواہش کرنے لگے گا۔

میں نہیں چاہتی کہ ایسا ہو۔ اسی لیے میں نے اسے دوبارہ اس کی پسند کے میدان کی طرف راغب کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ پلیز آپ بھی اس سلسلے میں میری مدد کریں۔''

''بی بی! تم اس طرف توجہ دو جہاں واقعی تمہیں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تین مہینے ہو گئے ہیں تم لوگوں کی شادی کو، میں سوچتی تھی کہ اتنی دیر میں کوئی نہ کوئی خوشخبری سن لوں گی، لیکن تم دونوں نے تو منہ سیا ہوا ہے۔''

میں شاک کے عالم میں رہ گئی۔ اول تو یہ میری بات کا جواب نہیں تھا اور حملہ بھی بالکل اچانک تھا۔ دوسرے جس طنزیہ انداز میں یہ فقرہ ادا کیا گیا تھا، اس سے ان کی اندرونی کیفیات ظاہر تھیں۔ یہ الزام انہوں نے براہِ راست مجھ پر نہیں لگایا تھا، لیکن وہ کیا سوچ رہی

تھیں، یہ جاننا کچھ مشکل نہیں تھا۔

''اس سے قبل کہ میری پوزیشن اور خراب ہو، مجھے انہیں حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ مسلسل خاموش رہ کر میں نے خواہ مخواہ ہی انہیں خود پر باتیں بنانے کا موقع دیا ہے۔'' میں نے سوچا۔ اور پھر ان سے مخاطب ہوئی۔

''اس بارے میں تو تیمور ہی آپ کو بہتر بتا سکتا ہے کیونکہ اس کی منطق میری سمجھ سے بھی باہر ہے۔ میں نے کہہ کہہ کر ہار مان لی ہے۔ میری تو یوں بھی کوئی بات نہیں مانتا وہ۔ آپ کی بات سمجھتا بھی ہے اور مانتا بھی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ اسے قائل کر لیں گی۔''

''ہونہہ! تمہاری بات نہیں مانتا، کس کو سنا رہی ہو یہ؟''

''بہر حال میں اس مسئلے پر بات کرنے نہیں آئی تھی۔ میں یہ بتانے آئی تھی کہ تیمور لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھے گا۔ اس بات سے ڈاکٹر نے بھی اسے منع نہیں کیا۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔ میرے صبر کی بھی ایک حد تھی۔

ان کا آتش فشاں لاوہ اُگلنے لگا تھا، لیکن میں کچھ سنے بغیر اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ جتنا اب تک ہو چکا تھا، وہی بہت تھا۔ یہ شادی میں نے تیمور کی خاطر کی تھی۔ اسے خوش کرنے کے لیے، اس کی ممی کی خاطر یا انہیں خوش رکھنے کے لیے نہیں کی تھی۔ اب تک میں ترازو کے دونوں پلڑے متوازن رکھنے کی کوشش میں خود ماری جا رہی تھی۔ میرے لیے تیمور اور اس کی خوشی اہم تھی۔ مجھے کیا فائدہ ہوتا کہ وہ مسلسل خود ترسی کا شکار ہو کر موت سے پہلے مر جاتا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب میں اس کی ممی کو بلاوجہ اور بلاضرورت اہمیت دینا بند کر دوں گی۔ اسی صورت میں ہم پھر ایک نارمل زندگی کا آغاز کر سکیں گے۔

زندگی کی گاڑی پھر ہولے ہولے آگے بڑھنے لگی تھی۔ تیمور کی ممی کے شور شرابے کے باوجود بھی ہم نے اپنا پڑھنے لکھنے کا کام جاری رکھا ہوا تھا اور پہلی مرتبہ ان کی کسی ہدایت سے انحراف کرتے ہوئے مجھے کوئی پشیمانی نہیں ہوئی تھی۔ پاپا نے بھی ہمارا ساتھ دیا تھا اور ممی کو یقین ہو گیا تھا کہ تیمور اور پاپا نے میری وجہ سے مل کر انہیں تنہا کر دیا تھا۔

میں نے اس کی خاموشی کا قفل توڑ دیا تھا، اور اب اس تاک میں رہتی تھی کہ اس کا موڈ خوشگوار ہو تو ایک مرتبہ پھر اس سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا اظہار کروں۔

چاہتی تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی اولاد ضرور دیکھ لے اور اب میں سمجھ سکتی تھی کہ

میری مما بیٹا چاہتی تھیں تو کیوں چاہتی تھیں میں بھی چاہتی تھی کہ کوئی اس کا نام لیوا ہو۔ ایک پورا گھرانہ یوں ختم نہ ہو جائے۔

رات کے کھانے کے بعد ہم گھر کے لان میں چہل قدمی کر رہے تھے جب اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر میں نے یہی ذکر چھیڑ دیا۔

''بار بار یہ ذکر مت چھیڑا کرو سجو! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میری وجہ سے کوئی تیسرا فرد اس جہنم میں نہیں اترے گا۔ میں ایسی اولاد نہیں چاہتا جسے دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اپنے باپ کے ہوتے ہوئے مجھے ان سے کچھ نہیں ملا۔ میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ جو خلا مجھ میں رہ گیا ہے' وہ میری اولاد میں نہیں رہے گا۔ میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونے دوں گا جو کمی اپنے والدین کی طرف سے میں نے محسوس کی' وہ میری اولاد کبھی محسوس نہیں کرے گی۔ اور اب میرے پاس کیا ہے کسی کو دینے کے لیے' میں اور کچھ نہیں دے سکتا تو یتیمی کا داغ بھی نہیں دوں گا کسی کو۔''

''زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے تم منفی رُخ دیکھ رہے ہو' کوئی مثبت رُخ بھی تو ہو سکتا ہے اس کا۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ تم اپنی آنکھوں سے اپنی اولاد کو دیکھو گے تو زندگی کے لیے تمہارا حوصلہ بڑھے گا' جینے کی تمنا پیدا ہوگی۔ ممکن ہے جو کام کوئی دوا' کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا وہ ہماری اولاد کر دکھائے۔ ایسا ہونا ناممکن تو نہیں ہے' محبت اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔''

وہ ہنس پڑا۔

''اب تک تو تم اتنے تلخ حقائق کا سامنا کر چکی ہو سجو! کہ تمہیں خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آنا چاہیے تھا۔ تم پھر بھی اپنے خوابوں کی اسیر ہو' زندہ رہنے کے لیے صرف حوصلے اور تمنا کی ہی ضرورت نہیں ہوتی۔ میری میڈیکل رپورٹ تم بھی بار بار پڑھ چکی ہو۔ جس میں ہر بات بہت واضح انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ میرا ڈاکٹروں کے دیئے ہوئے وقت سے پہلے مر جانا تو ممکن ہے' لیکن اس کے بعد زندہ رہنا ناممکن ہے۔

تمہاری یا ہماری اولاد کی محبت مل کر بھی میری میڈیکل رپورٹ نہیں بدل سکتی۔ آج مرتے ہوئے مجھے صرف تمہاری فکر ہو گی۔ میرے دل پر صرف ایک بوجھ ہو گا۔ کل ہماری

اولاد ہو گی تو میرے لیے سکون سے مرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ میری سوچ ان لوگوں سے بہت مختلف ہے' جو اولاد کو صرف ماں کی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک باپ کا کام صرف اولاد کو معاشی تحفظ دینا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک باپ معاشی سہارے سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اولاد کو قدم قدم پر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اولاد ہر قدم پر اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اس پر فخر کرنا چاہتی ہے اور میرے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ اپنی اولاد کا پہلا اٹھتا قدم دیکھ سکوں' نہ ہی میں نے کوئی ایسا کام کیا ہے' جس پر میری اولاد فخر کر سکے لہٰذا میں اولاد کے حق میں نہیں ہوں۔''

میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔

''اور تم اس بھری دنیا میں مجھے بالکل تنہا کر دینا چاہتے ہو۔''

''مائنڈ مت کرنا سجو! لیکن میں اس شادی کے حق میں بھی نہیں تھا۔ یہ تمہاری ضد تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہاری ازدواجی زندگی مختصر ترین ہو گی۔ یوں بھی میرا نہیں خیال کہ ہمیں ایک انسانی زندگی کو اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھانے کا کوئی حق حاصل ہے۔''

''ہر بچہ والدین کے ہوتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں پا سکتا۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم ہو گے تو تمہاری اولاد سب کچھ حاصل کر لے گی اور نہیں ہو گے تو اس کے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔''

''میں نے یہ سب نہیں کہا۔ کوئی بھی والدین اپنے بچے کو سب کچھ نہیں دے سکتے۔ نہ ہی میرا یہ دعویٰ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے میرے بچوں کو سب کچھ ملے گا اور میری عدم موجودگی میں کچھ بھی نہیں' لیکن یہ طے ہے کہ باپ یا ماں کی کمی سے بچے ضرور اپنے اندر خلا محسوس کرتے ہیں۔ بچے یا تو غیر ضروری طور پر جذباتی ہو جاتے ہیں یا بالکل جذبات سے عاری' باپ کی غیر موجودگی بچوں میں عموماً عدم تحفظ کے احساس کو جنم دیتی ہے۔

مجھے دیکھو میں اپنی ماں سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن اب انہیں دیکھ کر ایک دم بیزار ہو جاتا ہوں۔ بیٹا اکلوتا ہو اور بستر مرگ پر پڑا ہو تو ماں ذہنی طور پر ہی نہیں' جذباتی طور پر بھی عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے۔

اور کل جب تم تنہا رہ جاؤ گی تو تمہاری تمام تر توجہ کا مرکز بھی کوئی اکلوتا بیٹا یا بیٹی ہو گی۔ تم اس کا اتنا زیادہ خیال رکھو گی' اس سے اتنی زیادہ امیدیں وابستہ کرو گی کہ اس کی شخصیت بھی

عدم توازن کا شکار ہو جائے گی۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب بحیثیت فرد ہمیں ہر شخص کو آزادی دینا پڑتی ہے۔ نہ دیں تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو سکتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آزادی کی طلب کرتے کرتے ہی پرندہ اُڑنا بھول جاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ہی غلط اور تکلیف دہ ہوتی ہیں اور بالآخر ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔

ایک نارمل زندگی میں نارمل انداز سے چلتے ہوئے ایسے مسائل والدین مل جل کر حل کر لیتے ہیں۔ حل نہ کر سکیں تو بھی مل جل کر صورت حال کا سامنا کر لیتے ہیں۔ نہ یہ پریشانیاں تنہا کوئی مرد حل کر سکتا ہے اور نہ تنہا کوئی عورت۔ پھر ماں باپ تو اپنی قبروں کی راہ لیتے ہیں۔ ان کی غلطیوں یا کوتاہیوں کی سزا بھگتنے کے لیے اولاد حالات کے تھپیڑے کھانے کے لیے تنہا رہ جاتی ہے۔

جانتے بوجھتے میں اپنی اولاد کو ایک تکلیف دہ زندگی نہیں دے سکتا۔ نہ ہی تمہیں ایسی زندگی دینا چاہتا ہوں جو تمہارے لیے سزا بن جائے۔ پہلے ہی میری محبت تمہارے پاؤں کی زنجیر بن چکی ہے۔ کاش تم سے ملتے وقت مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی کے دن اتنے گنے چنے ہیں' میں کبھی تمہاری طرف نہ بڑھتا۔ اپنی اس خود غرضی پر خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔ تم سے شادی کی ہامی بھرتے ہوئے میں نے صرف اپنے بارے میں سوچا تھا۔ کاش تمہارے بارے میں بھی سوچا ہوتا۔''

''میں نے اپنی مرضی سے یہ بندھن باندھا تھا اور میں اس سے مطمئن ہوں' لیکن پلیز تم اس قنوطیت سے باہر نکلو۔ تمہاری سوچ کا دھارا مفروضات کی سمت بہہ رہا ہے۔ مفروضات غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے سوچو۔'' میں نے اس سے کہا۔

''میں نے اس پر بہت سوچا ہے اور بار بار سوچا ہے۔ ایک نہیں بیسیوں زاویوں سے سوچا ہے۔ میں نہ جانتا کہ میں مر رہا ہوں تو اور بات تھی' اب یہ جاننے کے بعد محض اپنی ایک لمحے کی خوشی کی خاطر میں ایک انسان کو خود غرضی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔'' اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

میں جب بھی یہ ذکر چھیڑتی تھی تو کبھی وہ چڑ جاتا تھا اور کبھی بہت تحمل کے ساتھ مجھے اس خود غرضی کے نفسیاتی' عقلی اور جذباتی پہلو سمجھاتے ہوئے اس خیال کو رد کر دیتا تھا۔ جتنی اس کے انکار میں شدت آ رہی تھی اتنا میرا اصرار بڑھ رہا تھا۔ جتنا وہ اپنے موقف میں سخت ہو رہا

تھا۔ اسی قدر میری خواہش بڑھ رہی تھی۔

دوسری طرف تیمور کا لکھنے کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ اس بارے میں اس کی ممی کے ساتھ کئی معرکے ہو چکے تھے لیکن اب کی بار میں کمپرومائز پر تیار نہیں تھی۔ اس کی زندگی کے بقیہ چند دن مجھے بہت عزیز تھے۔ جس گھٹن کا وہ مسلسل شکار ہوتا جا رہا تھا' میں اسے اس گھٹن سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ اب وہ تین اخباروں کے لیے لکھنے لگا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ وہ بولتا جاتا تھا اور میں لکھتی جاتی تھی۔ پھر اپنا لکھا ہوا پڑھ کر اسے سناتی تھی۔ وہ اضافہ و ترمیم کرتا تھا' پانچ چھ مرتبہ اسی طریقہ کار سے گزرنے کے بعد میں کمپیوٹر پر آرٹیکل ٹائپ کرتی تھی۔ اس وقت وہ باقی کی نوک پلک سنوارتا تھا اور بالآخر آرٹیکل تیار ہو جاتا تھا۔ ممی کو ہماری اس سرگرمی کا علم ہو جانے کے بعد ہمیں ان کے سونے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا اور یوں ہم اپنی مرضی کے ساتھ بعض اوقات سارا دن اسی کام میں صرف کر دیتے تھے۔

اس کام میں میری دلچسپی صفر تھی۔ جن موضوعات پر وہ مجھے لکھواتا تھا' وہ سب بہت بور اور ڈل لگتے تھے اتنی دیر تک اس انتہائی بور کام کو کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ تیمور اب بھی اپنی زندگی کو اہمیت دے' اسے احساس ہو کہ اس کی زندگی صرف اس لیے نہیں ہے کہ چند دن بعد اسے موت کے حوالے کر دے' اس کی زندگی اب بھی اہم ہے' اسی کے لیے نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کے لیے۔ رات کو تیمور کی ممی کا معمول تبدیل نہیں ہوا تھا۔ دن رات اس مسلسل بے آرامی نے مجھے بُری طرح سے تھکا دیا تھا مگر میں پھر بھی مطمئن تھی۔

☆======☆======☆

''مجھے لگتا ہے تم بور بھی ہو رہی ہو اور تھک بھی گئی ہو۔'' میں کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی ہی تھی کہ اس نے مجھ سے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے فلاپی ڈسک اندر ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ بعد میں کر لینا' مجھے اندر گھٹن محسوس ہو رہی ہے چلو سوئمنگ پول چلتے ہیں۔'' اس نے کمپیوٹر بند کر کے مجھے اُٹھایا۔

''کبھی سوئمنگ کی ہے؟'' پول کی طرف جاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں بلکہ مجھے تو پانی سے اچھا خاصا خوف آتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہت افسوس ہوا یہ سن کر' میری ممی بہت زبردست سوئمر ہیں' ان سے سیکھ لو۔'' اس نے

ساتھ چلتی ممی کو دیکھ کر کہا۔

انہیں جیسے ہی خبر ہوئی تھی کہ تیمور کا سوئمنگ کا ارادہ تھا' وہ بھی ساتھ آ گئی تھیں۔

ممی نے ڈانٹنے کے علاوہ میرے ساتھ باقی گفتگو کا سلسلہ موقوف کر رکھا تھا' اس لیے تیمور کی بات پر تبصرہ کیے بغیر مجھے نظر انداز کر کے چلتی گئیں۔

تیمور پانی میں اُترا تو مجھے بے چینی ہونے لگی۔ اس کی ممی کنارے پر قدرے دور کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی تھی جو پانی میں اُتر رہی تھیں۔ تیمور ڈائیو لگانے لگا تو میری بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ مجھے اس کے چہرے پر اسی طرح تکلیف کے آثار دکھائی دے رہے تھے' جس طرح پہلے دوروں سے پہلے اُبھرے تھے۔ تیرتے ہوئے وہ سیڑھیوں کے قریب آیا۔

''اتنا ڈر لگتا ہے پانی سے کہ دور کھڑی ہو۔'' اس نے سیڑھیوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

''نہیں اتنا بھی نہیں لگتا۔''

''پانی میں نہیں اتر رہیں تو بھی اندر پاؤں ڈال کر بیٹھ جاؤ' انجوائے کرو گی۔'' وہ بولا۔

''تم پانی میں کھینچو گے تو نہیں؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''نہیں کھینچوں گا۔''

''پرامس؟''

''بالکل پرامس۔''

جوتے اُتار کر میں نے پاؤں پانی میں ڈال دیئے۔ وہ تیرتے ہوئے کبھی دور نکل جاتا تھا اور کبھی میرے پاس آ کر باتیں کرنے لگتا تھا۔

''تیمور! تم تھک تو نہیں گئے؟'' میں نے اس کے پیلے پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ پھر پانی میں غائب ہو گیا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اور وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر اسے شکست دینا چاہتا تھا۔

''تیمور! باہر نکلو' چلو اب پلیز آرام کرو۔'' میں تشویش سے تقریباً چلا اٹھی۔

دونوں لائف گارڈ چوکنا ہو گئے۔ اس کی ممی اُٹھ کر تیزی سے میرے پاس چلی آئیں۔

''تیمور۔'' سب سے بے خبر میں پھر چلائی۔

وہ پانی سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ تیرتا ہوا میری طرف آیا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر بہت ہی نمایاں تھے۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر نکلا تو اس کے لیے وہیل چیئر آ چکی تھی۔

''نہیں' میں خود چل کر جاؤں گا۔ آج آخری دم تک اپنی بیماری سے فائٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے وہیل چیئر پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

میں نے چاہا کہ وہ میرا سہارا لے لے' لیکن اس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اس کی ممی کا چہرہ بھی پیلا پڑ رہا تھا وہ اس کی منت کر رہی تھیں مگر اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ چلتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ ضبط کی کوشش میں اس نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے ایک جگہ وہ ساکت کھڑا ہو گیا اور پھر آگے بڑھنے کی کوشش میں گر گیا۔

میں چیخ کر اس پر جھک گئی۔ ممی ملازموں کو پکارنے لگیں۔

''میں فائٹ کروں گا۔ آخر دم تک فائٹ کروں گا۔'' بہت مدھم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ٹوٹتے ہوئے فقرے لیکن پُرعزم لہجہ۔

ملازموں نے اسے گاڑی میں لٹایا اور اس سے قبل کہ ڈرائیور آتا' میں خود کار لے کر کلینک کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

اس مرتبہ اٹیک بہت سخت تھا اور علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ جب تک اسے طبی امداد نہیں مل گئی تھی' مجھے ایک ایک لمحہ' ایک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ پاپا اور نبیلہ کو علم ہوا تو وہ بھی آ گئے۔ تیمور کے پاپا بھی آ گئے تھے۔ ممی تو پہلے ہی موجود تھیں۔

اس کی حالت سنبھل گئی تھی' مگر اسے کافی دن ایڈمٹ رہنا پڑا۔ اس مرتبہ اس کی قوتِ گویائی بھی متاثر ہوئی تھی۔ اس بات نے اس کے ذہن پر سخت منفی اثر ڈالا تھا۔ نہ صرف اس کی قوتِ ارادی ختم ہوئی تھی' بلکہ اسے زندہ رہنے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میری تمام تر محنت ایک مرتبہ پھر اکارت چلی گئی تھی۔

''لیکن ابھی وہ زندہ ہے' میں اس چیلنج کو پھر قبول کرتی ہوں۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے زندگی کی طرف لاؤں گی۔ اس سے وابستہ مسرتوں کی طرف لاؤں گی۔'' میں نے تہیہ کیا۔

جس روز اسے ڈسچارج کیا جانا تھا' میں نے اپنی خواب گاہ کو پھولوں سے بھر دیا۔ اس کی بیماری کے دوران صحت یابی کی دعاؤں کے ساتھ جتنے کارڈز آئے تھے سب کو میں نے سجا دیا' ڈیکوریشن تبدیل کی' رنگوں کا امتزاج بدل دیا۔

وہ خواب گاہ میں داخل ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے چہرے پر کہیں اچانک حیرت یا مسرت کی کوئی چمک ابھرے گی۔ اور میں اس حوالے سے اس کی خوشیوں کی راہ تعین کر سکوں گی' مگر وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ جا کر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

یہ امتحان بہت مشکل تھا۔ وہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا میری کسی بات کے جواب میں اس نے آنکھیں کھول کر ہوں' ہاں' کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔

''تیمور! میں ترس گئی ہوں تم سے بات کرنے کے لیے تمہاری آواز سننے کے لیے۔''

بالآخر میں روہانسی ہو گئی۔

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔

''پلیز! کچھ تو بولو۔''

''کہنے کو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' اس کی زبان لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں ہار گیا ہوں اپنی بیماری سے۔ اس سے کوئی نہیں جیت سکتا' میں بھی نہیں جیت سکتا۔ یوں بھی میں کب اتنا اسپیشل ہوں۔ ایسا ہونا تھا بالآخر۔''

''نہیں تیمور!'' میں نے محبت سے کہا۔ ''گر جانا ہار نہیں ہوتی' گر کر نہ اُٹھ سکنا ہار ہوتی ہے۔ زندگی میں ہر شخص کبھی نہ کبھی گرتا ہے۔ ایک مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ گرتا ہے' پھر اُٹھتا ہے' پھر گرتا ہے اور پھر اُٹھتا ہے۔ تم نے ہر مرتبہ اپنی بیماری پر فتح پائی ہے' اب بھی تمہیں اُٹھنا ہے۔ تمہاری ضرورت صرف تمہیں نہیں ہے۔ مجھے بھی ہے ممی اور پاپا کو بھی ہے' تمہارے ریڈرز کو ہے' تمہیں ہماری خاطر ایک مرتبہ پھر صحت یاب ہونا ہے۔''

اس نے کچھ کہے بغیر نفی میں سر ہلایا اور آنکھیں موند لیں۔

''آنکھیں کھولو تیمور پلیز کچھ بولو۔'' میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

اس نے آنکھیں کھولیں' وہاں مایوسیاں تیر رہی تھیں۔

''میری اپنی آواز میرے لیے اجنبی ہو گئی ہے۔ سو میں بولنا نہیں چاہتا۔''

یہ کہہ کر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

اسی روز سے میں خوفزدہ تھی۔ اس نے بہت بہادری سے اپنی بیماری کا مقابلہ کیا تھا۔ اس دوران نفسیاتی طور پر وہ بہت تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار رہا تھا۔ کبھی زندگی چھن جانے کا خوف اسے زندگی سے محبت کرنے پر اکساتا تھا' لیکن اپنے خوف کو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کبھی وہ خاموش ہو جاتا تھا' کبھی جارحیت پسند اور کبھی سخت بدمزاج اور چڑچڑا' لیکن اس سے پہلے وہ خود ترسی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اب اپنی بیماری کے سامنے اس نے بالکل ہی ہتھیار پھینک دیئے تھے۔ وہ بری طرح سے مایوس ہو گیا تھا۔ یہ وہ اسٹیج تھی' جہاں سے بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے مریض کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ پھر بھی میں مایوس نہیں تھی۔ اب بھی میں نے اپنے گرد ایک خواب بُن لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے اور بہت جلد ختم ہو جائے گی۔

ہر روز میں اسے اخبار سے خبریں پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ زبردستی لان میں سیر کے لیے جایا کرتی تھی۔ وہ جواب دیتا تھا یا خاموش رہتا تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر میں اس کے ساتھ روزمرہ کی ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی۔

مگر جب میں نے اسٹڈی میں چل کر ادھورا آرٹیکل پورا کرنے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

''نہیں۔''

دوسرا کوئی لفظ بھی کہنے کی زحمت نہیں کی۔ وقتی طور پر میں چپ ہو گئی' لیکن وقفے وقفے سے دبے دبے انداز میں اسے اس کام پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے دوستوں سے رابطہ کیا۔ ان سے بھی جن سے اس کی ملاقاتیں بہت مختصر رہی تھیں۔ انہیں گھر آنے کی دعوت دی۔ نیلوفر اور ہمایوں اس واقعے کے بعد اکثر آنے لگے تھے۔

''ہجو! تو پتھر سے سر پھوڑ رہی ہے خود زخمی ہو جائے گی' اس میں سوراخ نہیں ہو گا۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''میرے بس میں اسی قدر ہے کہ میں کوشش کرتی رہوں اور جب تک مجھ میں حوصلہ ہے' میں ایسا کرتی رہوں گی۔''

اردگرد کے گھروں کے بچوں کو جمع کر کے تیمور کو بلا لائی۔ بچوں کی دلچسپ باتیں اور حرکتیں بھی اس کی آنکھوں سے مایوسی کے ڈیرے ختم نہ کر سکیں۔ پھر ان ڈور گیمز لائی لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ اپنی طرف سے جو کچھ میرے بس میں تھا میں کر رہی تھی۔

جس روز اخبار میں اس کا آخری آرٹیکل چھپا میں نے اخبار اس کے سامنے پھیلا دیا۔

''یہ دیکھو' اسٹاک میں رکھا ہوا تمہارا آخری آرٹیکل بھی پبلش ہو گیا ہے۔ کتنے دن سے میں میگزین ایڈیٹر کو ٹال رہی تھی۔ آج اس کا فون آیا تو میں نے کہہ دیا کہ آرٹیکل بالکل تیار ہی سمجھیں۔ کل تک ان شاء اللہ میں بھجوا دوں گی۔ دیکھو اب مجھے شرمندہ مت کروانا۔ ابھی تو وہ بتا رہا تھا کہ.....''

بات میرے منہ ہی میں تھی کہ تیمور نے اخبار میرے ہاتھ سے لے کر پھاڑ کر پھینک دیا۔

''تیمور! کیا کر رہے ہو؟'' میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے لینے کی ناکام کوشش کی۔

''دفع ہو جاؤ' تم' میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ مصنوعی تنفس کے سہارے کب تک زندہ رکھ پاؤ گی مجھے؟ میں جینا ہی نہیں چاہتا۔''

''میرے ہاتھ میں اتنی قدرت کہاں ہے کہ میں کسی کو زندگی دے سکوں۔ تم ابھی زندہ ہو' سانس لے رہے ہو' جیتے جاگتے انسانی وجود ہو اور زندگی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں' جنہیں پورا کرنا پڑتا ہے۔''

''زندہ رہنے کے تقاضے پورے کر رہا ہوں۔ کھا رہا ہوں' پی رہا ہوں' سانس لے رہا ہوں اور کیا چاہتی ہو تم؟''

''زندہ رہنے کے لیے صرف اتنی حاجات اور خواہشات تو جانوروں میں بھی ہوتی ہیں۔ انسان کو ان سے کچھ افضل ضرور ہونا چاہیے۔''

''بحث مت کرو..... مت کرو بحث' دفع ہو جاؤ یہاں سے' میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔''

ایسے وقت میں' میں نے وہاں سے اُٹھ آنا ہی بہتر سمجھا' لیکن میرے دل پر اور بوجھ بڑھ گیا تھا۔ نہ جانے خاموش رہ کر وہ کیا سوچا کرتا تھا کہ اب اچانک ہی جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی خوف کے پیش نظر میں اسے مصروف رکھنے کے لیے کوشش کرتی تھی۔ جو پہلے تو صرف اس کی ممی کو ناگوار گزرتا تھا۔ اب اسے بھی برا لگنے لگا تھا۔ میری ہر کوشش کا نتیجہ صفر نکل رہا تھا مگر میں اب بھی مایوس نہیں تھی۔

جس جنون کا مظاہرہ اس نے ایک مرتبہ کیا تھا پھر اس کا مظاہرہ بار بار کرنے لگا۔ وہ بالکل خاموش رہا کرتا تھا اور پھر اچانک میری ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا بلکہ بعض اوقات تو میں محسوس کیا کرتی تھی کہ اگر اس کے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو شاید وہ مجھ پر کھینچ مارتا۔ ہر روز کے ساتھ میری ذہنی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا ماحول میں نے شادی کے بعد ہی دیکھا تھا شادی سے پہلے میں نے ایک بالکل مختلف زندگی گزاری تھی' جس میں میرے علاوہ کسی نے اپنے رویوں میں شدت پسندی کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا تھا' اور چونکہ میری بات مان لی جاتی تھی' اس لیے میرے رویے کو بھی ضد پر تو محمول کیا جا سکتا تھا۔ شدت پسندی اس کے لیے خاصا سخت لفظ ہوتا۔

وہ راکنگ چیئر پر خاموشی سے بیٹھا سوچ میں گم تھا اور میں فلور کشن پر کتاب گود میں رکھے بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ جسم

کے مقابلے میں اس کا سر کہیں بڑا لگنے لگا تھا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا تھا۔

سرما کی جاتی دھوپ' اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس کی آنکھیں قدرے مندی ہوئی تھیں۔ اچانک وہ کسی بات پر ہنسا تھا اور مجھے وہ ہنسی بہت خوبصورت لگی تھی۔ پھر دھوپ سے چمکتے اس کے بالوں کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ اگر وہ ماڈلنگ کی طرف آ جائے تو تہلکہ مچا سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یہی احساس ہوا تھا جیسے وہ جی۔ کیو کے مضمون سے نکل کر سانس لیتی' جیتی جاگتی دنیا میں چلا آیا ہو۔ کوئی خوش ذوق لڑکی اسے نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔

اور آج سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس وقت کو بیتے زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا تھا۔ خاموش بیٹھا کرسی پر جھولتے ہوئے وہ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر وحشت ہونے لگی تھی۔ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تھی' لیکن مجھے لگ رہا تھا' جیسے وہ خودکشی کر رہا تھا۔ یوں زندگی کی گہما گہمی سے ناتا توڑ کر وہ اپنے آپ کو وقت سے پہلے موت کے حوالے کر رہا تھا۔

''تیمور؟'' میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔

''اتنی زبردست کتاب ہاتھ لگی ہے۔ تمہاری محبت کا ایک اچھا اثر ہوا کہ پہلے جو کتابیں بہت خشک اور بور لگتی تھیں اب وہ دلچسپ لگنے لگی ہیں' جیسے اسی کتاب کو دیکھ لو۔'' میں اُٹھ کر اس کے قریب والے صوفے پر آ بیٹھی۔

''میں تو حیران ہوں دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق پڑھ کر اپنی زندگی پر افسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم نے تو کچھ بھی نہ کیا۔''

اپنی بات کا اثر میں اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتی تھی مگر وہ بالکل سپاٹ تھا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔

''ایک Physiost ہے۔ کیا کہیں گے' ہاں ماہر طبیعات۔ اسے آج کے دور کا آئن سٹائن سمجھا جا سکتا ہے۔ تھیوریٹیکل فزکس میں اس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ اس نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں' لیکن یہاں لکھا ہے کہ اس کی کتاب Brief history of time نے تو سب ریکارڈ توڑ دیئے ہیں پسندیدگی کے۔ اس سائنسدان کا نام ہے اسٹیفن ہاکنگ' یہ

سب باتیں تو کوئی حیران کن نہیں ہیں کیوں کہ بہترین سائنسدان تو بے شمار ہیں اور گزرے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ایک ایسی بیماری کا شکار ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ٹھہرو میں تمہیں اس کا نام بھی بتاتی ہوں۔'' میں نے کتاب کے صفحے پلٹنے شروع کیے۔

''ہاں یہ لکھا ہے Amyotrophic Lateral Sclerosis اس بیماری میں انسان کا دماغ متاثر ہوتا ہے صرف یادداشت اور سوچ باقی رہ جاتی ہے' اس کے علاوہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ جسم پر دماغ کا کنٹرول بھی نہیں رہتا۔ یوں جسم بالکل مفلوج ہو جاتا ہے اور انسان عملی طور پر پہلے ناکارہ ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔

ہاکنگ کو بھی ڈاکٹروں نے صرف دو سال کی مہلت دی تھی۔ تب وہ کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کر رہا تھا اور بمشکل بیس' اکیس برس کا تھا۔ اب ماشاء اللہ پچاس پچپن سال کا ہو گیا ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں بڑے بڑے دھماکے کر چکا ہے۔ بولنے' چلنے پھرنے ہر چیز سے معذور ہے' لیکن اس کی کا اس نے اپنی زندگی پر اثر نہیں ہونے دیا۔''

تیمور اچانک اُٹھا۔ کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر اس کے صفحے پھاڑے اور پھر پھٹی ادھڑی کتاب میرے منہ پر دے ماری۔

''دفع ہو جاؤ تم۔ کان پک گئے ہیں میرے' تمہاری اس قسم کی بکواس سن سن کر۔'' اس نے مجھے دھکا دے کر کہا۔

اس طرح کبھی کسی نے مجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا۔ پہلی مرتبہ آج یہ دکھ میں نے محبت کرنے والے شوہر کے ہاتھ سے اُٹھایا تھا۔ میں شاک کے سے عالم میں کھڑی رہ گئی۔

''تم جاتی ہو یا میں تمہیں دھکے دے کر باہر نکالوں۔'' وہ چلا کر میری طرف بڑھا۔

میری آنکھوں کے سامنے ہر منظر دھندلا ہو رہا تھا۔ ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کر کے میں کمرے سے نکل آئی۔

اس کی اسٹڈی کا دروازہ بند کر کے میں بری طرح سے رو دی۔ اپنی عزتِ نفس مجھے بہت عزیز تھی۔ تیمور کا یوں مجھ پر ہاتھ اٹھانا میرے لیے قیامت سے گزرنے کے برابر تھا۔ یہ منظر کسی نے نہیں دیکھا تھا مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ انسان کی اہمیت سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر تو خود اپنی نظر میں ہوتی ہے۔ دوسروں سے اپنی عزت کروانے کے لیے خود اپنی عزت کرنا پہلے ضروری ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بیمار تھا اور بیماری کی ایسی اسٹیج پر پہنچ چکا

تھا' جہاں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہونے لگتی ہیں' لیکن میں بھی تو انسان تھی۔ مجھ میں بھی ہر عام انسان کی طرح خوبیوں کے ساتھ بہت سی خامیاں بھی تھیں۔ میں پیغمبر یا ولی نہیں تھی کہ ہنس کر سب دکھ' غم' تکلیفیں برداشت کر لیتی۔ چوٹ لگتی تھی تو مجھے درد بھی ہوتا تھا' رونا بھی آتا تھا اور چوٹ پہنچانے والے پر غصہ بھی آتا تھا۔

مگر یہ سب کیفیتیں میرے اندر بند رہتی تھیں۔ کبھی چھپ کر راتوں کو رو لیتی تھی اور اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

آج بھی بہت رونا آ رہا تھا' غصہ بھی انتہا کا تھا مگر اپنی ذات کے علاوہ کون تھا' جس پر یہ سب ظاہر کرتی۔ مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر تک اس کیفیت کا شکار رہی تھی۔ اسٹڈی سے باہر نکلی تو شام ہو چکی تھی۔

خواب گاہ میں آئی تو وہ راکنگ چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ اسے نظر انداز کر کے میں ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی اور میڈیسن کے ڈبے سے سر درد کی گولی نکال کر کھانے لگی۔

''سجو!''

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''آؤ' میں نے تم سے بات کرنی ہے۔''

میں گولی پانی سے نگل کر کمرے میں آ گئی۔ فلور کشن پر اس کی راکنگ چیئر کے سامنے بیٹھ گئی تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ ہمارا رشتہ میرے لیے بوجھ بننے لگا ہے۔ میں نے بہت بڑی خود غرضی کا ثبوت دیا تھا کہ ایسی حالت میں تم سے شادی کی اور تمہاری زندگی کو جہنم بنا دیا۔''

میں کچھ کہنے لگی تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''تم کچھ نہیں بولو گی' آج صرف سنو گی۔ میرے اندر بہت غبار جمع ہو چکا ہے۔ میں نے تم سے شادی کی یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ مجھے تم سے شدید محبت تھی۔ اتنی کہ تم اتنا سوچ بھی نہیں سکتیں میں نے تمہیں چھوڑنے کی کوشش کی تو بھی نیم دلی سے۔ میرا دل تب بھی تمہارے لیے دھڑکتا تھا۔ صرف تمہارے بارے میں سوچتا تھا۔ خود سے زیادہ مجھے تمہاری فکر تھی۔ میں تمہاری زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن دل کے ایک

گوشے میں یہ تمنا اسی طرح موجود تھی۔ میں سب کچھ کھو رہا تھا' لیکن تمہارا ساتھ نہیں کھونا چاہتا تھا یہ بات میرے لیے زندگی کھو دینے سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

اسی لیے جب تم آئیں تو میں تمہیں خود سے دور نہ کر سکا۔ میری محبت اپنی غرض کے بجائے تمہارے لیے ہوتی تو میں تب بھی پیچھے ہٹ سکتا تھا' لیکن میں بہت کمزور انسان تھا۔ پھر تم نے شادی کی خواہش کا اظہار کیا' تب بھی میرا انکار' انکار نہیں تھا۔ دل سے میں ایسا ہی چاہتا تھا۔ ہر روز تم سے ملنے کے بعد اس خواہش کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا' جب تم مجھے چھوڑ کر واپس جاتی تھیں تو میرے ذہن میں تمہارے علاوہ کوئی خیال نہیں آتا تھا۔ تم سے انکار بھی نیم دلانہ تھا۔ میں نہ چاہتا تو تمہارا اصرار مجھے اس شادی پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

شادی کے بعد ہر روز پہلے سے بڑھ کر مجھے احساس ہوتا گیا کہ میں کتنا خود غرض تھا۔ تمہاری ساری زندگی تباہ کر دی میں نے اور جواب میں کچھ بھی نہ دے سکا۔ میں جانتا ہوں کہ ماں بننا تمہاری کتنی شدید خواہش ہے میں تمہیں یہ خوشی بھی نہیں دے سکتا کیونکہ تمہاری خاطر بھی میں ایک تیسری زندگی کو تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس ایک خود غرضی نے ہی مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے' کوئی اور خود غرضی اب میں کبھی نہیں کر سکتا۔

میں دیکھتا رہا کہ تم نے میری خاطر کتنی قربانیاں دیں۔ اپنے آپ کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ممی کے ہاتھوں قدم قدم پر تمہاری عزت نفس مجروح ہوتی رہی پھر بھی تم خاموش رہیں۔ تمہاری اس خاموشی کو اپنی محبت سمجھ کر میں نے اپنے دل میں جگہ دینے کی کوشش کی' لیکن ہوا یہ کہ تمہارا رویہ ہر روز میرے لیے تکلیف دہ ہوتا گیا۔ تمہاری خاموشی اور تمہاری قربانیاں مجھے الجھن میں مبتلا کرنے لگیں۔ تم بیوی سے زیادہ دیوی لگنے لگتیں۔ انسان کبھی تو تکلیف کا اظہار کرتا ہے' شکایت کرتا ہے' احتجاج کرتا ہے' تم نے کہا تھا کہ تم اس شادی کو نارمل شادی کی طرح ٹریٹ کرنا چاہتی ہو' لیکن ایسا ہوا نہیں۔ تم نے میرا اتنا خیال رکھا کہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا۔ پھر بھی میں نے چاہا کہ تم سے محبت کیے جاؤں' خود کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میری بیوی محبت کیے جانے کے قابل ہے لیکن تم بیوی کم دیوی زیادہ لگنے لگی تھیں۔ مجھ سے دور بہت اونچی' بہت اعلیٰ و ارفع جس نے میری خاطر اپنی جوانی برباد کی' زندگی تباہ کی' اپنا کیریئر ختم کیا اور کچھ نہ پا کر بھی مطمئن رہی۔

اس بات سے میں چڑنے لگا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس دیوی کی تضحیک کروں۔

اسے کیچڑ میں لتھیڑ دوں تا کہ وہ میرے برابر آ سکے۔ میرے جیسی ہو سکے۔ ایک عام انسان‘ ہم برابری کی سطح پر گفتگو کر سکیں۔

لیکن میرا دماغ مجھے ٹوکتا تھا‘ مجھے شرم دلاتا تھا مجھ سے کہتا تھا کہ میں اپنے اندر کی گندگی کو باہر نہ نکالوں۔ اپنی غلاظتوں کو اپنے اندر ہی رکھنا چاہیے انہیں سر عام مشتہر نہیں کرنا چاہیے۔

اب تک جو ہوا سو ہوا‘ لیکن آج میں تمہیں اس حقیقت سے باخبر کر رہا ہوں۔ تم دیوی بننا چاہتی تھیں تو میں نے دیوی مان کر تمہاری پرستش کر لی ہے۔ محبت کے مارے یہ تکلیفیں اُٹھا رہی تھیں‘ تو اب اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مرنے سے پہلے اب میری ضرورتیں بہت مختصر ہو گئی ہیں اور انہیں کوئی بھی پورا کر سکتا ہے‘ خواہش کوئی نہیں رہی۔ زندہ رہنے کی مجھے کوئی تمنا نہیں ہے تم محبوبہ رہو‘ بیوی رہو یا دیوی اپنی تکلیف میں نے خود ہی برداشت کرنی ہے۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکو گی۔ اب تک تم میرے ساتھ اس لیے نہیں تھیں کہ تمہیں میرے ساتھ کی ضرورت تھی بلکہ اس لیے تھیں‘ کیونکہ مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت تھی۔ اب میری ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ میں چاہوں بھی تو اپنے آپ کو اس خود غرضی کے لیے کبھی معاف نہیں کر سکتا‘ لیکن اسے میری مجبوری سمجھو۔ اب تمہارا ساتھ میرے لیے بوجھ بن رہا ہے۔ اس اذیت میں ہر لمحے اضافہ ہو رہا ہے کہ میں خود غرض ہوں۔ یہ خواہش بھی شدت پکڑتی جا رہی ہے کہ میں تمہاری عزتِ نفس بار بار مجروح کر کے تمہاری روح کو بھی آلودہ کروں۔ آج جو کچھ ہوا‘ وہ اسی خواہش کی شدت کا نتیجہ تھا۔

تم دیوی ہو تو مرنے سے پہلے مجھ پر ایک کرم اور کر دو۔ مجھے اس اذیت اور خواہش کی قید سے آزاد کرا دو۔ میرے گھر اور میری زندگی سے نکل جاؤ۔ میں اپنی زندگی کے بقیہ چند دن اپنے دل اور ذہن کی کشمکش میں بسر نہیں کر سکتا‘ نہ ہی اس اذیت کے ساتھ میں زیادہ دن بسر نہیں کر سکتا‘ نہ ہی اس اذیت کے ساتھ میں زیادہ دن رہ پاؤں گا۔ میرے دل پر ان باتوں کا اتنا بوجھ ہے۔ اب تم سامنے رہیں تو یا میں تمہیں قتل کر دوں گا یا میں خودکشی کر لوں گا۔“ پلیز میری زندگی سے نکل جاؤ‘ مجھے ان تکلیفوں سے نجات دلا دو۔“

میں اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قدرت کی اس ستم ظریفی پر ہنسوں یا روؤں۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میں اس کی محبوبہ تھی۔ بیوی یا دیوی جب مجھے خود خبر

نہیں تھی۔ ہاں اتنا تھا کہ ایک کاغذی رشتے کے باوجود بھی اب میں اس کی کچھ نہیں تھی کہ یہ رشتے لفظوں اور کاغذوں سے زیادہ محبتوں کے محتاج ہوتے ہیں اور اب وہ کبھی مجھ سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گھر جسے میں نے اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے چھوڑا تھا۔ میرے محبوب‘ میرے شوہر کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا‘ اس لیے میں پیدل ہی اس طرف چل پڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا اس لیے میں نے یہ بندھن باندھا تھا‘ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ہمارے تعلقات میں پہلی دراڑ کب پڑی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ محبت کرنے کے لیے ہمارے پاس گنے چنے دن ہیں‘ اس احساس نے ہمیں بہت قریب کر دیا تھا۔ اتنا کہ ہم ایک دوسرے کی سانسوں میں رچ بس گئے تھے۔ لمحے ہتھیلیوں سے ریت کی مانند پھسل رہے تھے اور میں سوچتی تھی کہ تتلیوں جیسے یہ پل جب میرے ہاتھ سے اُڑ جائیں گے تو ہتھیلی پر اتر آنے والے ان رنگوں میں ڈوب کر میں ساری زندگی بتا دوں گی۔

مگر خبر نہیں کیا ہوا تھا‘ پہلے چھوٹی سی دراڑ پڑی تھی ہم تب بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ہر شام چہل قدمی ضرور کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ دراڑ بڑھ کر خلیج کی طرح گہری ہو گئی۔ سلونی شامیں اماوس کی راتوں کی طرح گہری اور تاریک ہو گئیں اور میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا اس لیے میں نے یہ بندھن باندھا تھا۔

میرے احساسات پر برف جمی ہوئی تھی اچھا برا غیر اہم ہو چکا تھا۔ بس یہ خیال باقی تھا کہ میں نے اپنا آپ داؤ پر لگا کر جو کھیلا تھا اور ہار گئی تھی۔ جاتے ہوئے میرے ساتھ تیمور کی بہت سی محبت تھی خواب تھے‘ امیدیں تھیں‘ حوصلہ تھا‘ دعائیں تھیں اور آج شام کے ملگجے اندھیرے میں واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے میں بالکل خالی ہاتھ تھی۔ تہی دامن تھی۔ مجھ میں اب بھی بہت حوصلہ تھا لیکن جب تیمور کی محبت ختم ہو گئی تھی تو میرا حوصلہ کیا اہمیت رکھتا تھا۔ خواب اور امیدیں بکھر گئی تھیں‘ دعائیں عرش سے ٹکرا کر لوٹ آئی تھیں۔

☆======☆======☆

ڈیفنس کی ویران سی ذیلی سڑکوں پر ہولے ہولے چلتے میں تاریکی کی چادر میں لپٹے پاپا کے گھر کے گیٹ تک پہنچ گئی۔ اب تک کسی نے گیٹ کی بتیاں روشن نہیں کی تھیں نہ ہی اندر لان میں کوئی روشنی تھی۔

گیٹ کھول کر میں اندر داخل ہوگئی۔ دونوں کاریں گھر پر تھیں جس کا مطلب تھا کہ پاپا اور نبیلہ بھی اندر ہی تھے۔ مرکزی دروازہ بند تھا لیکن ہینڈل گھمانے پر باآسانی کھل گیا۔ لاؤنج سے ٹی۔وی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں وہیں ہولی۔

ہر منظر ویسا ہی تھا۔ نبیلہ فلور کشن پر بیٹھی تین قسم کے ریموٹ کنٹرول سامنے رکھے پرائم اسپورٹس پر لگنے والا ٹینس کا میچ ریکارڈ بھی کر رہی تھی اور بھرپور جوش وخروش سے آندرے آگاسی کا ساتھ بھی دے رہی تھی۔ پاپا اپنی راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے پیٹ سمپراس کی طرفداری کر رہے تھے۔ قریب ہی چائے کی ٹرالی بجی پڑی تھی جس سے وہ دونوں بے خبر تھے۔

''کبھی میں بھی اس زندگی کا ایک حصہ تھی۔ پھر محبتوں کے سراب میں اس طرح بھٹکی کہ یہ سب کچھ پیچھے رہ گیا۔'' دیوار سے ٹیک لگا کر ان کی جانب تکتے ہوئے میں نے سوچا۔ وہ جو میری آمد سے بھی بے خبر تھے۔

اسی لمحے نبیلہ کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پاپا نے میری جانب دیکھا۔

''سجو تم؟ آؤ ناں وہاں کیوں کھڑی ہو۔'' نبیلہ جلدی سے میری جانب بڑھی۔

پاپا کی آنکھوں میں کچھ خدشے' کچھ خوف اور کچھ سوال سر اٹھائے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میرے کپڑے شکن آلود تھے۔ بال صبح کے بعد پھر اب تک نہیں سنورے تھے۔ آتے ہوئے ناک کی کیل اور منگنی کی انگوٹھی کے علاوہ سارا زیور میں ممی کی خواب گاہ میں ان کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر چھوڑ آئی تھی۔ شادی کے بعد میں کبھی ایسے روپ میں یہاں نہیں آئی تھی۔

''تیمور ساتھ نہیں آیا؟ خیریت تو ہے سجو بیٹا' وہ ٹھیک ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ نبیلہ کو بھی کسی غیر معمولی بات کا احساس ہو چکا تھا۔

''پاپا اسے اندر تو آنے دیں۔'' اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور صوفے پر بٹھا دیا۔

''بیلا پانی دینا۔'' میں نے کہا۔ میری آواز میں لرزش تھی۔

''ابھی لاتی ہوں۔'' وہ جلدی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

پاپا میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔

''بیٹا! کیا ہوا؟''

مجھے لگا کہ الفاظ کہیں گم ہو چکے تھے۔ میں کہنا چاہتی تھی سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ اپنے اندر کا سارا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔ مگر سب کچھ بہت اندر' تہہ میں دفن تھا۔ پاپا کے سوال کے جواب میں' میں صرف نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

نبیلہ پانی لے آئی تھی۔ میں نے گلاس تھاما تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ بھی بری طرح کانپ رہے تھے۔ پاپا مجھے خود سے قریب کر کے اور گلاس میرے ہاتھ سے لے کر مجھے پانی پلانے لگے۔ نبیلہ نے جلدی سے ٹی۔وی بند کر دیا۔

''پاپا کچھ بتایا کیا ہوا؟ تیمور تو ٹھیک ہے؟'' نبیلہ کی گھبراہٹ میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

پاپا نے اشارے سے اسے کچھ بھی پوچھنے سے منع کر دیا اور مجھے خود سے لپٹا لیا۔ اس وقت مجھے ایسے ہی کسی سہارے ایسی ہی کسی چھاؤں کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف نبیلہ آ کر بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کوئی بھی منہ سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا لیکن ان کا لمس مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ میری ہر خوشی اور ہر غم کے شریک تھے۔ میں تنہا نہیں تھی۔ بے سہارا اور بے آسرا نہیں تھی۔ اب بھی میں اپنوں میں تھی' محبت کرنے والوں کے درمیان تھی۔

پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے اندر کا غبار میرے اندر ہی رہا۔ کوئی ایک لفظ ایک آنسو' ایک سسکی' ایک آہ تک نہیں نکلی۔

''کچھ تو بتاؤ بیٹا' کیا ہوا؟'' بالآخر پاپا نے پوچھا۔

''پاپا! اب تیمور کو میری ضرورت نہیں رہی' اس لیے میں چلی آئی۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ میرا لہجہ شکستہ تھا۔

وہ دونوں کچھ نہ سمجھے۔

''لیکن ہوا کیا؟'' نبیلہ نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔''

وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔ نمبر ڈائل کیا اور تھوڑے وقفے کے بعد بولی۔

''ہیلو' میں بیلا بول رہی ہوں۔ تیمور سے بات کروا دیں پلیز۔'' اس کا لہجہ مضطرب لیکن انداز میں نرمی تھی پھر وہ اچانک ہی بھڑک اٹھی۔ ''میں کہتی ہوں کیا کر کے بھیجا ہے میری بہن کے ساتھ۔''

میں تیزی سے خود کو پاپا کی گرفت سے چھڑا کر اُٹھی اور ریسیور بیلا کے ہاتھ سے چھین کر واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

''تم تیمور سے کوئی سخت بات نہیں کرو گی بیلا۔''

''میں تیمور سے نہیں اس کی ماں سے بات کر رہی تھی۔ وہ ذلیل عورت کس طرح ہمارے پاؤں پڑنے پر بھی تیار تھی۔ اور آج وہ اس بات پر بھی راضی نہیں تھی کہ میں تیمور سے بات کروں۔'' نبیلہ نے غصے کے مارے مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ پھر وہ پاپا کی طرف مڑی

''پاپا! آپ کیوں نہیں جاتے کیوں نہیں فون پر بات کرتے۔ یہ تو کچھ نہیں بولے گی اپنے منہ سے۔ آپ کیوں نہیں کچھ کرتے۔''

''نہ کوئی وہاں فون کرے گا نہ وہاں جائے گا۔ ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہوا پھر آپ کیا پوچھیں گے اور کس سے پوچھیں گے؟ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تیمور کو میری ضرورت نہیں ہے۔'' میری آواز دکھ اور کرب سے چیخ رہی تھی۔

''تیمور کو تمہاری ضرورت نہیں رہی' واہ کیا خوب بات ہے۔ کیا تم دونوں کا رشتہ ضرورت سے بندھا ہوا تھا؟''

وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بس بیلا کوئی ایسی بات نہ کہنا جو تیمور کے خلاف ہو۔ میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ہمارا رشتہ اب بھی قائم ہے' پلیز کچھ مت کہنا۔ مجھے سکون کے کچھ لمحے دے دو' میں ترس گئی ہوں سکون کے لیے۔''

میرا کمرا اب بھی ویسا ہی تھا۔ مجھے سکون کی ہدایت کر کے پاپا اور نبیلہ کچھ دیر میرے قریب بیٹھے رہے۔ میں آنکھیں موندے یوں ساکت پڑی رہی جیسے سو گئی ہوں لیکن جیسے ہی وہ باہر نکلے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''تیمور! یہ سب کیا ہوا کیوں آئے ایسے لمحے ہمارے بیچ۔ کاش میں موت کو تم سے دور دھکیل سکتی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ بس اتنا چاہتی تھی کہ تم موت سے پہلے نہ مر جاؤ تیمور۔ زندگی کے چند دن تمہیں اپنے اوپر بوجھ نہ لگنے لگیں۔ مگر افسوس میں یہ بھی نہ کر سکی۔

سب کچھ کتنا بدل گیا ہے تیمور۔ وہ دن کہاں کھو گئے جب تم میرے تھے' جب تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہر حال میں میرا ساتھ دو گے کبھی مجھے تنہا نہیں چھوڑ گے۔ میں نے صرف ایک بات کے یقین پر آنکھیں بند کر کے اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھما دیا تھا' کہیں بھی کسی بھی پل

میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا لیکن کیا میری محبت کا اتنا حق بھی نہیں تھا کہ تم اپنی آخری سانس تک کم از کم اپنا ایک وعدہ تو نبھاتے۔

کیوں اتنی بے بس ہو گئی ہوں میں۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش' سب سے شدید محبت کو بھی پا کر کھو دیا۔ کیوں ہو گیا ایسا۔''

مجھے خبر نہیں ہوئی کہ کب میری گھٹی گھٹی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔ وہ سب لمحے جو ہم نے ایک ساتھ بنائے تھے۔ میرے ذہن میں تازہ ہو گئے تھے۔ سردیوں کی وہ ٹھنڈی دھوپ اس کی قدرے مندی ہوئی آنکھیں' وہ ہنسی اور میری سوچ۔

''یہ کون ہے جو جی کیو کے صفحات سے نکل کر جیتی جاگتی دنیا میں چلا آیا ہے۔''

اور وہ پل جب اس نے نیلوفر سے کہا تھا۔

''نبیلہ کو دیکھ کر ایسا ہی ہوا ہے۔ میرے دل میں ایک گھنٹی سی بجی ہے۔ میرے وجدان نے کہا ہے کہ یہی تو ہے وہ جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی میں نے جان لیا تھا کہ اسی لڑکی کو میری زندگی میں آنا ہے میری دنیا آباد کرنی ہے۔''

آہ وہ لمحے کہاں کھو گئے جب اس نے میرا ہاتھ تھام کر وعدہ کیا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں تو ڈرتی کیوں ہو؟ میں تمہیں کسی خوش فہمی میں بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ زندگی اتنی آسان اور آرام دہ تو نہیں ہو گی۔ بس اتنا ضرور ہو گا کہ میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ کوئی دکھ' کوئی تکلیف تم تنہا نہیں جھیلو گی۔ میں ہوں گا تمہارے ساتھ۔''

پھر بھی اس نے مجھے تنہا کر دیا تھا۔ اپنی زندگی سے نکال کر پھینکا تھا۔ یہ کہہ کر کہ اب اسے میری ضرورت نہیں تھی۔ میرا ساتھ اس کے لیے بوجھ بن گیا تھا۔ یہ بندھن میں نے اپنی مرضی سے باندھا تھا۔ اس کی آخری سانس تک اس کا ساتھ نبھانے کی خاطر۔ اور اب اچانک راستے بدل گئے تھے۔

دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلا اور پاپا اور نبیلہ سخت پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہوئے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی اونچی آواز میں رو رہی تھی۔

''سجو۔'' بابا تیزی سے میری طرف بڑھے۔

''پاپا۔'' میں نے کہا اور ان سے لپٹ کر بری طرح سے رو دی۔

''سب کچھ ختم ہو گیا پاپا! میرے ہاتھ تو کچھ بھی نہیں آیا۔ یہ فخر بھی نہیں کہ میں نے خود

سے کیا وعدہ پورا کیا۔ ہم نے زندگی میں ہی اپنے راستے الگ کر لیے۔ میں نے ایسا تو کبھی نہیں
چاہا تھا۔ مجھ میں تو بہت حوصلہ تھا پھر بھی میں خالی ہاتھ رہ گئی۔''

مگر جو میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ کسی اور کے ہاتھ میں کب تھا۔

پاپا اور نبیلہ پہلے سے کہیں بڑھ کر میرا خیال رکھنے لگے تھے لیکن مجھے یہ سب بہت بے
معنی لگتا تھا۔ میرا دل اور میرا دماغ اسی چاردیواری میں رہ گیا تھا۔ جسے تیمور کے کہنے پر میں
چھوڑ آئی تھی۔

ہفتہ بھر ہو چلا تھا۔ میرے دن رات اب بھی تیمور کی فکر میں اس کی صحت کے لیے دعا
کرتے گزر رہے تھے۔ ایسے میں ہی اس کے پاپا کا فون آ گیا۔ نبیلہ نے مجھے اطلاع دی۔
میں نے جھپٹ کر موبائل ایکسٹینشن اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''پاپا' پاپا تیمور ٹھیک ہے' وہ خیریت سے تو ہے؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کہا پھر ایک آہ ان کے ہونٹوں سے نکلی۔ ''اب وہ جس
قدر ٹھیک ہو سکتا ہے' اتنا ٹھیک ہے۔''

میرے دل میں درد کی ٹیس سی اٹھی۔ آنکھوں میں اُتر آنے والے آنسوؤں کو دوپٹے
کے پلو سے پونچھا۔

''پھر اٹیک تو نہیں ہوا؟'' میں نے آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''جس روز آپ گئی تھیں' اسی رات ہوا تھا۔ آج کلینک سے واپس آ گیا ہے۔ درد میں تو
کمی ہے لیکن اب بمشکل بات چیت کر پاتا ہے۔ کینسر باقی جسم میں بھی پھیل رہا ہے۔''

میرا ضبط جواب دے گیا۔ آنسو سارے بند توڑ گئے۔

''آپ واپس نہیں آئیں گی بیٹا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں۔ میرے واپس چلے آنے سے وہ خوش نہیں ہو گا۔ نفسیاتی طور پر وہ ٹوٹ پھوٹ
گیا ہے۔ میرا وہاں جانا اسے صرف اور صرف تکلیف دے گا۔ اور میں اسے مزید کوئی دکھ
تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ اس کا حق ہے کہ زندگی کے آخری دن وہ سکون سے گزار سکے۔''

''زندگی کے آخری دن۔'' ان کے منہ سے جیسے سسکی سی نکلی۔ ''میں یہ دن نہیں دیکھنا
چاہتا۔ جو بیٹا! آپ تھیں تو میرا بھی حوصلہ تھا۔ اب اس گھر سے مجھے خوف آنے لگا ہے۔ میں
تیمور کو موت سے پہلے موت کے منہ میں جاتے دیکھ رہا ہوں اور اس کی ممی نیم پاگل ہو چکی

ہیں۔ علاج کروانے پر بھی راضی نہیں ہیں۔ میں نہ جانے کیوں روز آفس چلا آتا ہوں۔
کروڑوں روپے کے سودے کرتا ہوں۔ پہلے کی طرح ڈھیروں منافع کماتا ہوں اور ہر رات
سوچتا ہوں کہ یہ سب میں کس کے لیے کر رہا ہوں؟ وہ جو میرے تھے' مجھ سے دور ہو رہے
ہیں۔ یہ روپیہ' پیسہ' جائیداد' اسٹیٹس' دولت' وہ سب جس کے لیے میں برسوں سرپٹ دوڑتا رہا'
کس کے کام آئی؟

جو بیٹا! پلیز واپس آ جاؤ کہ مجھے اس چاردیواری میں کہیں زندگی کی حرارت محسوس
ہو۔''

''کاش پاپا' یہ میرے بس میں ہوتا۔''

انہوں نے آہ بھری۔

''پاپا پلیز۔ اتنی اجازت دے دیں کہ میں فون کر کے آپ سے تیمور کی خیریت معلوم
کرتی رہا کروں۔''

''اجازت کیسی' یہ تو آپ کا حق ہے۔''

میں بمشکل خود پر قابو پا سکی تھی کہ پاپا نے میری خواب گاہ کے دروازے پر دستک دیتے
ہوئے کہا۔

''بیٹا' فرو آئی ہے۔''

''پاپا یہیں بھیج دیں۔'' نبیلہ نے کہا پھر اُٹھ کھڑی ہوئی ''ٹھہرو'' میں خود اسے یہاں
لے آؤں۔''

اور خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں نیلوفر کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔

''جو۔ جو۔ یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا۔ ابھی اتنے دن بھی نہیں ہوئے تھے مجھے
کراچی گئے ہوئے اور پیچھے سے تم نے اپنا یہ حشر کر لیا۔'' وہ میرے قریب صوفے پر بیٹھ گئی
اور میرے ہاتھ تھام لیے۔

''میں ٹھیک ہوں' مجھے کیا ہوا ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''میں آتے ہی تیمور کی طرف گئی تھی' وہاں خبر ملی کہ......''

''پلیز فرو! یہ ذکر مت کرو۔ پہلے ہی جو بہت اپ سیٹ ہے۔ اچھا ہوا خود غرض لوگوں
کے بیچ سے بالآخر نکل آئی۔'' نبیلہ نے تلخی سے اس کی بات کاٹی۔

"بیلا پلیز۔ اس طرح مت کہو۔ تیمور بے بس ہے۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

نبیلہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیا سوچ کر بس کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔

نیلوفر کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر میری کیا دلچسپی تھی ان باتوں میں کہ ہمایوں کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کتنی کامیاب جا رہی تھی اور نیلوفر جو فیشن شو پی سی میں منعقد کروا رہی تھی وہ دوسرے فیشن شوز سے کس طرح مختلف تھا۔

جونہی نبیلہ چائے لانے کے لیے اُٹھی۔ نیلوفر نے بھی موضوع تبدیل کر لیا۔

تجو! وہ تمہیں یاد کرتا ہے بہت زیادہ۔"

"ہوں' جانتی ہوں' ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت یاد کرتے ہیں اور اس کی تو دنیا ہی اتنی محدود ہو چکی ہے۔ اس کے پاس یادوں کے علاوہ وہ کیا رہ گیا ہے۔ وہ جتنے دن جیے گا۔ دن میں سینکڑوں مرتبہ ایک ہی بات کو یاد کرے گا اور تھکے گا بھی نہیں۔"

"پھر ہوا کیا؟"

"جانے دو۔ اب اس میں کیا رکھا ہے۔"

"کوئی خوشخبری بھی نہیں ہے۔" اس نے قدرے تامل سے پوچھا۔

"نہیں۔" کہتے دل میں کیسی ٹیس اُٹھی تھی۔

"پتا نہیں تجو یہ اچھا ہے یا برا۔ ممکن ہے تمہاری آئندہ زندگی کے لیے یہ اچھا ہو' ممکن ہے بہت برا کہ کوئی سہارا نہیں۔ کیا کوئی امید بھی نہیں۔"

"نہیں۔" میں نے سر جھکا کر آنسو چھپانے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں کیا اچھا ہے اور کیا برا لیکن نہ جانے کیوں میری خواہش ہے کہ اللہ تمہیں ایک پیارا سا بیٹا دے۔ تمہارا اور تیمور کا بیٹا۔"

اس کی بات نے کتنے زخم ادھیڑ ڈالے۔ ایک لمحے میں آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔ وہ سب جو میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ اپنے بچپن کی اس دوست سے تو کہہ سکتی تھی جس سے میں نے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔

"فرو کاش ایسا ہو سکتا۔ میں یوں خالی ہاتھ' خالی دامن تو نہ رہتی۔ میں نے تیمور پر کوئی احسان نہیں کیا تھا لیکن ایک بیوی ہونے کے ناتے یہ میرا حق تو تھا ناں کتنی شدید خواہش تھی میری کہ میں ماں بنوں۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ اگر تیمور کو یہ خوشخبری ملتی تو شاید اس کی زندگی کے چند دن اور بڑھ جاتے۔" نیلوفر نے افسردگی سے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا' میں بھی یہی چاہتی تھی کہ اپنی زندگی میں وہ یہ خوشی دیکھ لے مگر وہ کسی بھی صورت راضی نہیں تھا۔ میں اس بارے میں جتنی غیر محتاط تھی' وہ اسی قدر محتاط تھا' پھر بھی میرا خیال تھا کہ میں اسے قائل کر لوں گی لیکن....." آنسوؤں کا گولا سا میرے حلق میں پھنس گیا۔

"لیکن کیا؟"

"شادی کے شروع کے دنوں میں ہم دونوں خوش تھے اور جنیوا میں گزارے وہ بارہ دن میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی بلکہ مجھے یوں لگتا ہے کہ میری شادی شدہ زندگی صرف بارہ دنوں کی تھی اور بس۔ پھر اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔

ہماری زندگی میں وہ کچھ نہیں تھا جو ایک عام سے شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں ہوتا ہے۔ ہم مستقبل کی کوئی پلاننگ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مستقبل کوئی تھا ہی نہیں۔ زندگی کی امید ہو تو انسان حوصلے کے ساتھ تو آگے بڑھنے کی جدوجہد کرتا ہے خود کو عضوِ معطل نہ سمجھے مگر میں کامیاب نہیں ہوئی۔

میں نے کتنی ذہنی اذیت اٹھائی ہے فرو میں بتا نہیں سکتی۔ اگر اس کی ممی درمیان میں نہ ہوتیں تو شاید میں کسی مقام پر اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتی اور اس کی زندگی کی آخری سانس تک اس کے ساتھ رہتی۔

یاد ہے تمہاری شادی کے بعد بھی تیمور کو اٹیک ہوا تھا۔ وہ جس روز کلینک سے واپس آیا' وہ مجھ سے دور ہونے لگا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا' خود کو قدم قدم موت کی طرف بڑھتے دیکھنا آسان نہیں ہے۔ ایک انسان میں بہت حوصلہ ہو تب بھی آخر کتنا ہوتا ہے۔ کہیں تو حد آ ہی جاتی ہے۔ اس نے حوصلہ ہارا تو ہمارے رشتے کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اس روز کے بعد ہم میاں بیوی کے بجائے صرف دوست رہ گئے۔ تکلیف تو مجھے بھی ہوئی' ظاہر ہے میں بھی انسان ہوں اور میرے بھی جذبات ہیں مگر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ تیمور البتہ اس بات کو نہیں سہار پایا۔ میں اس اذیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی جس سے وہ گزرا۔

اس نے زندگی میں جو چاہا اسے مل گیا۔ ایک بھرپور زندگی گزاری اس نے۔ دولت کی کبھی کمی نہیں ہوئی۔ آسائشیں ایسی کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جہاں قدم رکھا وہاں نمایاں رہا۔ ایک ایسے شخص کے لیے زندگی کے سب سے اہم اور بھرپور رشتے کو ہی نہیں اپنی حیثیت کو بھی کھو دینا کتنا اذیت ناک اور کربناک ہو سکتا ہے۔ وہ ختم ہو رہا تھا۔ اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔

مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ میں اسے سمجھاتی تھی' حوصلہ دیتی تھی۔ اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتی تھی۔

اور میں نے اس کا دھیان بٹا بھی دیا۔ اسے اخباروں میں آرٹیکل لکھنے پر راضی کیا۔ اسے بھی اپنے زندگی کا کوئی مصرف نظر آیا تو اس کا حوصلہ لوٹنے لگا۔ دن یوں لکھنے پڑھنے' ہنسی مذاق میں گزر جاتا تھا لیکن راتیں بہت تکلیف دہ تھیں۔ ایک ہی خواب گاہ میں ہم دونوں خاموشی سے ساری رات بسر کر دیتے۔ ایک دوسرے کے محبوب' ایک دوسرے سے اجنبی' اس کا ڈپریشن بڑھتا جاتا تھا۔

پھر یوں ہونے لگا کہ بڑھتے اندھیرے سے وہ خوفزدہ ہو جاتا اور میرے قرب سے خائف۔ وہ خود پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا اور جب میں اسے اس حد تک لے آئی کہ وہ اپنی ٹینشن اور ڈپریشن سے نکل کر بہتر زندگی کی طرف بڑھنے لگا تو ایک اور اٹیک ہو گیا۔

اس دوسرے اٹیک نے اسے ختم کر کے' توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ میرے لاکھوں جتن بھی کچھ نہیں کر سکے۔ اس کی قوت گویائی بری طرح سے متاثر ہوئی تھی۔ ٹیومر نے دماغ کے پچھلے حصے کو جکڑ لیا تھا۔ اس کے لیے اس کی اپنی آواز اجنبی ہو گئی تو اس نے بولنا تک چھوڑ دیا۔ میرے قرب سے وہ ہر وقت خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ میں اس سے جتنا قریب ہونے کی کوشش کرتی' وہ اسی قدر بدمزاج اور چڑچڑا ہو جاتا۔

مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میرا اور اس کا رشتہ زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی میں اسے زیادہ سے زیادہ دن طول دینا چاہتی تھی۔ پر میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ میاں بیوی کا رشتہ تو ختم ہی تھا۔ ہمارے درمیان سے دوستی کا رشتہ بھی ختم ہو گیا۔'' میں کہتے کہتے بری طرح سے رو پڑی۔

نیلوفر نے مجھے خود سے قریب کر لیا۔ میں اس سے لپٹ کر روتی رہی۔ اس وقت میں

اپنے آپ میں نہیں تھی۔ دکھوں نے مجھے پوری طرح سے گھیر رکھا تھا۔ کتنے زخم لگے تھے دل میں اور میں مصلحتوں کے غلاف میں انہیں لپیٹے کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ پتا نہیں اب اچانک کیوں یہ چند زخم عیاں کر دیے تھے۔ اندر گھٹن بہت بڑھ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب بھی اس گھٹن کو باہر نہ نکالا تو میں ختم ہو جاؤں گی۔ پاپا سے تو یہ سب کہہ نہیں سکتی تھی۔ نبیلہ میری بات سمجھ نہیں سکتی تھی۔ ان دو کے علاوہ نیلوفر ہی تھی جس سے میں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

نبیلہ چائے کی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوئی تو اس بری طرح سے مجھے روتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

''کیا ہوا سجو کو؟ تم نے پھر کوئی ذکر چھیڑ دیا ہو گا جبکہ میں منع کر کے گئی تھی۔'' اسے نیلوفر پر بری طرح سے غصہ آ گیا تھا۔

''اچھا ہوا اس کے اندر کا غبار نکل رہا ہے۔ یہ اب بھی کچھ نہ کہتی تو گھٹ کر ختم ہو جاتی۔ پتا ہے بیلا' ایک تکلیف دہ' صبر آزما اور اذیت ناک سفر جب طے کرنے کا ارادہ باندھا جائے تو راہیں مشکل لگتی ہیں' ناممکن نہیں۔ جب چلنا شروع کریں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ راستہ طے کرنا ناممکن تھا۔ ایسے میں کوئی ایسا ہمدرد اور محبت کرنے والا تو ہونا ہی چاہیے جس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا جا سکے۔'' نیلوفر نے کہا۔

''یہ بوجھ اس کے دل پر رکھنے والی بھی تم ہی تھیں۔'' نبیلہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے ہی اسے تیمور کے لیے سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ تم ہی اسے اس حد تک آگے لے کر گئی تھیں کہ یہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔''

''نبیلہ تم پہلے بھی اس بارے میں مجھے برا بھلا کہہ چکی ہو۔ میں خاموش ہو جاتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے پاس تمہاری باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے سجو اور تیمور کا ہاتھ پکڑ کر ان کا نکاح نہیں پڑھوایا تھا' نہ ہی یہ ٹین ایجر بچے ہیں جنہیں جہاں ہانک دیا جائے وہیں ہو لیں۔ ان کا فیصلہ ان کا اپنا تھا۔'' نیلوفر کے لہجے میں بھی تیزی آ گئی۔

''بکواس مت کرو تم۔ تمہاری وجہ سے سب ہوا ہے جب تمہیں معلوم ہوا تھا کہ اسے کینسر ہے تب بھی اس کی وکالت کرنے آ گئی تھیں۔ سجو کی زندگی برباد کرنے میں اس کی ماں اور تمہارا' تم تینوں کا ہاتھ ہے تم نے ہی اسے اس راہ پر لگایا تھا۔''

''بہت ہو گئی بیلا۔ تیمور' سجو کی طرف بڑھنے والا پہلا لڑکا نہیں تھا۔ یہ باقی لڑکوں کی

طرح تیمور کو بھی نو لفٹ کروا سکتی تھی اور اگر اس نے نہیں کروائی تو اس کی وجہ میں نہیں تھی۔''

''سٹاپ اٹ' سٹاپ اٹ۔'' میں دونوں کے بیچ آ گئی۔ ''یہ کیا تماشا بنا دیا ہے تم لوگوں نے۔ لگتا نہیں ہے کہ تم دونوں نے کبھی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔'' میں نبیلہ کی طرف مڑی۔

''اور فری ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ فیصلہ میرا اپنا تھا۔ تمام تر میرا۔ میں اس کی پوری ذمے داری قبول کرتی ہوں۔ تم بھی ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ میں جذبات میں اندھی ہو گئی تھی۔ اپنا اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت کھو دی تھی میں نے۔ میں سب کچھ مانتی ہوں۔ اس کے باوجود اگر دوسری زندگی ملے تو میں اسے اسی طرح گزارنا پسند کروں گی کیونکہ میں آج بھی تیمور سے اسی طرح محبت کرتی ہوں۔ جیسے شروع دنوں میں کیا کرتی تھی۔''

بے دم ہو کر میں اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔

''سجو! میں اپنے اوپر سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن تم اور پاپا میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہو' تم دونوں کو کانٹا بھی چبھے تو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس روز سے آج دن تک سکون کی نیند نہیں سو پائی جس دن تم نے اپنی شادی نہیں اپنی بیوگی کا فیصلہ کیا تھا۔ جانتی ہو' یہ دن میں نے اور پاپا نے کیسے گزارے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ صرف ایک دوسرے کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اوپر خوشی کا نقاب چڑھائے ہوئے تھے۔ ہنستے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ گھر کا سارا انتظام معمول کے مطابق چل رہا تھا لیکن ہمارے اندر کس دکھ نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کوئی جان سکتا بھی نہیں۔'' نبیلہ رو پڑی۔

میں ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ نیلوفر نے آگے بڑھ کر اسے تھاما اور صوفے پر بٹھا دیا۔

''جب یہ سب ہو رہا تھا اور ہم اسے روک نہیں سکے تھے تو اب اسے واپس پلٹا کیسے سکتے ہیں بیلا۔ یہ سفر تو آگے کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ پیچھے تو کوئی پلٹ ہی نہیں سکتا۔'' نیلوفر کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''کاش سجو نے میری بات مانی ہوتی۔ شادی کرنے کے بجائے یہ محض دوست رہ کر بھی تیمور کا خیال رکھ سکتی تھی۔'' نبیلہ نے کہا۔

''تم نے میرے لیے یہ ممکن نہیں چھوڑا تھا۔ نہ تم نے اور نہ اس کی ممی نے۔'' میرے لہجے میں تلخی اتر آئی۔ ''پھر بھی میں اسے تمہارا قصور نہیں سمجھتی۔ یہ فیصلہ میرا تھا اور میں آج بھی پچھتا نہیں رہی اور نہ ہی میں کبھی یہ مان سکتی ہوں کہ میرا غلط فیصلہ تھا۔ بس اتنا ہوا کہ میں تقدیر

سے ہار گئی۔ اب بھی میرا یقین ہے کہ محبت جہاں سے ملے اپنا دامن بھر لینا چاہیے کہ یہ نایاب جنس ہے۔ ہر کسی کو نہیں ملتی۔ جسے مل جائے وہ خوش نصیب ہوتا ہے۔''

''کیا پاپا ہم بہنوں کے حوالے سے کبھی کوئی خوشی نہیں دیکھ پائیں گے؟ پہلے انہوں نے میرا غم دیکھا۔ اب سجو ہے۔ کتنے دکھ اٹھا کر پالا ہے انہوں نے ہمیں۔ جو ہم نے چاہا انہوں نے ہمیں دیا۔ جتنا چاہا اتنا پڑھایا۔ ہمارے کہے بغیر ہماری ضرورتوں کا خیال رکھا۔ مرد تو بیوی کا کفن میلا ہونے سے پہلے دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ پاپا بھی ہمیں کسی سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ہمارے لیے اتنی قربانیاں دیں جواب میں ہم نے کیا دیا انہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک خوشی بھی نہیں ملی انہیں ہماری ذات سے۔'' نبیلہ پھر رونے لگی۔

میں نے ہونٹ کاٹ کر آنسو پینے کی کوشش کی۔ ''یہ معاشرہ بہت دکھ دیتا ہے سجو۔ لوگوں کی زبانیں نہیں تلواریں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مجھ پر جو بیتی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی تمام تر الزام میرے سر ہی ہے۔ تم یوں آ گئیں۔ میں اس وقت سے خوفزدہ ہوں جب تمہاری سماعت میں کوئی تلخ بات اترے گی۔ شادی وغیرہ میرا شوق نہیں ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ پاپا کو چھوڑ کر کہیں جا سکتی ہوں لیکن جب پاپا کی جانب دیکھتی ہوں' وہ دکھ دیکھتی ہوں جنہوں نے انہیں ریزہ ریزہ کر دیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ضرور کرتی ہوں۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں اب کوئی مجھے بہو بنانے نہیں آئے گی اور پاپا سے میرا وعدہ تھا کہ میں خود کسی کی جانب نہیں بڑھوں گی۔ میرے متعلق پاپا ہی فیصلہ کریں گے۔

اب مجھے لگتا ہے سجو کہ ہم دونوں بہنوں کا مستقبل ایک سا ہے اور پاپا کو ہم کوئی خوشی نہیں دے سکتیں۔ کاش اللہ تعالیٰ نے تمہاری گود میں ایک ننھا سا فرشتہ بھیج دیا ہوتا۔ تمہارے ساتھ مجھے بھی سہارا مل جاتا۔'' دکھ سے نبیلہ کا لہجہ چیخ رہا تھا۔

بظاہر وہ کتنی مطمئن نظر آتی تھی لیکن اس کے اندر کتنا لاوا پک رہا تھا۔ اپنے متعلق کہی جانے والی تکلیف دہ باتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ جیسے اس نے سنی ہی نہ ہوں اور میں کبھی کبھی یہی سوچتی تھی کہ شکر ہے بیلا نے یہ سب نہیں سنا۔ آج اندازہ ہوا کہ وہ سب کچھ سنتی ہی نہیں تھی بلکہ ہر بات' ہر لفظ اس کے دل پر لگے زخموں میں اضافہ کر دیتا تھا۔ وہ سب اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔ یوں رہتی تھی جیسے کوئی غم اسے چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔

اس کے الفاظ ''کاش اللہ تعالیٰ نے تمہاری گود میں ایک ننھا سا فرشتہ بھیج دیا ہوتا

تمہارے ساتھ مجھے بھی سہارا مل جاتا۔'' میری سماعت میں یوں اترے کہ ان سے ٹپکتا دکھ میرے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔

یہ دکھ سب سے بڑھ کر تو میرا ہی تھا۔ ازدواجی زندگی گزارنے کے باوجود میری گود خالی تھی اور یہ دکھ کسی بھی عورت کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ کتنی شدید آرزو تھی میری کہ میں ماں بنوں۔ اتنی شدید شاید کوئی بھی اور خواہش نہیں تھی۔

نبیلہ کے الفاظ پر میں نے تڑپ کر نیلوفر کی جانب دیکھا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ نبیلہ دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے اور نیلوفر کے بیچ خاموشی چھائی رہی پھر وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چلتی ہوں اب پھر آؤں گی۔''

''ہوں۔'' میں بھی اٹھی۔ ''تیمور کی طرف تو جاؤ گی ناں؟''

''ہاں۔''

''دیکھنا کہ وہ کیسا ہے۔ اسے کہنا کہ اپنا خیال رکھے۔ اپنی ڈائیٹ کا اور......'' میں کہتے کہتے رک گئی۔ میرے اندر خلا سا اُترنے لگا۔

''ہاں' تم بالکل فکر مت کرو' میں اس سے کہہ دوں گی۔'' نیلوفر نے تسلی اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں مجھ سے بہتر لوگ ہیں اس کا خیال رکھنے والے۔'' میری آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔

میں کھڑکی میں بیٹھ کر آسمان کی وسعتوں میں پھیلے ستاروں کی طرف دیکھنے لگی۔

''کتنے خوش نما ہیں یہ ستارے لیکن ایک دوسرے سے کتنی دور' کس قدر تنہا۔ اپنے آپ میں گم صم۔ یوں دور سے تکتے ہیں۔ جیسے زمین پر اپنے پیاروں کو کھوج رہے ہوں۔ کیا خبر یہ مرنے والوں کی روحیں ہوں جو دور جا کر چمکنے لگتی ہوں۔ شاید انہی میں کہیں میری ممی ہوں اور شاید تیمور بھی انہی میں شامل ہو جائے۔ آہ تیمور۔'' آنسو میرے گالوں پر لڑھکنے لگے۔

اسی لمحے مجھے خواب گاہ میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پاپا میری جانب ہی دیکھ رہے تھے۔ میں آنسو پونچھ کر ان کی طرف چلی آئی۔

''آئیں پاپا بیٹھیں۔''

''نہیں' میں یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ میں تو اس لیے آیا تھا کہ نبیلہ چائے کی ٹرالی میرے سامنے رکھ کر خود نہانے چلی گئی ہے۔ اگر آپ آ جائیں اور چائے بنا دیں تو میں ابھی چائے پی سکوں گا ورنہ نبیلہ کا انتظار کرنا پڑے گا۔'' وہ بولے۔

''ارے پاپا! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آئیں میں چائے بنا دوں۔'' میں نے کہا۔

انہیں چائے پیالی میں ڈال کر پکڑائی تو انہوں نے مجھے ادھر اُدھر کی باتوں میں الجھا لیا۔ میرا دل ان باتوں میں نہیں لگ رہا تھا۔ میرا دل تو کسی بھی بات میں نہیں لگتا تھا۔ اب پھر بھی میں ان کے پاس بیٹھی رہی۔ نبیلہ کی باتوں نے میرے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ وہ اپنے دکھ چھپا کر ہنس سکتی تھی تو مجھے بھی یہ کرنا چاہیے تھا۔ اپنے لیے نہیں اپنے پاپا کے لیے' جو دنیا میں میرے اور نبیلہ کے سبھی کچھ تھے۔

لیکن والدین سے اولاد کے غم کب چھپتے ہیں اور یہ دکھ ہی انہیں دیمک کی طرح چاٹنے لگے تھے۔ رات کو انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ نبیلہ تو چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''اللہ میاں میرے پاپا کو کچھ نہ ہو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے بس میرے پاپا ٹھیک ہو جائیں۔''

وہ اپنے آپ میں ہی نہیں تھی۔ جو حال میرے دل کا تھا' وہ میں ہی جانتی تھی لیکن اس لمحے میں بھی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتی تو اس کا مطلب پاپا کو خود موت کے منہ میں دھکیلنا ہوتا۔ ڈرائیور رکھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں ہی انہیں لے کر پنجاب کارڈیک سینٹر پہنچی۔ ڈاکٹر انہیں ٹریٹمنٹ دے رہے تھے اور میں باہر کھڑی ہر وہ سورۃ پڑھ رہی تھی جو مجھے حفظ تھی۔ پاپا کو اس حالت میں دیکھ کر پچھلے زخموں کے ٹانکے بھی اُدھڑ گئے۔ تیمور کی بیماری نے ہی مجھے اسپتالوں سے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اسے تو میں اس کی زندگی میں ہی کھو چکی تھی۔ اب مجھ میں اپنے پاپا کو کھونے کی ہمت نہیں تھی۔

پاپا ٹھیک تو ہو گئے لیکن بیماری ان پر اپنے نقش چھوڑ گئی۔ ان کے اعصاب پر ایک ہی فکر سوار تھی۔

''مجھے کچھ ہو گیا تو میری بچیوں کا کیا ہو گا۔''

میں ڈاکٹروں سے مشورہ لے رہی تھی کہ ان کا علاج ممکن ہو گا یا نہیں۔

''بالکل ممکن ہے۔ دل کی بیماریاں تو اب بہت عام ہیں۔ بس یہ ضروری ہے کہ وقت پر

پتا چل جائے۔"

میں اور نبیلہ نے یہ فیصلہ کیا کہ پاپا کو برطانیہ لے جائیں گے اور وہیں ان کا علاج ہوگا۔ یوں تو ان کا علاج اپنے ملک میں بھی باآسانی ہوسکتا تھا لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی یہ رسک لینے پر تیار نہیں تھا۔

"زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جہاں جو لکھا ہے' وہ ہو کر رہے گا پھر بھی کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔" نبیلہ کہتی۔

"ہاں۔ میں یہاں Post operative care سے مطمئن نہیں ہوں اور یہ مرحلہ آپریشن کی طرح ہی نازک اور احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔" میں بھی اس سے اتفاق کرتی۔

انہی باتوں کے دوران ہم پاپا کے بیرونِ ملک علاج کی تیاری بھی کرتے رہے۔

لندن میں نیلوفر کے ساس سسر کا اپارٹمنٹ تھا۔ وہ زیادہ تر پاکستان میں ہی رہتے تھے۔ ان دنوں بھی پاکستان میں ہی تھے۔ اس نے اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی۔

"میرا یہاں سے جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا فرو! اور یہاں رکنے کو بھی نہیں۔ تیمور کے لیے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے بھی نہیں رکھ سکتی۔ پھر بھی ایک احساس ہے کہ ہم زیادہ دور نہیں ہیں۔ شاید وہ دوست کی حیثیت سے ہی کبھی مجھے بلا لے۔ دوسری جانب پاپا ہیں۔ اتنے بڑے صدموں کے بعد اب میری ہمت نہیں ہے کہ انہیں کھو دوں۔ ہم بہنوں کا ایک ہی خون کا رشتہ ہے۔ پاپا کو کچھ ہوگیا تو ہماری زندگی میں کیا باقی بچے گا۔ میرا دل نہیں مانتا کہ انہیں بیلا کے ساتھ بھیج دوں اور خود یہاں رہ جاؤں۔ پھر بیلا کا بھی اب وہ پہلے والا عالم نہیں ہے۔ وہ بھی جیسے اندر سے کھوکھلی ہوگئی ہے۔ اس کے بس میں نہیں ہے کہ پاپا کو تنہا سنبھال سکے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" وہ بولی۔

"یہاں تھی تو ہر روز صبح اور رات کے وقت تیمور کے پاپا سے اس کی خیریت دریافت کر لیتی تھی۔ اب وہاں سے کیسے پتا کروں گی۔" میں آزردہ ہوگئی۔

"میں تمہیں مسلسل فون کرتی رہوں گی۔ صبح اور شام کو بھی۔ تم نہیں ہوگی تو میسج چھوڑ دوں گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔"

"تھینک یو فرو۔ میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پاگل ہوئی ہو؟ اس میں شکریے کی کیا بات؟ اور ہاں تم نے تیمور کے پاپا کو انکل کے متعلق نہیں بتایا۔ میں کل وہاں گئی تھی تو ان کی باتوں سے مجھے احساس ہوا تھا۔"

"کیا فائدہ تھا بتانے کا۔ وہ پریشان ہی ہوتے۔ یوں بھی وہ تیمور کی وجہ سے ہی اس قدر اَپ سیٹ ہیں کہ میں انہیں مزید فکروں میں گرفتار نہیں کرنا چاہتی۔ تم بھی ان سے کچھ نہیں کہنا۔ میرا فون نہ آنے کا شکوہ کریں تو کوئی بہانا بنا دینا۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ میں انہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔"

لندن میں پاپا کا علاج بہترین پیمانے پر ہو رہا تھا۔ یہاں آ کر تبدیلی کا احساس ہوا تو ہم تینوں پر ہی اس کا اچھا اثر پڑا۔ ایک تو جگہ تبدیل ہوئی تھی ماحول تبدیل ہوا' چہرے دوسرے نظر آئے' موسم بھی بہت اچھا تھا۔ پھر پاپا بھی صحت یاب ہو رہے تھے اور خوش رہنے لگے تھے۔ ان سب باتوں نے مل کر نبیلہ اور مجھ پر بہت مثبت اثر ڈالا۔

لیکن اس کے باوجود بھی میرا دل جو تیمور میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کی جانب سے فکر مند ہی رہا۔ بس یہ تھا کہ میں نے غم اپنے اندر جذب کر کے زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ یہ جان لیا تھا کہ میرے چہرے پر پھیلے دکھ کو دیکھ کر پاپا بھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔ شاید ہمیشہ کے لیے ہی ہم سے روٹھ جائیں اور میں نے اس بات کو بھی قبول کر لیا تھا کہ ماں بننا میری شدید ترین خواہش سہی لیکن میں تیمور کی اولاد کی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

جب انسان دکھوں کو قبول کر لیتا ہے تو ان سے سمجھوتا کر کے ان کے ساتھ جینا بھی سیکھ لیتا ہے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں نے قنوطیت کا چولا اُتار پھینکا تھا۔ وہ جو ہر وقت غموں کی دھند مجھے اپنے اندر لپیٹے رکھتی تھی اس سے اپنی شعوری کوشش کے ساتھ پیچھا چھڑا لیا تھا۔

ہاں اب بھی مجھے نیلوفر کا انتظار رہتا تھا۔ بہت شدت کے ساتھ۔ اس کا فون آنے سے کتنی دیر پہلے ہی میں ٹیلی فون سیٹ کے قریب بیٹھ جاتی تھی۔ جب پاپا اسپتال سے واپس آ گئے تو روزمرہ کے معمولات میں بھی کافی تبدیلی آئی۔ نبیلہ کا اصرار ہوتا تھا کہ ہم باہر گھومنے پھرنے چلیں۔ شاپنگ وغیرہ کریں۔ پاپا بھی اس کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ دونوں مجھے مثبت سوچ اور مثبت زندگی کی راہ پر ڈالنا چاہتے تھے۔ میرا انکار صاف اس وقت ہوتا تھا جب نیلوفر کا فون آنے والا ہوتا تھا۔

"ابھی پورے دو گھنٹے پڑے ہیں' اس کا فون آنے میں۔ تب تک تو ہم آ بھی جائیں

گے۔" نبیلہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتی۔

"کیا پتا آج وہ جلدی فون کر لے پھر؟ بس اس کا فون آ جائے۔ اس کے بعد میں مکمل طور پر تمہارے ڈسپوزل پر ہوں گی۔ جہاں لے جاؤ گی لے جانا۔" میں کہتی۔

وہ کچھ دیر بور ہوتی رہتی پھر پاپا کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اُٹھاتی۔ "آپ اُٹھیں پاپا ہم بیوقوفوں کی طرح یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چلیں ساتھ والے پارک میں اتنی دیر تک واک کریں۔"

وہ دونوں باہر نکل جاتے اور میں فون کے سیٹ کو تکتے ہوئے تیمور کے بارے میں سوچنے لگتی۔

ہم وہاں قریباً چار مہینے رہے۔ اس دوران نیلوفر کی جانب سے مسلسل ایک جیسے پیغامات ملتے رہے۔ "تیمور بالکل ٹھیک ہے۔ اسے کوئی اٹیک نہیں ہوا۔ دوائیں وقت پر لے رہا ہے نیند اچھی آتی ہے۔ ٹی۔ وی دیکھنے لگا ہے۔ وغیرہ۔"

اور میں بھی مطمئن رہی۔

واپس آتے ساتھ میں نے اس کے پاپا کو فون کیا۔

"چار دن ہوئے ہیں وہ کلینک میں ایڈمٹ ہے۔"

"کیا؟" میں چلائی۔ "لیکن فرو نے تو مجھے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے۔"

"وہ تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یوں بھی بیٹا اسے کون ٹھیک کر سکتا ہے اب۔" وہ آزردہ ہو گئے۔

"پھر بھی اسے بتانا تو چاہیے تھا مجھے۔"

"جیسے آپ نے اسے منع کیا تھا کہ آپ کے پاپا کے بارے میں وہ مجھے کچھ نہ بتائے۔ ویسے ہی اس بات کے لیے میں نے اسے منع کیا تھا۔ بیٹا آپ کے لیے آپ کے پاپا کی چھاؤں بہت ضروری ہے۔ آپ پریشان ہوتیں تو وہ پریشان ہوتے اور وہ پریشان ہوتے تو انہیں دوبارہ تکلیف شروع ہو سکتی تھی۔"

"پاپا میں اسے دیکھنے کلینک آ جاؤں؟"

"آپ کو کون روک سکتا ہے لیکن بیٹا جب میں بتاؤں تب آئیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تیمور کی ممی سے آپ کا سامنا ہو۔"

"میں اس کے جاگتے ہوئے نہیں جانا چاہتی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ "اچھا۔"

اس کے بعد میں انتظار کرنے لگی کہ کب ان کی جانب سے کوئی اطلاع آتی ہے۔

شام کو پاپا اور نبیلہ اپنے اپنے کمروں میں سفر کی تھکن کے بعد سو رہے تھے جب تیمور کے پاپا کا فون آیا۔ میں تو کب سے تیار بیٹھی تھی۔ فوراً کار کی چابی اُٹھا کر باہر چل دی۔ پہلے راحت ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے پھول اور کارڈ لیے پھر کلینک کی طرف چل دی۔

تیمور کے پاپا مجھے اس کے کمرے کے باہر ہی مل گئے۔

"پاپا کیسا ہے وہ اب؟"

"آرام ہے اب تو سو رہا ہے۔"

"ہوا کیا تھا؟"

"وہی جو ہوا کرتا ہے۔ سر میں شدید درد سر کے پچھلے حصے میں پانی جمع ہو گیا تھا جو ڈاکٹروں نے نکال دیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی وقتی طور پر آرام آ گیا ہے۔ آپ کے لندن جانے کے بعد یہ دوسرا شدید اٹیک ہے وہ بھی اپنی بیماری سے تنگ آ گیا ہے۔ مزید زندگی بے معنی ہو گئی ہے اس کے لیے۔ خود اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگا ہے۔" پاپا کہہ رہے تھے۔

میرے دل میں جیسے کسی نے خنجر پیوست کر دیا۔

"میں دیکھ لوں؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دروازہ کھول کر میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی سفید چادر سینے تک لیے وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ مجھے چادر کی بے داغ سفیدی اور اس کی گہری نیند سے خوف آنے لگا۔ تیزی سے میں اس کی جانب بڑھی۔ بالکل۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"تیمور!"

لیکن وہ گہری نیند میں تھا۔ گہرا سانس لے کر میں وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور اسے دیکھنے لگی۔

وہ کہیں سے بھی پہلے والا تیمور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جو زندگی کی حرارت سے بھرپور تھا۔ جس کی ہنسی اور جس کے سراپے نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ وقت کی دھول

کچھ اس طرح اُڑی تھی کہ غبار اس کے وجود پر ٹھہر گیا تھا۔ ہم دونوں کتنے قریب آ کر کتنے دور چلے گئے تھے۔

''تم سب کچھ کہہ دو۔'' اس نے کہا تھا۔ ''جو تمہارے دل میں ہے۔ میں اپنے اور تمہارے تعلق کو کسی کمیونی کیشن گیپ کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کھل کر اپنی بات ایک دوسرے سے کہہ دیں۔ اگر آج ایسا ممکن نہیں تو کل کسی اور مضبوط بندھن کی بنیاد رکھنا بالکل بیکار ہوگا۔''

اور ہم دونوں اپنے دل کا سب حال ایک دوسرے کو کہہ سناتے تھے۔ ہمارے درمیان کوئی راز نہیں تھا ہم ایک دوسرے کی سانسوں میں رچ بس گئے تھے۔ اب بھی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے لیکن اب ہمارا ساتھ ممکن نہیں رہا تھا۔

میں ایک ٹک اس کے زرد چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر اس لمحے سکون ہی سکون تھا۔ بے اختیار ہی آگے بڑھ کر میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

'' کتنے بدل گئے ہو تم تیمور۔'' میں نے سوچا۔ ''جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ یہ وقت کتنا ظالم ہوتا ہے۔ کتنی بے دردی سے اپنے قدموں تلے پھول سے چہرے روند ڈالتا ہے۔ کبھی میں سوچتی تھی کہ تم میل ماڈلنگ کی طرف آ جاؤ تو تہلکہ مچا سکتے ہو۔ آج جیسے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ کس کس بات کا ماتم کروں کہ میرے لیے تو کچھ باقی نہیں رہا۔''

اس کی بند آنکھیں اندر کی طرف دھنسی محسوس ہو رہی تھی۔ مرجھایا زرد چہرہ' سفید پھیکے سے ہونٹ لاغر ناتواں جسم۔ ڈھونڈ نے سے بھی اس میں ماضی کی کوئی پرچھائیں نہیں ملتی تھی۔

''کتنی تکلیف اور اذیت سے گزر رہا ہے تیمور۔ بالکل تنہا۔ کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ کتنا اکیلا ہو گیا ہے۔ فرو کہتی ہے مجھے یاد کرتا ہے۔ پھر بھی میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔'' میری آنکھوں میں ڈھیروں پانی اُتر آیا۔

اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے خاموشی سے۔ کتنے آنسو بہا دیئے میں نے۔

دروازہ کھول کر اس کے پاپا اندر داخل ہوئے۔ میں آنسو صاف کر کے تیمور سے کچھ دور ہٹ گئی۔

''آئی ایم سوری لیکن آپ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکیں گی۔ اس کی ممی آنے والی ہیں۔''

''پاپا میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔'' بمشکل جو آنسو رو کے تھے وہ پھر رواں ہو گئے۔

وہ خاموش ہو گئے۔ چند لمحے میں تیمور کے چہرے کی طرف تکتی رہی پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں' مجھے زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔'' آہستہ سے کہہ کر میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بھی میرے ساتھ باہر نکل آئے۔

''میں اپنا ڈرائیور آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ ڈرائیو کر سکیں۔'' کوریڈور میں چلتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''ہوں۔'' میری کیفیت واقعی ایسی نہیں تھی کہ میں ڈرائیو کر سکتی۔

کوریڈور کے اختتام پر وہ رک گئے۔ ''جمیلہ بیٹا آپ کل میرے آفس میں آ سکتی ہیں؟ تیمور نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ ''کیا پیغام؟''

''ہم کل اس بارے میں آفس میں بات کریں گے۔''

''پلیز پاپا ابھی بتا دیں۔ ایسی کیا بات ہے جو آج نہیں بتائی جا سکتی۔''

''بات آج یا کل کی نہیں ہے۔ یہ جگہ دراصل مناسب نہیں ہے۔'' پھر وہ کچھ تامل سے بولے۔ ''گھر بھی اس کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔''

''میں کل تک کیسے انتظار کروں گی۔''

وہ خاموش رہے۔

''ٹھیک ہے میں کل آپ کے آفس میں آ جاؤں گی۔'' میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''صبح دس سے ساڑھے دس بجے کے درمیان۔'' انہوں نے کہا۔

گھر پہنچی تو پاپا اور نبیلہ میرے بارے میں پریشان ہو رہے تھے۔

''میں کلینک گئی تھی' تیمور ایڈمٹ ہے۔'' میں نے بتایا۔

''بتا کر تو جاتیں یا پھر پیغام ہی چھوڑ دیتیں۔ تمہیں اندازہ ہے ہم کتنے پریشان تھے؟ فرو سے بھی میرا جھگڑا ہو گیا ہے فون پر۔'' نبیلہ نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ فروہ سے لڑنے جھگڑنے لگتی ہو۔ مت کیا کرو ایسا۔"

"اچھا چھوڑو۔ پاپا جم خانہ جارہے ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔ ہم بھی چلیں گے۔"

میرے ذہن پر تو تیمور کی زردی گھلی صوت نقش ہو چکی تھی اور پھر وہ پیغام ..... کیا تھا وہ پیغام؟ میرا دل و دماغ وہیں اٹکا ہوا تھا۔

"میں نے اب تک آرام نہیں کیا۔ مجھے نیند آرہی ہے میں سوؤں گی تم جاؤ۔"

"اب ہم واپس آگئے ہیں۔ نیند کے اوقات تبدیل کرلو۔ اس وقت سو جاؤ گی تو رات کو نیند نہیں آئے گی۔" چلو اس وقت ہمارے ساتھ چلو۔"

"پلیز بیلا تنگ مت کرو۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" مجھے اس کے اصرار اور اس کی نصیحت دونوں نے اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اپنی خواب گاہ میں چلی آئی۔ بستر پر لیٹی تو کلینک کے کمرے کا منظر ذہن میں پھر روشن ہو گیا۔

"کتنے ریشمی ملائم سے ہوتے تھے اس کے بال۔ اب کتنے کھردرے سے ہو گئے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا تھا تب سرما کی ٹھنڈی دھوپ میں کتنے چمک رہے تھے۔ پہلے ہی اس کے بال ہلکے رنگ کے تھے۔ اس روز تو سونے کی تاروں جیسے ہو رہے تھے اور اس کی ہنسی' اس کا سراپا۔

میرے پاس سوچنے کو بہت کچھ تھا۔ میں خود ہی یادوں کے بھنور میں ڈوبنا چاہتی تھی۔ کتنی کتنی دیر تک ایک ہی بات کو کتنے ہی زاویوں سے سوچا کرتی اور تھکتی نہیں تھی۔

☆======☆======☆

صبح ساڑھے نو بجے ہی میں تیمور کے پاپا کے آفس میں تھی۔ اپنی طرف سے میں بہت دیر سے آئی تھی۔ صبح سات بجے سے ہی تیار ہو بیٹھی تھی اور پھر انتظار' اتنا طویل انتظار جیسے کبھی ختم ہی نہ ہو۔ بالآخر ساڑھے آٹھ بجے کار کی چابی اُٹھا کر میں باہر نکل آئی۔ کچھ دیر یونہی بیکار میں سڑکوں پر گھومتی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نگاہ گھڑی پر اُٹھتی تھی۔ جب مزید انتظار کی تاب نہ رہی تو آفس کی راہ لی۔ وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ کلینک میں ہیں۔ دس سوا دس بجے تک آئیں گے۔ ایک مرتبہ پھر انتظار شروع ہو چکا تھا۔ میرے سامنے اخبار اور میگزین کا ڈھیر

لگا دیا گیا۔ میرا دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ ذہن ایک ہی نکتے پر مرتکز تھا۔

"تیمور نے کیا پیغام دیا ہے؟"

سوا دس بجے تیمور کے پاپا آئے۔ مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔

"آئی ایم سوری میں لیٹ ہو گیا۔ دراصل پہلے میں کلینک چلا گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "تیمور اب کیسا ہے؟ تکلیف بڑھی تو نہیں؟"

"نہیں' ابھی کچھ عرصے کے لیے تو آرام ہی ہے۔ اس وقت وہ ٹھیک ہی تھا۔ بس ذرا ضدی ہو گیا ہے۔ بات بات پر چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اسے ناشتا کروانے میں ہی دیر ہو گئی۔ کچھ کھانا نہیں چاہتا تھا۔"

چند لمحے ہم خاموش رہے پھر میں بولی۔

"وہ پیغام کیا تھا جو اس نے میرے لیے دیا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچ میں گم رہے پھر بولے۔ "وہ آپ کے لیے سخت اَپ سیٹ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آپ کے ساتھ شادی کر کے اس نے خود غرضی کا ثبوت دیا تھا اور اب اسے تلافی کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ آپ کو....." چند لمحے وہ خاموش رہے پھر آہستہ سے بولے۔ "آپ کو طلاق دے دے۔"

میرے لیے یہ گویا بم کا دھماکا تھا۔ "طلاق؟"

وہ چپ رہے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایسا کیسے سوچ سکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" میرے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"وہ آپ کی راہیں بند نہیں کرنا چاہتا۔ اپنی زندگی میں ہی آپ کو نئی اور خوشگوار زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہے' اس کے دل پر بہت بوجھ ہے۔ اپنے بارے میں سوچنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتا ہے آپ کے لیے پریشان رہتا ہے۔ یہ دکھ اس کی بیماری سے بھی بڑھ کر اس کے ساتھ چمٹ گیا ہے کہ اس نے آپ کو کچھ نہیں دیا' کوئی ایک خوشی بھی نہیں۔ کوئی ایک خواہش بھی پوری نہیں کی۔"

''کاش وہ ان سوچوں سے نکل سکتا تو زندگی کے یہ چند دن اس پر بوجھ نہ بن جاتے۔ پاپا میں نے اس کی ہر خواہش پوری کی ہے۔ ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ خوش رہے لیکن میں بھی انسان ہوں اور کسی نہ کسی مقام پر انسان بہت خود غرض ہو جاتا ہے۔ صرف اپنے لیے سوچنے لگتا ہے۔ میں بھی آج صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہوں۔

وہ طلاق دینا چاہے تو میں اسے کہاں روک سکتی ہوں لیکن اگر اسے مجھ سے محبت ہے اور آج بھی وہ مجھے کوئی خوشی دینا چاہتا ہے۔ میری کوئی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے تو صرف اتنا کرے کہ پھر کبھی یہ رشتہ توڑنے کا نہ سوچے۔ ہم الگ تو ہیں ہی لیکن میرے لیے اسی قدر بہت ہے کہ ہمارے درمیان اب بھی بہت مضبوط بندھن قائم ہے۔

پاپا پتا نہیں مستقبل میں کیا لکھا ہے۔ میں بہت عام' بہت کمزور سی لڑکی ہوں۔ تنہا رہ جانے سے مجھے بہت خوف آتا ہے لیکن جب تک تیمور کے جسم میں آخری سانس باقی ہے تب تک میں ہر حال میں اس بندھن کو قائم رکھنا چاہتی ہوں۔

وہ سمجھتا ہے کہ میں نے یہ رشتہ اس لیے جوڑا تھا۔ کیونکہ اسے میری ضرورت تھی۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ میرے نزدیک ایک ہی بات اہم تھی اور ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے اور یہی اس رشتے کی بنیاد تھی اور ہے۔'' میں چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑی۔

میری سسکیوں کی آوازوں کے سوا آفس میں مکمل خاموشی تھی۔ پھر میں آنسو پونچھ کر اور بیگ کندھے پر ڈال کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''پلیز پاپا اس سے کہیں کہ ایسا مت کرے۔ یہ دکھ میرے لیے بہت بڑا ہوگا۔''

گھر آ کر بھی میں گم صم رہی۔ نبیلہ دوپہر کے کھانے کے لیے کہنے آئی تو میں نے انکار کر دیا۔

''رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ صبح صرف چائے پی کر باہر نکل گئیں۔ اب بھی کھانا نہیں کھانا۔ یہ کیا مذاق ہے جو۔'' وہ مجھ سے اُلجھ پڑی۔

''بھوک نہیں ہے۔''

''بھوک نہیں ہے کیا مطلب؟ تم آج پھر کلینک گئی تھیں؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر کیا آفت آ گئی ہے۔ فرو کی طرف گئی ہوگی۔ ہیں ناں؟ اس نے کچھ کہہ دیا ہوگا۔''

اس نے اندازہ لگایا۔

''تم کیوں فرو کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ میں اس کی طرف نہیں گئی تھی۔''

چند لمحے میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر اسے سب کچھ بتا دیا۔

''ہونہہ دل پر بوجھ ہے۔'' نبیلہ کے لہجے میں تلخی اُتر آئی۔ ''اب اسے احساس ہو رہا ہے اپنی خود غرضی کا اس وقت تو بہت خوشی خوشی بارات لے کر چلا آیا تھا۔ تب کہاں سویا ہوا تھا یہ احساس۔ اور اب یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنی زندگی میں تمہیں ایک نئی اور خوشگوار زندگی گزارتے دیکھ لے۔ اس نے تب بھی اپنا ہی سوچا تھا اور آج بھی۔ رشتے کہیں درختوں پر لگتے ہیں کہ آج یہ سہی کل دوسرا دیکھ لیں گے۔ اس معاشرے کے مردوں میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کسی مطلقہ یا بیوہ سے شادی کر لیں۔ نہ ہی کسی عورت کا دل اتنا بڑا ہے کہ ایسی کسی لڑکی کو بہو کی صورت میں قبول کر لے۔''

''اس کا قصور نہیں ہے بیلا اسے کچھ مت کہنا۔ وہ بہت بڑے امتحان سے گزر رہا ہے۔''

''تم اس کی طرف داری کرنا چھوڑ دو۔ تمہارا مستقبل تباہ کر کے اب تاسف سے ہاتھ ملتا رہ جائے تو کیا اس سے تمہیں کچھ مل جائے گا؟ یہ زخم اس نے جانتے بوجھتے تمہیں لگائے ہیں۔ میں اس کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی۔''

میں نبیلہ۔ کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ نہ میری سننے پر تیار ہوتی اور نہ ماننے پر۔

''اُٹھو اب کھانا کھاؤ۔ چاہے دو نوالے ہی سہی۔ پاپا کب سے کھانے کی میز پر انتظار کر رہے ہیں۔ ایسی حرکتوں سے تم خود کو جو تکلیف دے رہی ہو سو دے رہی ہو' جو پاپا کے ساتھ کر رہی ہو' وہ ناقابل معافی ہے۔ تمہاری وجہ سے انہیں کچھ ہو گیا تو اپنے ساتھ میرا رشتہ بھی ختم سمجھنا۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیلا کاش میں تمہاری طرح مضبوط ہوتی۔ اپنے غم بھلا کر دوسروں کو خوشی دینے کے لیے ہر دم کوشاں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ مجھے چوٹ لگتی ہے تو میرا چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہتا ہے۔ میں نے چاہا کہ خود پر قابو پا لوں۔ اپنے اوپر ملمع چڑھا بھی لیا تھا لیکن یہ جھوٹ میں زیادہ دیر چلا ہی نہیں سکتی۔ میں خود کو سمجھاتی ہوں۔ تلقین کرتی ہوں اور پھر ہار جاتی ہوں۔''

''جب تک تم فارغ رہ کر تنہائی میں دیواروں اور ستاروں کو تکتی رہو گی' تب تک ایسا ہی

ہو گا۔ خود کو زندگی کی گہما گہمی میں شامل کرو۔ پھر دیکھو کتنی مثبت تبدیلی آتی ہے تم میں۔'' نبیلہ نے مجھے سمجھایا۔

''یہ سب کچھ میں جانتی ہوں بیلا لیکن یہ سب کرنا نہیں چاہتی۔ میں اپنا غم بھلانا نہیں چاہتی۔ ہر پل ہر لمحے اسے محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنے زخموں سے محبت ہے۔ مجھے تیمور سے وابستہ ہر یاد سے محبت ہے۔'' میں رو پڑی۔

''اوہ گاڈ'' وہ تھک گئی۔

اسی لمحے پاپا اندر داخل ہوئے۔ ''بیٹا کھانا نہیں کھانا کیا؟''

پھر ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ دکھ کا سایہ سا ان کے چہرے پر چھا گیا۔ میں نے جلدی سے آنسو صاف کر ڈالے۔

''پاپا! ہم آ رہے ہیں۔'' میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

مجھے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ جب سے تیمور کو کلینک میں دیکھ کر آئی تھی اور پھر اس کے پاپا کے منہ سے اس کی خواہش سنی تھی تب سے میری عجیب کیفیت تھی۔ چین سکون تو پہلے بھی نہیں تھا اب رہا سہا بھی رخصت ہو گیا تھا۔ بات بات پر رونے کو دل چاہنے لگا تھا۔ اس کی صورت نگاہوں سے ہٹتی ہی نہیں تھی۔ لاشعوری طور پر میں اس کا موازنہ اس کے ماضی کے ساتھ کرتی چلی جاتی تھی۔ اس وقت سے جب وہ تندرست اور صحت مند تھا' جب اس کی آنکھوں میں ذہانت اور امید کی چمک تھی۔ جب وہ آگے بڑھنے کے لیے ہر دم کوشاں رہتا تھا۔ خوش رہتا تھا۔ ہنستا تھا' باتیں کرتا تھا اور مجھ سے شدید محبت کرتا تھا۔

نیلوفر آئی تو مصر ہو گئی۔

''تم پھر سے ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کر لو۔''

نبیلہ اور پاپا نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مقصد واضح تھا۔ میرا دھیان بٹ جائے گا اور تنہائی سے نکل کر زندگی کی گہما گہمی میں شامل ہو کر بیکار کی سوچوں سے میرا پیچھا چھوٹ جائے گا۔ میں انہیں کیا کہتی کہ جو سوچیں ان کے نزدیک بیکار تھیں' وہ میرا سرمایہ حیات تھیں۔

مجھے بحث سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ وہ بھی ایسے کہ میری بات سننے یا سمجھنے پر کوئی تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔

''یوں بیٹھے بیٹھے پاگل ہو جاؤ گی تم۔ میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتی اس بارے میں۔''

نبیلہ نے زور دے کر کہا۔

''بیٹا حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔'' پاپا سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ ''آپ دونوں بہنوں کے لیے میں اتنا ضرور چھوڑ جاؤں گا کہ آپ عزت سے بے محتاجی کی زندگی بسر کر سکیں لیکن اس بات سے تو آپ انکار نہیں کریں گی ناں کہ یوں بیکار بیٹھ کر وقتاً فوقتاً بینک سے پیسے نکال کر اپنے استعمال میں لاتے رہنے سے آپ کے اندر سے جدوجہد کی لگن ختم ہو جائے گی۔ آپ کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا اور یہی نہیں' زندگی کا' زندہ رہنے کا کیا مصرف رہے گا۔

دیواروں کو تکتے ہوئے بیتے کل کو یاد کرنا یا آنے والے وقت سے خوفزدہ رہنا تو زندگی کا مصرف نہیں ہو سکتا' نہ ہی یہ زندگی بسر کرنے کا کوئی ڈھنگ ہے۔ اور پھر کتنے دن اس طرح گزارے جا سکتے ہیں؟ میں مانتا ہوں کہ غم جو دل میں اُتر جاتے ہیں ان کا بسیرا سدا وہیں رہتا ہے لیکن بیٹا غم بھی سلیقے سے منانا چاہیے۔ زندگی دکھوں کی چادر میں لپیٹ کر سسکنے کے لیے نہیں ہوتی ورنہ کون ہے جو دکھی نہیں ہے۔ کس انسان کا سینہ چھلنی نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں اپنا دکھ ہر ایک کے دکھ سے بڑھ کر لگتا ہے اس لیے کہ وہ ہم پر بیتتا ہے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں بولی۔ ''پاپا مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے لیکن میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ میں اپنے دکھوں سے باہر نہیں نکلنا چاہتی۔ پلیز آپ لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

''تاکہ پہلے تم پاگل ہو جاؤ اور پھر خطرناک پاگل۔ تمہارا تو دماغ خراب ہو چکا ہے۔'' نبیلہ کو غصہ آ گیا۔

''میں صرف تجو کی بات نہیں کر رہا۔ بیلا میں آپ کی بات بھی کر رہا ہوں۔'' پاپا نے کہا۔

''میری؟ میں نے کیا کیا ہے پاپا؟'' وہ قدرے حیران ہو کر بولی۔

''میں اپنی زندگی میں آپ دونوں کو سیٹل ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں حکم دینا پسند نہیں کرتا۔ اگرچہ دے سکتا ہوں۔ بہرحال میرا مشورہ ہے کہ آپ سی ایس ایس کی تیاری شروع کریں جو آپ پہلے بھی کئی مرتبہ ادھوری چھوڑ چکی ہیں اور تجو آپ دوبارہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کر لیں۔''

یہ پاپا کا مشورہ نہیں حکم تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ حکم دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ہم دونوں بہنوں کو معلوم تھا کہ ان کی کون سی اور کس لہجے میں کی گئی بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ میرے لیے اسے قبول کرنا بہت مشکل تھا۔

''پاپا! آپ گھر میں اکیلے ہو جائیں گے۔'' میں نے بہانا تراشا۔

''بیلا کو کہاں جانا ہے' زیادہ سے زیادہ لائبریری جائے گی جب وہ لائبریری جائے گی تو میں جم خانہ چلا جایا کروں گا یا پھر کہیں گھومنے پھرنے' کسی دوست کے پاس۔ آپ میری فکر مت کریں۔''

''یہ صرف بہانا بنا رہی ہے۔'' نبیلہ نے مجھے گھورا۔

''پاپا' سارا دن آفس کی خواری میرے بس میں نہیں ہے۔ وہ تخلیقی صلاحیت جو مجھ میں تھی۔ اب نہیں رہی میرا ذہن پہلے کی طرح کام نہیں کرتا۔ یہ ایڈورٹائزنگ وغیرہ میرے بس کا روگ نہیں رہا۔'' میں روہانسی ہو گئی۔

''دیکھا صرف اتنے دن کام سے دور رہی ہو اور نکمی ہو گئی ہو۔'' نیلوفر بولی۔

''یہ صرف آپ کا خیال ہے۔ آپ کام شروع کریں گی تو ایک مرتبہ پھر وہی پہلے والی تخلیقی صلاحیت لوٹ آئے گی۔'' پاپا نے ہمت بندھائی۔

''میں اتنی دیر آفس میں رہی تو آدھے دن کے بعد ہی سب کو کاٹ کھانے کو دوڑنے لگوں گی۔ میرے لیے یہ سب بہت مشکل ہے۔''

نیلوفر نے چٹکی بجائی۔ ''لو اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔''

مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ اس کے پاس ہر بات کا گھڑا گھڑایا حل موجود ہوا کرتا تھا۔

''چونکہ تم بہت نکمی ہو اس لیے پہلے بھی تم نے کمپیوٹر سیکھنے کی ذرا سی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ حالانکہ اب تو سب کام ہو ہی کمپیوٹر سے رہا ہے۔ پہلے کمپیوٹر گرافکس سیکھ لو پھر خود ہی تمہارا دل چاہنے لگے گا کہ فل ٹائم کام کرنے لگو۔ یوں بھی کمپیوٹر اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ بندہ دس کام چھوڑ کر اسی سے لگ کر بیٹھا رہتا ہے۔ بس تم کل صبح سے ہی آ جاؤ۔'' نیلوفر نے کہا۔

''فرو ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' نبیلہ نے بھی تائید کی پھر نیلوفر سے مخاطب ہوئی۔ ''صبح میں خود اسے آفس چھوڑ جاؤں گی۔''

''جب تک تمہارا دل چاہے تم کمپیوٹر سے کھیلتی رہنا۔ آج کل تو فیصل پاکستان میں نہیں

ہے۔ وہ آئے گا تو تمہیں اس کی شاگردی میں دے دوں گی۔ اس سے پہلے میں ہی تم سے سر پھوڑتی رہوں گی کیونکہ تھوڑا بہت کمپیوٹر تو میں بھی سیکھ گئی ہوں۔ تم یوں کرنا کہ صبح دس بجے تک آ جانا۔''

''نہیں کل نہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میری تیمور کے پاپا سے بات ہوئی تھی۔ کل وہ اسے چیک اَپ کے لیے شوکت خانم میموریل کینسر اسپتال میں لے جا رہے ہیں کل مجھے وہاں جانا ہوگا۔''

چند لمحے سب خاموش رہے پھر نیلوفر ہی بولی۔

''سارا دن تو وہاں غرق نہیں کرو گی ناں۔ جیسے ہی فارغ ہو آ جانا۔''

''ہونہہ۔ اس کے بعد یہ دس دن اپنے بل میں گھسی رہیں گی۔'' نبیلہ غصے میں بڑبڑائی۔

''پلیز بیلا مت کیا کرو ایسی باتیں۔'' میرا ضبط جواب دینے لگا۔

''تم کیوں نہیں سمجھتیں کہ میرے لیے تیمور یا دنیا کے کسی بھی فرد سے زیادہ اہم تم اور پاپا ہو۔ جب تم کمرے میں بند ہو کر سارا سارا دن روتی رہتی ہو تو میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں اس حال میں پہنچانے والے ایک ایک فرد کو شوٹ کر دوں۔''

''او ہو انکل! یہاں تو نقصِ امن کا خطرہ ہو گیا ہے۔ آپ ہی جنگ بندی کروائیں۔'' نیلوفر نے مصنوعی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''فرو! یہ کل آفس جائے گی اور ضرور جائے گی۔ میں خود اسے اسپتال لے کر جاؤں گی۔ اور وہاں سے تمہاری طرف بھی چھوڑ دوں گی۔ یوں کل کل کرتے اس نے یہ بات ہی ٹال دینی ہے۔'' نبیلہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

جب میں اور نبیلہ اسپتال پہنچے تو تیمور وغیرہ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس بات کا پتا مجھے اس کے پاپا کی کار دیکھ کر چلا جو کچھ فاصلے پر پارک تھی۔ میں اور نبیلہ سڑک عبور کر کے او پی ڈی میں پہنچے۔ وہیں اسپتال کے آرکیٹیکچر ڈیپارٹمنٹ میں میری کالج فیلو آمنہ بھی جاب کر رہی تھی۔ جسے میں گزشتہ رات کو ہی اپنی آمد کی اطلاع دے چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھی۔

''تمہارے شوہر اپنے والدین کے ساتھ آ چکے ہیں۔ ابھی ویٹنگ ایریا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''میں نے اندر نگاہیں دوڑائیں۔ وہیں ایک صوفے پر تیمور اپنی ممی اور پاپا کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ بیزار اور چڑچڑا سا۔ زرد ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ میرا دل جیسے کسی نے چیر دیا۔ وہ کب ایسا تھا۔ بیماری نے اسے بالکل ختم کر دیا تھا۔

''تم نے ڈاکٹرز سے کہا کہ ذرا دھیان سے چیک اَپ کریں۔ کہیں کوئی ایک فیصد امید ہو تو وہ بھی بتا دیں۔'' میں نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

''میرے کہنے کی ضرورت تو نہیں تھی کیونکہ یہاں سبھی ڈاکٹر بہت اچھے ہیں۔ پھر بھی میں نے کہہ دیا ہے۔'' آمنہ نے تسلی دی۔

نبیلہ اور آمنہ باتیں کرنے لگیں۔ میری نگاہیں تیمور پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے خبر نہیں ہوئی کہ کب میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''ریلیکس سجو۔ آؤ۔ تم ادھر آ کر بیٹھو۔'' آمنہ نے مجھے دیکھا تو گھبرا گئی۔

''نہیں' میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے منہ پھیر کر ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑیں۔

''اچھا آؤ میں تمہیں اسپتال دکھا دوں۔'' اس نے میری توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

''نہیں میں یہیں رہوں گی۔ تم کسی ڈاکٹر سے کہو ناں کہ تیمور کا چیک اَپ جلدی کریں۔ دیکھو وہ کتنی تکلیف میں لگ رہا ہے' پریشان ہے۔ اس سے بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس طرح تو وہ تھک جائے گا۔'' میری نگاہیں وہیں ٹکی ہوئی تھیں۔

''ابھی ڈاکٹر مصروف ہیں۔ بس پانچ منٹ کی بات ہے جو پیشنٹ اندر ہے' اس کے بعد تیمور کی ہی باری ہے۔''

''سجو تم اسی طرح پریشان رہیں تو میں تمہیں واپس لے جاؤں گی۔'' نبیلہ نے دھمکی دی۔

میں اسے کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گئی۔ وہ کب میری دشمنی میں ایسا کہہ رہی تھی اور پھر یہ ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکتا سو میں اس کی بات پی گئی۔

''دیکھو سجو کتنی خوبصورتی سے سورہ یٰسین دیوار پر لکھی ہوئی ہے۔'' نبیلہ نے میری توجہ اس طرف دلائی۔

میں مسحور رہ گئی۔ نہ جانے وہ واقعی خوبصورتی سے تحریر کی گئی تھی یا پھر میرے دلی جذبات

ہی ایسے تھے کہ وہ مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت تحریر محسوس ہوئی۔

''بہت خوبصورت۔'' میں نے ایک سحر کے اثر میں کہا۔

''محنت بھی بہت ہوئی ہے یہاں۔'' آمنہ نے کہنا شروع کیا۔ ''یہاں کی ایک ایک اینٹ میں محبت اور خلوص گندھا ہوا ہے اور پوری قوم کا یہ عزم کہ ہم بھی حوصلہ مند اور محنتی ہیں۔ ہم کشکول توڑنا جانتے ہیں۔ دوسروں کے سامنے جھولی پھیلانے کے بجائے مل جل کر بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہیں۔ تمہیں بتاؤں سجو کہ اسپتال کی کمپین کے دوران ہم نے ایسے ایسے منظر دیکھے ہیں کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تم نے دیکھا ہو گا گلبرگ کی مین مارکیٹ میں ایک معذور سا بابا بالوں کی پنیں اور اسی قسم کا سامان بیچتا ہے۔ ہر کار کی کھڑکی کے قریب جا کر کوئی چیز بیچنے کی کوشش کرتا ہے اور کئی جگہوں سے دھتکارا جاتا ہے۔ وہی بابا ہر مہینے یہاں ٹرسٹ آفس میں اپنی مہینہ بھر کی آمدنی کا چوتھائی حصہ نہ جانے کب سے عطیہ دے رہا ہے۔

اور ہمارے یہاں ایسا بھی نہیں ہے کہ عطیہ دینے والوں کو بھول جائیں۔ تم اسپتال میں چل پھر کر دیکھو ایک ایک ڈونر کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے اور پھر اسپتال کا اسٹینڈرڈ بھی دیکھو۔ ابھی ویسے تو زیر تعمیر ہے لیکن جو لوگ آتے ہیں' ملکی اسپتالوں میں اس کا موازنہ آغا خان اسپتال سے کرتے ہیں اور جو غیر ممالک سے ہو کر آئے ہیں وہ اس کا موازنہ لندن اور امریکہ کے اسپتالوں سے کرتے ہیں۔''

''اس میں شک بھی نہیں ہے کہ دیکھنے میں یہ غیر ملکی اسپتالوں کا مقابلہ کرتا ہے لیکن تم نے یہاں کیا کیا ہے؟'' نبیلہ مسلسل میری توجہ ہٹانا چاہ رہی تھی اس لیے اس نے موضوع کو ختم نہیں ہونے دیا۔

''یہ سارا Interior ہماری ٹیم نے ہی کیا ہے جو لابی تمہیں نظر آ رہی ہے اور کہنے والوں کے مطابق کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی سے بڑھ کر ہے یہ سب ہم نے سجائی ہے۔ ہر کمرے کی تمام تر ضروریات مثلاً فرنیچر کیسا ہونا چاہیے۔ کتنا ہونا چاہیے۔ پردے' صوفے' بستر' دیواری گھڑیاں وغیرہ' یہ سب ہماری ذمے داری ہے۔ بہت لمبا کام ہے پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گی۔ ابھی تو اتنا ہی سمجھو کہ خوبصورت لوگوں کے علاوہ اس اسپتال کی ہر خوبصورتی ہماری مرہونِ منت ہے۔ انسانوں کے علاوہ جس چیز کی خوبصورتی تمہارا دامن تھام لے' وہ

ہماری ہی کاوش ہے۔'' آمنہ مسکرائی۔

میری نگاہیں پھر تیمور پر ٹک گئی تھیں۔ وہ بے چین سا بیٹھا ہوا تھا لیکن خاموش تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی چیک اَپ کی اس کی باری آ گئی۔

''وہ چیک اَپ کے لیے جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

نبیلہ اور آمنہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''ایک منٹ۔'' کہہ کر آمنہ تیزی سے چلتی ہوئی اسی سمت میں چلی گئی۔ کسی ڈاکٹر سے کچھ بات کی پھر پلٹ آئی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ابھی تو چیک اَپ کے لیے جا رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو بتا آئی ہوں' یہ بھی کہہ آئی ہوں کہ وہ تفصیل سے تمہیں تیمور کی کنڈیشن بتا دیں۔ ابھی کچھ دیر لگے گی۔'' وہ بولی۔

میں انہیں وہیں چھوڑ کر ممی اور پاپا کی طرف بڑھی۔ اس کی ممی چونکی بھی تھیں اور انہیں میرا وہاں آنا اچھا بھی نہیں لگا تھا لیکن اب مجھے ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔ میں اس کے پاپا سے ہی مخاطب ہوئی۔

''کیا رہا پاپا؟''

''ابھی تو چیک اَپ ہو گا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ہم امید کے سہارے ہر جگہ لیے پھر رہے ہیں حالانکہ وہ مانتا بھی نہیں ہے۔ کبھی تو بالکل زبردستی کرنی پڑتی ہے۔ جیسے بچوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔'' وہ افسردگی سے بولے۔

''معجزے بھی تو ہوا کرتے ہیں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''ہاں۔'' انہوں نے سر ہلایا۔

ہم کتنی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ کہنے کو کسی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ایسے میں ہی ایک ڈاکٹر ہماری طرف بڑھا۔

''مسز تیمور کہاں ہیں؟'' اس نے ہمیں مخاطب کیا۔

''جی میں ہوں۔'' میں ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دل دھک سے رہ گیا تھا۔

''میں تیمور کی ممی ہوں۔'' وہ بھی اُٹھ آئیں۔ پاپا بھی قریب آ گئے۔

''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم تیمور صاحب کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ رپورٹس تو

پہلے بھی واضح ہیں۔ کینسر کافی پھیل چکا ہے۔ دماغ سے جسم کے باقی حصوں کی طرف بڑھ گیا ہے۔ اب صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ مریض کو درد سے ایک حد تک نجات دلائی جا سکے۔ انہیں ایڈمٹ کرنا بھی بیکار ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بس آپ مریض کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھیں اور ان کی خواہشیں پوری کریں۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

ان میں سے کوئی بات نئی نہیں تھی پھر بھی نہ جانے کیوں ان باتوں کو سن کر ہر مرتبہ نئے سرے سے دل دُکھتا تھا۔

☆======☆======☆

ہماری کار جوہر ٹاؤن کی ویران سڑکوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی اور میں اب بھی ڈاکٹر کے الفاظ میں اُلجھی ہوئی تھی۔

''فرو کافی دیر سے ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔'' نبیلہ نے کہا۔

''مجھے وہاں نہیں جانا۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ تمہیں وہاں جانا ہے۔'' نبیلہ نے تیزی کے ساتھ مجھے ٹوک دیا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میں اس وقت گھر جانا چاہتی ہوں۔ اپنے بیڈروم میں۔ مجھے تنہائی چاہیے۔''

''تاکہ آنسو بہاؤ اور دیواروں سے سر ٹکراؤ۔ اب میں تمہیں ان باتوں کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہاری وجہ سے پاپا کا ایک ایک لمحہ عذاب ہو گیا ہے۔ شدید ٹینشن میں رہنے لگے ہیں وہ۔ یوں بھی تم اپنی بہت من مانی کر چکی ہو۔ اب وہ ہو گا جو میں کہوں گی۔'' نبیلہ کا انداز فیصلہ کن تھا۔

میں تمام راستے اس سے لڑتی' اس پر غصہ کرتی' منت کرتی رہی لیکن اس پر اثر نہیں ہوا۔ میرے آنسو بھی اسے موم نہ کر سکے۔ وہ مجھے سیدھے ایڈورٹائزنگ ایجنسی لے آئی۔ میں کار میں بیٹھی رہی اور وہ اندر سے ہمایوں اور نیلوفر کو بھی بلا لائی۔ بادلِ نخواستہ مجھے کار سے اترنا پڑا۔

''اب یہ ضد کر لے روئے دھوئے' دیواروں سے سر پھوڑے' اسے چھٹی کے وقت تک یہیں ٹکائے رکھنا۔ یوں بھی لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ بہت مان لی اس کی اور

بہت سمجھالیا اسے۔ یہ طریقے فیل ہو گئے ہیں اسے سدھارنے کے لیے۔'' نبیلہ نے کہا۔

''تو اجازت ہے پھر کان سے پکڑ کر اس کا دماغ درست کرنے کی۔'' نیلوفر شرارت سے ہنسی۔

''بالکل اجازت ہے۔'' نبیلہ نے کہا۔

میں خاموش تھی لیکن مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ لوگ میری بات کیوں نہیں سمجھتے' میرے دکھ کو کیوں محسوس نہیں کرتے۔ زندگی اب بھی پہلے کی طرح رواں دواں تھی۔ بس ایک تیمور آہستہ آہستہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چلا جاتا تب بھی دنیا نے یونہی رہنا تھا۔ ہنسنے والوں نے ہنسنا تھا' کسی دکھ پر تھوڑی دیر کے لیے آنسو بہا لینے تھے اور پھر اپنے آپ میں اور اپنی دنیا میں مگن ہو جانا تھا۔

☆=====☆=====☆

وہ دن عجیب متضاد کیفیتوں میں بسر ہوا تھا۔ میرے اندر دکھ ڈیرا جمائے بیٹھے تھے اور میرے اردگرد زندگی کی رونقیں تھیں۔ کام کا زور تھا کہ کلائنٹ کو شام تک اسٹوری بورڈ بنا کر دکھانا تھا۔ سبھی تیزی سے کام نمٹانے میں مصروف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ باتیں تھیں' قہقہے تھے بھی جب کسی کی دلچسپ بات میری توجہ اپنی طرف مبذول کرواتی تھی اور سب کے ساتھ میں بھی ہنس پڑتی تھی تو ایک دم میرے اندر سے کوئی مجھے ٹوک دیتا تھا۔

''کس چیز پر ہنس رہی ہو؟ کیا بھول گئیں کہ تیمور موت کے بالکل کنارے پر کھڑا ہے۔ ایسے میں بھی ہنسنے کا حوصلہ ہے تم میں؟''

اور میرے اندر ملامت کے ڈھیر لگ جاتے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میں تیمور سے غافل ہو گئی ہوں۔ جیسے کسی بڑے جرم کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ کوئی انتہائی قبیح فعل سرزد ہو رہا ہے مجھ سے۔

شام تک یہی آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ میں وہاں سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ اپنے بیڈروم میں تنہائی کے کندھے سے سر ٹکا کر خوب رونا چاہتی تھی لیکن نیلوفر مجھے جانے نہیں دے رہی تھی۔ آفس ٹائم ختم ہوا تو وہی مجھے گھر چھوڑنے بھی آئی۔

''اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ ابھی ایک ڈنر کے لیے تیاری کرنی ہے۔ ہمایوں بھی کار میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ ویسے آفس میں یہ نہیں روئی البتہ راستے بھر آنسو بہاتی آئی

ہے۔ افاقہ ہو ہی جائے گا آہستہ آہستہ۔'' نیلوفر نے نبیلہ کو رپورٹ دی۔

''میں کل آفس نہیں جاؤں گی۔'' میں نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

''تم تو آج بھی نہیں جانا چاہ رہی تھیں لیکن اب تمہارے کچھ چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' نبیلہ نے کہا پھر نیلوفر سے مخاطب ہوئی۔ ''تھینک یو فرو میں کل اسے پھر آفس چھوڑ جاؤں گی۔''

میں پاؤں پٹختی اندر چلی گئی۔ پاپا نے میرے غصے اور جھلاہٹ کو محسوس کر لیا۔ وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا تو بازو پھیلا دیئے۔ میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور کتنے آنسو بہا ڈالے۔ نبیلہ اندر داخل ہوئی تو مجھے یکسر نظر انداز کر کے پاپا سے مخاطب ہوئی۔

''پاپا تیار ہو جائیں۔ میں نے آپ کے کپڑے استری کر دیئے ہیں۔''

''کہیں جا رہے ہیں پاپا؟'' میں نے آنسو صاف کر کے ان سے پوچھا۔

''صرف میں نہیں جا رہا آپ اور بیلا بھی جا رہے ہیں۔ یونہی کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی گھر میں۔ سوچا باہر نکلنا چاہیے۔ بیلا نے پروگرام بنایا کہ پرل میں بخارا ریسٹورنٹ چلنا چاہیے۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔ باربی کیو کھائے۔ اب آپ بھی جلدی سے تیار ہو جائیں۔''

میں نے بحث کرنے کی کوشش کی' سر درد کا بہانا بنایا لیکن دونوں نے ہی میری نہیں سنی اور مجھے ساتھ گھسیٹ لے گئے۔

واپس آ کر میں بہت اُداس تھی۔ نبیلہ میرے آفس جانے کے لیے کپڑے استری کر رہی تھی۔ میں پاپا کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''پاپا۔'' میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ''میں بہت اُداس ہوں۔''

انہوں نے میرا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

''مجھے ہنسنا اچھا نہیں لگتا۔ لوگوں کے بیچ رہنا اچھا نہیں لگتا۔ روز بروز میں چڑچڑی ہوتی جا رہی ہوں۔ میں خوش ہو جاؤں تو مجھے خود پر غصہ آنے لگتا ہے۔ میں کیسے خوش ہو سکتی ہوں جب تیمور خوش نہیں ہے۔ موت سے قریب ہے۔ میں اسی لیے آفس نہیں جانا چاہتی کیونکہ وہاں میں خوش ہونے لگتی ہوں۔ کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات دلچسپ لگتی ہے۔ میں اس طرف متوجہ ہو جاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسا کرنے سے میں تیمور کو بھول جاؤں گی۔ اس کے دکھ کو بھول جاؤں گی۔ میں اس درد کو فراموش نہیں کرنا چاہتی۔ پلیز آپ بیلا کو منع کر

دیں۔ وہ میری نہیں سنتی۔ مجھ سے ایسی باتیں کرتی ہے کہ میں اس کی ماننے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ آپ اسے بتا دیں کہ میں آفس نہیں جاؤں گی۔"

"سجو! اگر مرنے والوں کے ساتھ مرنا ممکن ہوتا تو میں آپ کی ممی کے گزر جانے کے بعد اگلا سانس بھی نہ لے پاتا۔ قدرت کا نظام ایسا ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ زندہ رہنے والوں کے ساتھ زندہ رہا جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ آپ بچوں کو میری ضرورت تھی اور آپ کی خاطر میں نے خود کو سنبھالا تھا۔ اب جب میں بوڑھا ہوں۔ ناتواں ہوں' اس وقت مجھے آپ کی ضرورت ہے کیا آپ اپنے پاپا کی خاطر خود کو نہیں سنبھالیں گی؟

آپ کے خوش ہونے یا ہنسنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ تیمور سے غافل ہو گئی ہیں۔ یہ سب انسان کے فطری تقاضے ہیں۔ وہ خوش ہوتا ہے۔ دکھ ہو تو روتا' ہے دلچسپ بات پر ہنستا ہے۔ بھوک لگنے پر کھانا کھاتا ہے۔"

کتنی دیر وہ اسی طرح مجھے سمجھاتے رہے۔

میرا آفس جانا باقاعدہ ہو گیا۔ گو کہ میں وہاں جاب نہیں کر رہی تھی۔ صرف کمپیوٹر سیکھنے گئی تھی۔ پھر بھی کافی دیر تک وہاں رکتی تھی۔

ہر روز میں دن میں کم از کم دو مرتبہ اس کے پاپا کو فون کرتی تھی۔ کبھی درمیان میں دل گھبراتا تھا' تب بھی فون کر لیتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا کہیں گے۔ وہ بھی دہرائی ہوئی باتوں کو دہراتے تھے۔ ہم دونوں ہی اس معمول سے نہ تھکتے تھے۔ نہ اکتاتے تھے۔

اور میں اپنے گرد نگاہیں دوڑاتی تھی۔ لڑکیاں جب اپنے بوائے فرینڈ کا ذکر کرتی تھیں یا لڑکے ہی لڑکیوں کو تاکتے تھے یا ان باتوں سے ہٹ کر کوئی اور بات ہوتی تھی۔ کام ہوتا تھا جھگڑے ہوتے تھے...... پیشہ ورانہ رقابت ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے پر مجبور کرتی تھی۔

جب سینئرز اپنے جونیئرز کا بہترین کام بھی ناک چڑھا کر پہلے ایک جانب سرکا دیتے تھے اور بعد میں اپنے کیے کام میں ان کے کام کے جز بھی شامل کر دیتے تھے تو مجھے احساس ہوتا تھا کہ دنیا کو ابھی نہ جانے اور کتنے برس یونہی چلتے جانا ہے۔

☆=====☆=====☆

میں ایپل میکنتاش کے سامنے بیٹھ کر گرافکس ڈیزائننگ کرتی رہتی تھی اور یہ واقعی ایسا کام تھا جس سے کوئی کبھی نہیں تھک سکتا۔ ساتھ اپنے گرد و پیش سے اُٹھتی آوازیں بھی سنتی جاتی

تھی۔

"پتا ہے رومی صاحب نے کیا کیا؟ خدایا اتنی بڑی کاپی رائٹنگ ہے ان کی اور اس پر مُصر ہیں کہ ان کے علاوہ یہ کام کوئی نہیں جانتا۔ میں ان کے پاس گئی تو اتنا روڈلی بولا انہوں نے مجھ سے۔ میں یہ بات قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔" تابندہ کہہ رہی تھی۔

"بڈھے ہو گئے ہیں اس لیے سٹھیا گئے ہیں۔" نائلہ نے اسے اپنی دانست میں تسلی دینا چاہی۔

"یہ ہماری نئی ریسپشنسٹ کو کچھ زیادہ ہی مشکوک قسم کے فون نہیں آنے لگے۔ میں جب وہاں سے گزرتی ہوں' شرمیلی شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشیوں میں فون پر بات کر رہی ہوتی ہے۔"

زمانہ تیز ہے۔ اس لیے موضوع فوراً ہی بدل گیا تھا۔

"کام ٹھیک کرتی ہے پھر کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر تھوڑی دیر اپنا دل خوش کر لے۔"

"میں نے جو موبائل بنایا تھا' شفیع نے اس میں کتنے کیڑے نکالے تھے۔ اب خود جو موبائل بنایا ہے ذرا دو چار رنگ اِدھر اُدھر کر کے سارا میرے والا ہے اور اب تمام تر کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈال لے گا۔ فیصل کے سامنے الگ نمبر بنائے گا۔"

"ویسے فیصل آ کب رہا ہے۔ میں زیادہ دن شفیع کو برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"سنا ہے اس اتوار کو آ رہا ہے۔ یوں بھی شفیع کو تو اس کی بیوی بھی برداشت نہ کر سکے۔ ہم کیسے کر سکتے ہیں۔" وہ ہنسی۔

پھر ایک جوابی قہقہہ۔

"اور فیصل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کاش میری منگنی نہ ہوئی ہوتی۔"

پھر قہقہہ۔

"شکر ہے میں ایسے کسی مسئلے کا شکار نہیں ہوں اور وہ بھی۔"

پھر ہنسی کی ملی جلی آوازیں۔

"ویسے مذاق چھوڑو فیصل آ جائے تو کام بہت آسان ہو جائے۔"

"ارے کام کہاں آسان ہو۔ تین چار مہینے تو ہو ہی گئے ہیں اسے یہاں آئے ہوئے۔ اب تک تو کام نہیں بنا' نہ اس کا نہ ہمارا۔" قہقہہ۔

"تم پتا نہیں کہاں کی ہانکنے لگتی ہو۔ تمہارا کام وہاں بنے گا بھی نہیں۔ میں کہہ رہی تھی کہ شفیع سے تو چھٹکارا ملے گا۔ کمبخت خواہ مخواہ سر پر سوار ہو گیا ہے۔ کوئی ذرا اپنے سے بہتر کام کرے' ماتھے پر سو بل نمودار ہو جاتے ہیں۔ ہزار کیڑے نکالتا ہے اور پھر خود بھی ویسا ہی کام کرتا ہے۔ فیصل کے آ جانے سے کم از کم یہ مصیبت تو نہیں رہے گی۔"

"پتا نہیں اتنا جلتا کیوں ہے شفیع۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ دنیا کا ہر کام اسی کو آئے۔ کوئی اور اس سے بہتر کام کر ہی سکتا ہے۔"

موضوع بدل گیا تھا۔

اور میں سوچ رہی تھی کہ چند دن قبل تک میں انہی جیسی تھی۔ بے فکر' بے پروا' گوسپ کی شوقین' مشکوک فون کالز پر کان کھڑے کر لینے والی' ہر لڑکے اور ہر لڑکی کو مزے سے ڈسکس کرنے والی' کسی کے خلاف اور کسی کے حق میں بولنے والی۔ وقت اتنا آگے بھی نہیں بڑھا تھا لیکن میرے لیے سب کچھ تبدیل کر گیا تھا۔ ایک عجیب سی یاسیت میرے اندر گھر کر گئی تھی دور تک سناٹا پھیل گیا تھا۔

اس روز میں بہت بوجھل دل کے ساتھ آفس آئی تھی۔ تیمور کے پاپا نے بتایا تھا کہ وہ حد سے زیادہ چڑچڑے پن کا ثبوت دے رہا تھا اور صبح اس نے دوا لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"جب مجھے مرنا ہی ہے تو ان کی کیا ضرورت؟" اس نے دواؤں کی ٹرے نرس کے ہاتھ سے لے کر دور پھینک دی تھی۔ "آپ لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

اس کے ممی اور پاپا نے سمجھانا چاہا تو وہ ان سے اُلجھ پڑا۔ خوب جھگڑا اور جب بے دم ہو گیا تو تھک کر کہنے لگا۔

"میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو سجو کو اس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ ایک نئی خوشگوار زندگی شروع کر دے۔ خدایا میں کتنا خود غرض ہو گیا تھا۔ میں نے صرف اپنے لیے سوچا۔ یہ محبت تو نہیں تھی۔ پلیز اس سے کہیں کہ وہ اپنے لیے مجھ سے بہتر ہمسفر چن لے۔ میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ میں اسے کچھ نہیں دے سکا۔ کوئی ایک خوشی بھی نہیں۔ اب بھی بہترین سے بہترین شخص اسے اپنا سکتا ہے۔ اسے وہ سب مل سکتا ہے جو اس کا حق ہے۔"

اور یہ کہتے کہتے وہ رو پڑا۔

مگر میں بہت خود غرض تھی۔ اس کی یہ خواہش پوری نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایلڈس فری بینڈ پر کام کرتے ہوئے میں اپنی سوچوں میں اُلجھی ہوئی تھی جب مردانہ ہنسی کی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"تیمور۔" میز پر ہاتھ رکھ کر میں نے اپنی ریوالونگ چیئر پیچھے سرکائی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

مگر وہاں تیمور نہیں تھا۔ میں نے نیلوفر کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ کے درمیان کھڑی تھی۔

"فرو۔" میں نے اسے پکارا۔

وہ معذرت کر کے میرے پاس چلی آئی۔ میرے چہرے پر پھیلے جذبات کا اتار چڑھاؤ اس سے پوشیدہ نہیں رہا۔

"کیا ہوا؟ آر یو آل رائٹ۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ ابھی تیمور ہنسا تھا۔ تم نے آواز سنی تھی؟"

میرے جذباتی ہیجان نے اسے پریشان کر دیا۔ پھر بھی وہ تحمل سے بولی۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے تیمور یہاں نہیں ہے اور یہ کمپیوٹر پر اس وقت تم کیا کر رہی ہو؟ کون سا پروگرام ہے؟ اچھا ایلڈس فری بینڈ ہے۔" اس نے مجھے دوسری طرف متوجہ کرنا چاہا۔

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ میں نے خود سنا ہے۔" میرا لہجہ پُر یقین تھا۔

اسی لمحے لڑکے لڑکیوں کے اس گروپ سے ہنسی کی وہی آواز اُبھری اور اس کے بعد ملی جلی آوازیں میں نے اس سمت میں دیکھا۔ وہاں بہت سے لوگ تھے مگر ان میں کہیں تیمور نہیں تھا۔ میرے اندر کی گھٹن بڑھنے لگی۔

"ہاں فرو' وہ تو نہیں ہے۔" میں نے کھوکھلے سے انداز میں کہا اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھنے لگی۔

"آؤ تمہارا تعارف اپنے کری ایٹو ڈائریکٹر سے کراؤں۔" اس نے کہا۔

"پلیز فرو اس وقت نہیں۔ بعد میں سہی۔"

اس نے اصرار نہیں کیا اور واپس مڑ گئی۔ میرے لیے کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ تیمور کی

یادیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔ کمپیوٹر بند کر کے میں نے نیلوفر کو اپنی جانب متوجہ کیا جو قریبی میز پر کوئی موبائل دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ میرے قریب چلی آئی۔

"مجھے تیمور کے پاپا کو فون کرنا ہے لیکن یہاں نہیں کسی ایسے کمرے میں جہاں کوئی نہ ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے میں سکون چاہتی ہوں۔"

وہ مجھے آفس میں تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ نبیلہ کی بھی یہی ہدایت تھی لیکن اس وقت میرے چہرے پر پھیلے اضطراب کو دیکھ کر راضی ہوگئی۔

"آؤ۔" اس نے کہا۔

میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ ان لمحوں میں میرے لیے دنیا ختم ہو چکی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ نیلوفر مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ بس تیمور تھا اور اس کا خیال اس ہنسی نے ساکت پانی میں کیسی لہریں پیدا کر دی تھیں۔

نیلوفر نے دروازہ کھول دیا۔

"بس تھوڑی دیر، گفتگو طویل مت کرنا، جس کا آفس ہے وہ تھوڑی دیر میں اندر چلا آئے گا۔" اس نے کہا۔

میرے لیے سب کچھ بے معنی تھا۔ آفس چیئر پر اس بھاری میز کے پیچھے بیٹھ کر میں نے ٹیلی فون سیٹ اپنی جانب کھسکا لیا۔ اسی لمحے میری نگاہ قریب ہی رکھی مالبرو کی ڈبیا پر پڑی۔ بے اختیار میں نے وہ ڈبیا اٹھالی۔ سگریٹ کا یہی برانڈ تیمور بھی پیا کرتا تھا۔ ایک پل میں کتنی یادیں روشن ہوگئیں۔

وہ کس طرح تھوڑا سا جھک کر لائٹر سے سگریٹ جلایا کرتا تھا اور شادی کے بعد جب تک اس نے اسموکنگ نہیں چھوڑی تھی میں ہی اسے لائٹر جلا کر دیا کرتی تھی۔ ایسے میں اس کے ہونٹوں پر کتنی خوبصورت مسکراہٹ پھیل جاتی تھی اور وہ کس طرح شکریہ کہتا تھا۔

اور جب اس نے سخت سردی میں اپنی جیکٹ مجھے دی تھی، جس سے بروٹ اور مالبرو کی ملی جلی مہک اُٹھ رہی تھی اور اس کے جسم کی گرمی ابھی جیکٹ میں موجود تھی اور میں نے اس جیکٹ میں ہاتھ ڈالا تھا اور وہاں مالبرو کی ڈبیا اور لائٹر کو محسوس کیا تھا۔

یادیں، کتنی یادیں تھیں پاگل کر دینے والی۔ ایک کے بعد ایک ذہن کے پردے پر

روشن ہوتی چلی جاتی تھیں۔

خود کو بمشکل آنسو بہانے سے روکتے ہوئے میں نے نمبر ڈائل کیا۔

"پاپا! تیمور نے دوالی؟"

"نہیں۔" انہوں نے کہا۔

اس ایک لفظ نے میرا ضبط چھین لیا۔ رکے ہوئے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔

"پلیز اس سے کہیں دوا لے لے، پلیز پاپا کسی بھی طرح۔"

"اُس نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ بہت کوشش کی لیکن اس نے ٹرے پھینک دی۔ برتن بھی توڑ دیے۔"

میں بری طرح سے رو دی۔

"سجو! جو رشتہ اب صرف کاغذ پر رہ گیا ہے اسے توڑ دیں۔ تیمور کی آخری خواہش سمجھ کر۔ اس کے دل سے یہ بوجھ اُترے گا تو شاید اس کا رویہ بہتر ہو جائے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ نہیں.... نہیں۔"

میں نے فون واپس پٹخ دیا۔

مجھے سب پر غصہ تھا۔ تیمور پر بھی اور اس کے پاپا پر بھی۔

تیمور صرف اپنی من مانی کرنا چاہتا تھا۔ اسے صرف اپنے دل پر پڑے بوجھ کا احساس ہے۔ میرا خیال نہ اسے پہلے تھا اور نہ اب ہے اور اس کے پاپا۔ ظاہر ہے وہ تو تیمور کے حوالے سے ہی سوچیں گے ناں۔ کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی انہوں نے کیونکہ انہیں صرف اپنے بیٹے کا احساس ہے۔ اس کے دکھ پر ان کا دل خون ہو جاتا ہے۔ میں کون ہوں جس کے بارے میں سوچنے کی زحمت کی جائے۔ جس کی محبت اور جس کے جذبات کا خیال کیا جائے، جس کے دکھ پر آنسو بہائے جائیں۔ انہوں نے بھی بالآخر تیمور کا ہی ساتھ دیا۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور نیلوفر نے اندر جھانکا۔ پھر مجھے یوں روتے دیکھ کر تیزی سے اندر چلی آئی۔

"کیا ہوا سجو!" اس نے میرا چہرہ اپنی جانب کیا۔

"وہ کیوں مجھے طلاق دینا چاہتا ہے اور اب پاپا بھی اس کی طرف داری کرنے لگے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں سب کچھ بھول جاؤں۔ فرو! کیا بھولنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے؟ جو لمحے

میری زندگی میں قید ہو چکے ہیں انہیں کیسے نکال کر پھینک سکتی ہوں میں۔ محبت کیا اتنی ہی عام اور ارزاں چیز ہوتی ہے' وہ بھی خود غرض ہے اور اس کے پاپا بھی۔ میں نے اس کی سب باتیں مانی ہیں' لیکن یہ نہیں مان سکتی۔''

''اچھا اُٹھو! یوں بھی یہ آفس ہے' ذرا سی بات کا افسانہ بن جاتا ہے۔ چلو اُٹھو منہ ہاتھ دھوؤ۔'' اس نے مجھے اُٹھایا اور کمرے سے متصل واش روم میں لے گئی۔

میں جی بھر کر آنسو بہانا چاہتی تھی۔ اس وقت اپنی اور تیمور کی یادوں کے درمیان میں کسی کی مداخلت نہیں چاہتی تھی' لیکن یہاں یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ سو منہ ہاتھ دھو کر نیلوفر کی دی ہوئی لپ اسٹک بھی لگانا پڑی۔ واش روم سے باہر نکلے تو بھاری آفس ٹیبل کے پیچھے ایک اجنبی بیٹھا ہوا تھا۔ نیلوفر مجھے اُسی طرف لے گئی۔ اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر مسکرا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔

''یہ میری بہت پیاری بچپن کی سہیلی ہے۔ بجیلہ شاہ بلکہ یہ سہیلی کم اور بہن زیادہ ہے۔'' اس نے کہا پھر اجنبی کا تعارف کروانے لگی۔

''اور بجو! یہ فیصل عباس ہے۔ ہمارا نیا کری ایٹو ڈائریکٹر۔''

ہمارے درمیان نائس ٹو میٹ یو قسم کے رسمی فقروں کا تبادلہ ہوا۔ نیلوفر وہیں براجمان ہو گئی تھی اور مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔

''اس کے لباس سے بھی بروٹ کی مہک اُٹھ رہی ہے اور میز پر مالبرو کی ڈبیا۔'' میں سوچ رہی تھی۔

میرا ذہن پھر تیمور میں بھٹکنے لگا۔

''بجیلہ آج کل کمپیوٹر سیکھنے آئی ہوئی ہے' ویسے پہلے یہاں جاب بھی کر چکی ہے۔ آج کل محض وقت گزاری کے لیے آ رہی ہے۔ میں چاہ رہی تھی کہ تم اسے گائیڈ کرتے رہو۔ ویسے خود بھی ماشاءاللہ کافی لائق ہے۔''

''کیا سیکھ رہی ہیں آپ آج کل؟'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''ایپل میکنٹاش کر رہی ہوں۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''ہوں اور کون سا پروگرام؟''

''ایلڈس فری ہینڈ۔''

''اب تو آئی بی ایم کمپیٹیبل بھی آ گیا ہے' یہ زیادہ بہتر ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ٹرائی کر سکتی ہیں۔'' اس نے اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''تھینک یو۔''

''ویسے میں اپنے کمپیوٹر کے سلسلے میں بہت محتاط ہوں۔ میری نگرانی کے علاوہ آپ اسے استعمال نہیں کر سکیں گی۔''

''یہ صرف محتاط نہیں بلکہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ اور حد درجہ محتاط ہے۔'' نیلوفر نے کہا۔

''اس لیے کہ یہ صرف کھیلنے کی چیز نہیں ہے۔''

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''آپ نے پہلے کبھی کمپیوٹر استعمال کیا ہے؟''

میری آنکھوں میں بیتے دن روشن ہو گئے۔

''ہوں' پہلے میں تھوڑا بہت ایم ایس ورڈ پر کام کرتی رہی ہوں۔''

وہ بیتے دن جب میں تیمور کے آرٹیکل ٹائپ کیا کرتی تھی۔

''اب میکنٹاش پر ایلڈس فری ہینڈ کر رہی ہوں۔''

''دیکھو فیصل! ذرا دھیان سے سکھانا میری یہ سہیلی ذرا نازک مزاج ہے' خلافِ مزاج بات پر آتش فشاں بن جاتی ہے۔''

پھر میری جانب معذرتی انداز میں دیکھا۔

''تم مائنڈ مت کرنا۔ فیصل میرا اور ہمایوں کا اسی طرح اچھا دوست ہے جیسے تم ہو۔ ہمارے درمیان ہر قسم کا مذاق چلتا رہتا ہے۔''

فیصل ہولے سے ہنسا۔ میں چونک گئی۔ کتنی ملتی تھی اس کی ہنسی تیمور سے۔ میں ایک ٹک اس کی جانب دیکھے گئی۔

اب سے پہلے میں نے اسے بغور نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی' مگر اب اس کی ہنسی' میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا اور اس کے لباس سے اُٹھتی بروٹ کی مہک نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اسے غور سے دیکھوں۔

کھلتی ہوئی گندمی رنگت' کشادہ پیشانی' گہرے رنگ کی آنکھیں۔ مجموعی طور پر وہ بہت

وجیہہ نوجوان تھا اور بہت کم عمری میں اس مقام تک پہنچ گیا تھا۔

مگر تیمور جب صحت مند تھا تو اس سے کہیں زیادہ ہینڈسم تھا۔ اس جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ پہلے دن اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا جیسے وہ سیدھا جی کیو کے صفحات سے نکل کر۔

میری سوچوں کو ٹیلی فون کی تیز گھنٹی نے منتشر کر دیا۔ اُس نے ریسیور اُٹھا لیا تھا۔ میں اپنی جگہ انتہائی شرمندہ تھی' اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کچھ گہری ہو چکی تھی اور فون پر بات کرتے ہوئے بھی وہ دلچسپی سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر سے میں یوں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''نہ جانے کیا سوچا ہو گا اس نے کہ میں یوں بغور اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں مجھے بھی کیا ہو جاتا ہے۔ کیوں بالکل اچانک اپنے خیالوں میں گم ہو جاتی ہوں۔ دیکھنے والوں پر کتنا منفی اثر پڑتا ہو گا۔ میری شخصیت کے متعلق۔'' میں نے سوچا۔

نیلوفر اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''اُٹھو فرو! مجھے اب گھر جانا ہے۔''

''آئی ایم سوری تم ابھی نہیں جا سکتیں۔ بیلا ویسے بھی مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ تمہیں لے کر اس وقت میں تمہارے گھر میں قدم رکھا تو اس نے یہ الزام بھی میرے سر دھر کر مجھے کچا چبا جانا ہے۔ میری تو خیر ہے میرے میاں کا کیا بنے گا؟'' مذاق مذاق میں اس نے واضح انکار کر دیا۔

''میں خود چلی جاؤں گی۔'' میں اُٹھتے ہوئے بولی۔

''تم ایسا نہیں کرو گی۔'' اس نے مجھے گھورا۔

وہ آفس تھا' میں اس سے لڑ جھگڑ نہیں سکتی تھی۔ بادلِ نخواستہ مجھے وہیں ٹھہرنا پڑا۔

☆=====☆=====☆

فیصل وہاں جس حیثیت میں تعینات تھا' اس کی ذمہ داریاں بے شمار تھیں۔ اس کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ سارا دن مجھے کمپیوٹر سکھانے میں صرف کر دیتا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ ہر روز باقاعدگی سے تھوڑا بہت وقت مجھے دیا کرتا تھا۔

مجھے بھی اس سے زیادہ وقت نہیں چاہیے تھا' بلکہ میں اس کے ساتھ بے چین ہی رہتی تھی۔ وہ کہیں سے بھی تیمور جیسا نہیں تھا۔ تیمور اپنی صحت مندی کے دنوں میں اس سے کہیں

بہتر تھا۔ پھر بھی اس کی ہنسی' مالبرو کی ڈبیا اور بروٹ کی مہک مجھے پریشان کر دیتی تھی مجھے احساس بھی نہیں ہوتا تھا اور میری کی بورڈ پر چلنے والی انگلیاں رک جاتی تھیں اور وہ ہنستا تھا اور میری نظریں اس پر ٹک جاتی تھیں۔

یوں بھی تیمور کے بارے میں کہیں سے بھی کوئی اچھی خبر نہیں مل رہی تھی۔ حال اور مستقبل مجھے خوفزدہ کر دیتے تھے۔ ہر بری خبر کے بعد میں ماضی کی غلام گردشوں میں بھٹکنے لگتی تھی۔ میرے بس میں کچھ نہیں تھا' اس لیے میں آنکھیں بند کر لینا چاہتی تھی کہ سب مناظر میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں۔

ایسے میں فیصل کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔ ایک دن بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''تم کہاں کھوئی رہتی ہو بجیلہ؟''

میں نے نظریں اُٹھا کر اس کی جانب دیکھا' اس کے چہرے پر دوستی تحریر تھی' اپنائیت تھی۔

''کہیں نہیں۔'' میں نے نگاہیں اسکرین پر جما دیں۔

''فرو نے بتایا تھا کہ تم خاصی نازک مزاج ہو اور آتش فشاں کا سا مزاج رکھتی ہو۔ مجھے تو تم بہت مختلف لگی ہو۔ خاموش' سادہ' کھوئی کھوئی۔ فرو نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے یا پھر تم بدل گئی ہو؟''

''وقت گزرتا ہے تو پھر اپنے قدموں کے نشان چھوڑتا جاتا ہے۔ انسان بہت بدل جاتا ہے۔ فرو نے بھی غلط نہیں کہا۔ بس میری دنیا ہی بہت محدود ہو گئی ہے' جو میرے اپنے ہیں ان کے لیے اب بھی میں پہلے جیسی ہوں مثلاً پاپا' بیلا اور فرو کے لیے۔'' میں مسکرائی۔

''خوش رہا کرو۔'' اس نے کہا۔

میں اسے نظر انداز کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ دل میں طوفان سا مچا ہوا تھا۔

''لوگوں کے لیے کتنا آسان ہوتا ہے نصیحت کر دینا خوش رہا کرو۔ ہونہہ! خوشیاں بھی کہیں درختوں پر اُگتی ہیں کہ اتار لی جائیں۔ یہ تو دل کی زمین میں خود بخود پھوٹتی ہیں' جیسے میرے دل نے محسوس کی تھی' جب تیمور نے فرو سے کہا تھا۔

''بجیلہ کو دیکھ کر ایسا ہی ہوا ہے' میرے دل میں ایک گھنٹی سی بجی ہے۔ میرے وجدان نے کہا ہے کہ یہی تو ہے وہ جس کی مجھے تلاش تھی' اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی میں نے جان لیا تھا

کہ اسی لڑکی کو میری زندگی میں آنا ہے میری دنیا آباد کرنی ہے۔''

اور لمحوں میں میرے دل کے دروازے کھل گئے تھے۔ مجھے لگا تھا جیسے وہ میرا اپنا ہو' مجھ سے بہت قریب۔ اس پل مجھے لگا تھا کہ میری محبت' میری زندگی کی خوشی مجھ سے صرف اتنی دور تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھولوں اور اس کے سب رنگ اپنی ہتھیلی کی لکیروں میں محفوظ کر لوں۔

''جمیلہ شاہ۔''

فیصل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''ہاں'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف دیکھو۔'' اس نے کہا۔

میں Seasons Greetings کا کارڈ ڈیزائن کرنے بیٹھی تھی' اب اسکرین پر اس کی جگہ Desktop پر لکھا ہوا فقرہ چل رہا تھا۔ لائف از ڈیڈ اینڈ اسٹریٹ۔

''یوں وقتاً فوقتاً کھو جانے سے تم یہ کارڈ ڈیزائن نہیں کر پاؤ گی۔'' وہ بولا۔

''آئی ایم سوری۔'' میں شرمندہ ہو گئی اور جلدی سے ماؤس کو حرکت دے کر دوبارہ ڈیزائن اسکرین پر لے آئی۔ مگر میرے ذہن میں یہ فقرہ ہلچل مچا رہا تھا۔

''لائف از اے ڈیڈ اینڈ اسٹریٹ۔''

میں نے فیصل کی طرف دیکھا جو فون پر اپنے کسی کلائنٹ سے محوِ گفتگو تھا۔

''ہونہہ! اسے کیا پتا زندگی اور موت کے درمیان کا سفر کتنا تکلیف دہ' کتنا اذیت ناک ہوتا ہے' اسے کیا خبر ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگوں پر زندگی بہت مہربان ہوتی ہے وہ غم اور اس کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے لیے غموں کے اندر سے گزرنا پڑتا ہے' دکھ کو محسوس کرنا ہوتا ہے۔

یوں ہنسی مذاق میں کہہ دینا کہ لائف از اے ڈیڈ اینڈ اسٹریٹ۔ مختلف بات ہے اور اسے اپنے جسم و جان سے محسوس کرنا بالکل دوسری۔''

فیصل نے اپنے ٹیبل سے انگلی سے دستک دی' میں چونک گئی۔ اس نے بغیر کچھ کہے اسکرین کی جانب اشارہ کیا۔ میں پھر اپنی سوچوں میں اس قدر کھو چکی تھی کہ ڈیزائن اسکرین سے غائب ہو چکا تھا اور وہی فقرہ ایک مرتبہ پھر نمودار ہو گیا تھا۔

''لائف از اے ڈیڈ اینڈ اسٹریٹ۔''

میں نے سر پکڑ لیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے پھر میں کمپیوٹر بند کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئی ایم سوری! اس وقت میں کام نہیں کر سکوں گی۔ تمہارا وقت بھی خواہ مخواہ برباد کیا۔''

''سوری کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے مائنڈ نہیں کیا۔ صرف تمہیں اس کی اجازت ہے۔'' اس نے ''صرف'' اور ''تمہیں'' پر زور دیا۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور آفس سے باہر آ گئی۔

ہمایوں کے آفس میں وہ اور نیلوفر کسی بات پر ایک دوسرے سے زور و شور کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ میں اندر داخل ہوئی تو نیلوفر میری جانب متوجہ ہو گئی۔

''خیریت تو ہے' لگتا ہے رو پڑو گی ابھی' کیا فیصل نے ڈانٹ دیا' وہ ایسا کرتا تو نہیں ہے۔''

''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''کھڑی کیوں ہو' بیٹھو۔'' نیلوفر نے بازو سے پکڑ کر مجھے بٹھانے کی کوشش کی۔

''آئی ایم سوری! ایسا تو ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے۔ تم نے اور بیلا نے مجھے قیدی بنا کر رکھ دیا ہے۔ میری اپنی بھی کوئی خواہش ہو سکتی ہے' تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہو؟''

''اس لیے کہ ابھی انکل اور بیلا قائداعظم لائبریری میں ہوں گے' جب وہ واپس آئیں گے تو انہیں ایک شادی میں جانا ہوگا' جہاں جانے سے تم قطعی انکار کر چکی ہو اور یہ پہلے سے طے ہے کہ آج شام تمہیں میری طرف رہنا ہے۔''

نیلوفر ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہ پروگرام پہلے سے طے تھا اور مجھے معلوم بھی تھا' لیکن اب میری یادداشت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بیگ میز پر تقریباً پھینک کر میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''میں گھر جاؤں گی۔ وہ میرا گھر ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہاں پاپا اور بیلا ہیں یا نہیں۔''

"کیوں جھگڑے کا کوئی پہلو نکالتی ہو جبکہ جانتی ہو کہ میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔ تم چاہو تو میں تمہیں قائداعظم لائبریری میں ابھی اور اسی وقت انکل اور بیلا کے حوالے کر سکتی ہوں۔ تم چاہو تو ان کے ساتھ شادی پر بھی جا سکتی ہو' لیکن میں تمہیں تمہارے گھر نہیں چھوڑ سکتی' فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" نیلوفر کا انداز قطعی تھا۔

"ہمایوں! تم چوکیدار سے کہہ کر رکشا منگوا دو' میں مزید اس قید میں نہیں رہ سکتی۔"

"ہمایوں کون ہوتا ہے رکشا منگوا کر دینے والا' تم یہاں پر میری ذمہ داری میں ہو۔" نیلوفر کے لہجے میں تیزی تھی۔

میرا کسی پر بس نہیں چل رہا تھا آفس گلبرگ میں اندر کی طرف تھا اور وہاں سے رکشا نہیں ملتا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ میں نیلوفر سے لڑ جھگڑ کر آفس سے نہیں نکل سکتی تھی۔ آپس میں ہم ایک دوسرے کو کچھ کہہ لیں لیکن تھے تو آفس میں۔ جہاں معمولی بات کا فسانہ بن سکتا تھا۔ گھر ہوتا تو میں اس سے جھگڑ کر خود ہی گیٹ سے باہر نکل جاتی۔

اپنی بے بسی پر مجھے رونا آ گیا۔ ایک بے بسی ہی کیا اب تو ہر بات پر رونا آ جاتا تھا۔

"میری اپنی بھی کوئی مرضی ہو سکتی ہے۔ میں تم لوگوں کے بنائے ہوئے ٹائم ٹیبل پر نہیں چل سکتی۔ میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے ہو تم لوگ' مجھے بہت برا لگتا ہے' میں تو سانس بھی تم لوگوں کی مرضی کے بغیر نہیں لے سکتی اب۔"

"خواہ مخواہ پٹرول پھونکنے کی ضرورت؟ گھر جا کر بھی تو تمہیں رونا ہی ہے' اس کے بجائے یہیں رو لو۔"

"شٹ اپ فرو' تم پر یہ سب گزرتی تو میں تم سے پوچھتی۔"

اسی لمحے دروازہ کھول کر فیصل اندر چلا آیا۔ میں نے جلدی سے آنسو صاف کر ڈالے۔

"آئی ایم سوری! میں ٹھہر کر آ جاؤں گا۔" اس نے اندر ماحول میں تناؤ محسوس کر کے کہا۔

"آ جاؤ اندر' تم اتنے فارمل کب سے ہو گئے؟" نیلوفر نے کہا۔

وہ اندر چلا آیا۔ ہمایوں' نیلوفر سے مخاطب ہوا۔

"آج تم ہاف ڈے کر لو فرو! اور سجو کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤ' وہ پہلے ہی اپ سیٹ ہے تم مزید الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔"

میری تو جان چھوٹی تھی۔ ٹھیک ہے نیلوفر کے ساتھ مجھے اس کے گھر جانا تھا' لیکن گھر تو گھر تھا اور پھر نیلوفر سے میں کب کوئی بات راز رکھتی تھی۔ اس کے گھر میں بھی اس سے کھل کر لڑ سکتی تھی' اس پر چلا سکتی تھی' زور زور سے رو سکتی تھی۔

کیولری گراؤنڈ ایکسٹینشن میں اس کا گھر اپنے ساس سسر کے گھر کے بالکل ساتھ ہی تھا۔

"اب جتنا چاہو جی بھر کر رو لو۔" اس نے لیونگ روم میں صوفے پر اپنا بیگ اور دوپٹا پھینکا۔

مجھے اس اجازت کی کیا ضرورت تھی' آنسو بہنے کے لیے بے تاب تھے' گھر پہنچتے ہی بہہ نکلے۔

نیلوفر میرے رونے کی پروا کیے بغیر ادھر اُدھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹاتی رہی۔ نوکروں کو ہدایات جاری کیں' کپڑے تبدیل کیے' کچھ بکھری چیزیں سمیٹیں اور پھر مجھے نظر انداز کر کے سین سوئی کا واک مین لگا کر قالین پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

مجھے دوسرے غموں کے ساتھ ساتھ اس کی بے حسی پر بھی رونا آ رہا تھا۔

کافی دیر تک میں نے برداشت کیا' مگر کب تک' بالآخر اسے جھنجوڑ دیا۔

"کیا زلزلہ آ گیا؟" وہ اُٹھ بیٹھی۔

بات مجھ سے کر رہی تھی جبکہ ہیڈ فون کے ذریعے ساتھ ساتھ گانا بھی سن رہی تھی۔

میں نے ہیڈ فون نوچ کر دور پھینک دیا۔

"تمہیں میرا کوئی احساس نہیں ہے۔"

"واہ! کیا سراغ لگایا ہے۔ محترمہ آپ کا کچھ زیادہ ہی احساس کرتے رہے ہیں سب' ورنہ آپ سدھر چکی ہوتیں۔" اس نے واک مین بند کر کے ہیڈ فون بھی اس کے ساتھ ہی میز پر رکھ دیا۔

"تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے' ورنہ کبھی ایسی بات نہ کرتیں۔" میں نے منہ پھلا لیا۔

"دیکھو سجو!" اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ "تمہارا غم صرف تمہارا ہے جسے صرف تم نے ہی برداشت کرنا ہے' ہم تمہیں حوصلہ دے سکتے ہیں اور دیتے رہتے ہیں' لیکن تم خود ترسی

کے حصار میں بری طرح قید ہو چکی ہو۔تم چاہتی ہو کہ جب تم روؤ تو سب مل کر تمہارے ساتھ روئیں۔افسوس' یہ ممکن نہیں ہے۔تم چاہتی ہو کہ تم ہر وقت تیمور کے متعلق باتیں کرتی رہو اور سب سنتے رہیں۔میری جان تیمور ہم سب کے لیے اہم ہے' لیکن اتنا نہیں جتنا اہم تمہارے لیے ہے' ہم سب کی اپنی زندگی بھی ہے اور وہ تمہاری زندگی سے جدا ہے۔ہمارے غم تمہارے غموں سے الگ ہیں' ہماری پریشانیاں تمہاری پریشانیوں سے مختلف ہیں اور جس طرح تمہاری زندگی' تمہارے غم اور تمہاری پریشانیاں تمہارے لیے اہم ہیں ویسے ہی ہمارے لیے' ہماری زندگی' ہمارے غم اور ہماری پریشانیاں ہیں۔''

''تم لوگوں کو کیا غم اور پریشانیاں ہیں' آرام سے اپنی اپنی دنیا میں' اپنی اپنی خوشیوں میں مگن ہو۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یہ تو تم سمجھتی ہو ناں کیونکہ اپنے مقابلے میں تمہیں سب ہی خوش لگتے ہیں۔''

''بات میری سمجھ کی نہیں ہے سب واقعی خوش ہیں' آفس میں دیکھو لو زندگی ویسے ہی چل رہی ہے سب پہلے کی طرح ہنستے بولتے' اور گوسپ کرتے ہیں جیسے کبھی میر' کیا کرتی تھی اور آج تو مجھے سب سے زیادہ غصہ فیصل پر آیا ہے۔''

''ارے اُس بے چارے سے کیا خطا ہو گئی—— وہ تو خاصا ٹھیک ٹھاک بندہ ہے۔'' نیلوفر نے کہا۔

''معلوم ہے اس نے اپنے کمپیوٹر میں ڈسک ٹاپ میں کیا فیڈ کیا ہوا ہے؟''

''کیا؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''Life is a Dead End Street''

''تو؟''

''تو یہ کہ حقیقت جاننا اور اسے سمجھنا دو مختلف باتیں ہیں۔کہنے کو تو سب ہی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہاں کیا فرق پڑتا ہے مرنے سے کہ یہ تو سبھی پر بیتتا ہے لیکن جب یہ بیتنے لگتا ہے تب اصل مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔اس نے اپنے کسی پیارے کو موت کے منہ سے قریب ہوتے نہیں دیکھا ہوگا' ورنہ اتنی تلخ حقیقت اس کے لیے یوں مذاق نہ ہوتی۔''

''اوہ گاڈ!'' نیلوفر نے سر پکڑ لیا۔

''کیا ہوا؟''

''ہونا کیا ہے سوائے اس کے کہ تم خواہ مخواہ ہی قنوطیت کے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہی ہو۔یوں بھی تم کیا جانتی ہو فیصل کے بارے میں؟''

''مجھے کچھ جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟اس کا رویہ زندگی کی جانب اس کی غیر سنجیدگی کا خود ہی اعلان کر دیتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم نے اس کے کس رویے سے اس بات کا اندازہ لگایا ہے؟'' نیلوفر نے پوچھا۔

''تم تو خواہ مخواہ بحث کرنے لگی ہو۔بس یہ میرا اندازہ ہے۔''

''اور تم بلاوجہ چڑچڑی ہو رہی ہو' اچھے بھلے بندے کو احمقوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔'' نیلوفر نے کہا۔

''تم اس کی طرف داری مت کرو' وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں واقعی بلاوجہ چڑچڑے پن کا ثبوت دے رہی تھی' لیکن اس پر میرا اختیار نہیں تھا۔

''سجو! کیا ہو گیا ہے تمہیں' پڑھ لکھ کر گنوا دیا تم نے۔وہ بہت نائس اور اچھا انسان ہے اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو کسی برائی کے زمرے میں آتی ہو' ایسے میں بغیر کسی وجہ کے اسے برا بھلا کہنا اچھی بات نہیں ہے۔''

نیلوفر کی بات سے میری آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے کہ رونے کے لیے چھوٹے سے بہانے کی ضرورت ہوتی تھی اور بس۔

''تم نہیں سمجھو گی فرو۔''

''تم سمجھاؤ گی تو میں سمجھ جاؤں گی۔'' وہ میرے قریب آ بیٹھی۔

اس کے محبت بھرے انداز کے سامنے میں نے پھر اپنا آپ کھول دیا۔

''فرو! وہ تیمور جیسا نہیں ہے' تیمور اس سے کہیں بہتر ہے لیکن اتنے عرصے سے میں تیمور سے نہیں ملی۔اس کی آواز اور اس کی ہنسی سننے کو کان ترس گئے ہیں۔ایسے میں جب فیصل ہنستا ہے تو میں ایک دم اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہوں۔اس کی ہنسی کتنی ملتی ہے تیمور کی ہنسی سے۔حالانکہ مجھے پتا ہوتا ہے کہ یہاں تیمور نہیں ہے پھر بھی وہ جب بھی ہنستا ہے تو میں چونک جاتی ہوں اور جب مجھے تیمور دکھائی نہیں دیتا اور خیال آتا ہے کہ وہ اپنے کمرے میں تنہا موت کا منتظر ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا' مجھے بہت رونا آتا ہے۔

اور فرو جب فیصل سموکنگ کرتا ہے اور اس کے قریب سے مالبرو اور بروٹ کی مہک آتی

ہے تو مجھے شدت سے تیمور کا خیال آتا ہے۔ یہ خوشبوئیں تو اس کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ فیصل نے کیوں اپنا لیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے اندر کا تمام غصہ فیصل پر نکال دوں' اسے منع کر دوں کہ وہ کبھی نہ ہنسے۔ اپنے جسم اور اپنی ذات سے ان خوشبوؤں کو جدا کر دے۔ آخر اتنے برانڈ کے سگریٹ بازار میں ملتے ہیں' اتنے پرفیومز ہیں جو اس سے زیادہ بہتر ہیں پھر وہ یہی دو چیزیں کیوں استعمال کرتا ہے۔''

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نیلوفر نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''سجو! کیوں خود کو مار رہی ہو' ختم کر رہی ہو۔ تم زندہ ہو اور تمہیں زندہ رہنا ہے' لیکن اس طرح سے تم اپنی موت کا سامان کر رہی ہو۔''

''میں زندہ رہ کر کیا کروں گی' جب تیمور سے زندگی رُوٹھ رہی ہے۔''

''پاگل مت بنو سجو۔''

وہ مجھے تسلی دیتی رہی اور کھانے کے بعد زبردستی ٹرینکولائزر دے کر مجھے سلا بھی دیا۔

سو کر اُٹھی تو میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ سستی کے مارے وہیں لیونگ روم میں صوفے پر لیٹی رہی۔ قریب ہی نیلوفر قالین پر ڈھیر سارا سامان بکھیرے کسی پروڈکٹ کا موبائل بنانے میں مصروف تھی۔

''اُٹھو منہ ہاتھ دھو لو اور میرے وارڈ روب سے کوئی کپڑے نکال کر ڈریس بھی تبدیل کر لو' اتنی دیر میں' میں چائے منگواتی ہوں۔'' اس نے ٹشو پیپر کے ساتھ ہاتھ پر سے گلو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں' اُٹھتی ہوں۔'' میں بولی حالانکہ میرا اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''ان اُلجھے بالوں اور شکن آلود کپڑوں میں بھوت لگ رہی ہو' اُٹھ بھی چکو اب'

''ہوں۔'' میں نے پھر آنکھیں موند لیں اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔

''اس وقت پاپا اور بیلا شادی پر جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ اتنے قریبی جاننے والوں کی شادی میں' میں نہیں جاؤں گی تو ضرور پوچھا جائے گا اور سرگوشیوں میں کتنی باتیں ہوں گی اور چلی جاؤں گی تب بھی ہمدردی کے پردے میں کتنے تیر دل میں پیوست ہوں گے' کتنے لوگ جانتے بوجھتے انجان بن کر پوچھیں گے۔

''سجو! اپنے پاپا کی طرف آئی ہوئی ہو۔ اچھا ہے ذرا ریلیکس ہو جاؤ گی۔ تمہیں بھی دو

چار دن آرام کی ضرورت ہے۔''

اور پھر اچانک کوئی کہے گا۔

''اُڑانے والے بھی کیا خوب باتیں اُڑاتے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ تمہاری علیحدگی ہو گئی ہے۔''

اور یہ باتیں میں نہیں سن سکتی حالانکہ کہنے والے اب بھی کہیں گے' بیلا کے کانوں تک سب کچھ پہنچائیں گے' یہ تو ضرور کہیں گے کہ ہم نے کہا نہیں تھا یہ شادی نہیں چل سکتی اور بیلا یہ سب برداشت کر کے آ جائے گی۔ ظاہر ہے اور کر بھی کیا سکتی ہے' وہی کیا' میں بھی کیا کر سکتی ہوں' شادی میں نہیں گئی کہ یہ باتیں مجھے مزید کتنے دن تک ڈسٹرب رکھیں گی' جب کہ یہاں صوفے پر لیٹے بھی میں انہی سوچوں کے متعلق سوچے جا رہی ہوں۔''

اپنی سوچوں میں گم میں اس وقت چونکی جب کوریڈور سے ہنسی کی وہی جانی پہچانی آواز اُبھری۔ ایک لمحے میں' میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''تیمور۔'' میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ اور پھر ہمایوں کے ساتھ فیصل کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میرے اندر عجیب لاوا سا اُبلنے لگا۔ دکھ اور غصے کی لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس نے شاید اندر آ کر سلام کیا تھا' کوئی اور بات بھی کی تھی لیکن میں اسے نظر انداز کر کے دوپٹا کندھے پر ڈال کر اُلجھے بال سمیٹتے اور کپڑوں کی شکنیں درست کرتے ہوئے نیلوفر کے بیڈ روم میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ بھی میرے پیچھے آ گئی۔

''یہ پہن لو۔'' اس نے ورڈ روب سے اپنا آف وائٹ چکن کا سوٹ نکال کر میری جانب بڑھایا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ہینگر تھام لیا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''سجو!''

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

''آئی ایم سوری۔ اصل میں فیصل' ہمایوں کا بہت پرانا اور گہرا دوست ہے۔ دونوں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں' پھر فیصل ملک سے باہر چلا گیا تھا' اب چند مہینے پہلے ہی واپس آیا ہے۔ تم یقین کرو' وہ بہت اچھا ہے' لیکن تم ڈسٹرب ہو رہی ہو تو میں اسے یہاں سے جانے

کے لیے کہہ دیتی ہوں۔ اس کا پروگرام تو تھا کہ یہیں ڈنر کرے گا' مگر میں اسے منع کر دیتی ہوں' وہ اور ہمایوں باہر کھانا کھالیں گے۔''

''نہیں فرو! ایسی کوئی بات نہیں ہے' کب تک میں حقیقت سے نظریں چراؤں گی اور کہاں تک فرار ہوسکوں گی۔ ابھی تو بہت سے امتحانوں سے گزرنا ہے' مجھے عادت ہونی چاہیے فائٹ کرنے کی۔ تم ہمایوں اور فیصل سے کچھ نہیں کہو گی میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کسی کا پروگرام تباہ ہو۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

غسل خانے میں میری سوچ اسی نکتے کے گرد گھوم رہی تھی۔

''ایسا کب تک چلے گا۔ میری وجہ سے سب ہی اپ سیٹ رہتے ہیں اور میں بھی صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ باقی سب بھی صرف میرے بارے میں سوچیں۔ میں نہیں جانتی کہ کس حد تک کامیاب ہوں گی' لیکن اب یہ کوشش ضرور کروں گی کہ اپنے دکھ اور غم اپنے تک محدود رکھوں' ساری دنیا میرے ساتھ شامل نہیں ہو سکتی' بلکہ زیادہ لوگ غم بٹانے کے بجائے تماشا ہی دیکھتے ہیں۔''

لیونگ روم میں داخل ہوئی تو میری ذہنی کیفیت خاصی بہتر ہو چکی تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر فیصل کی نگاہیں مجھ پر ہی ٹک گئیں اور ہونٹوں پر ستائشی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اسے نظر انداز کر کے میں نیلوفر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ تینوں کسی اشتہار کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ میں غیر محسوس انداز میں فیصل کا جائزہ لے کر اس کا اور تیمور کا موازنہ کرنے لگی۔

آفس میں فیصل خاصی نفاست سے تیار ہو کر آیا کرتا تھا' سوٹ ٹائی سمیت' اطالوی چمڑے کے جوتے' موز لگے بال اور پرفیوم کی مہک کے ساتھ۔ ظاہر ہے وہ کمپنی کا کری ایٹو ڈائریکٹر تھا اور اس کے عہدے کا تقاضا تھا کہ وہ کم عمر' کھلنڈرا لڑکا نظر آنے کے بجائے ایک ذمہ دار ایگزیکٹو دکھائی دے' لیکن اس وقت وہ ان تکلفات سے آزاد تھا۔ اُڑے ہوئے نیلے رنگ کی امریکی جینز پر آدھے بازوؤں والی شرٹ' نائکی کے جوگرز اور قدرے بکھرے بالوں میں وہ خاصا مختلف اور جاذب نظر لگ رہا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میری نگاہیں بار بار اس کے مضبوط بازوؤں کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

کبھی ایسے ہی مضبوط بازو تیمور کے بھی ہوا کرتے تھے' اس میں فیصل سے کہیں زیادہ کشش تھی۔ کاش اس پر یہ سب نہ بیتتا۔

''سجیلہ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' فیصل نے اچانک مجھے مخاطب کیا۔

میں جو ان تینوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بے خبر اس کی ٹی شرٹ کی آدھی آستینوں سے نظر آنے والے بازوؤں کی طرف متوجہ تھی۔ ایک دم گڑبڑا گئی' یوں لگا جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''آئی ایم سوری' میں اس بارے میں رائے نہیں دے سکوں گی۔'' بالآخر میں نے جلدی سے کہا۔

حالانکہ میں جانتی ہی نہیں تھی کہ وہ کس بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔

''میں نے تمہارے بنائے ہوئے پرانے اشتہار دیکھے ہیں' تم میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ مجھے لگتا ہے تم اس ٹیلنٹ کو ضائع کر رہی ہو۔'' وہ بولا۔

''مجھے دلچسپی نہیں رہی۔''

''خیر' ایک چیز میں ہمیشہ سبھی کی دلچسپی ہوا کرتی ہے چلو آئس کریم کھانے چلیں۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں یہ اچھی بات کی۔'' نیلوفر نے خوش ہو کر چٹکی بجائی اور پھر ایک دم شرمندہ ہو کر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

''مجھے اپنے دکھ اور غم اپنے اندر دفن کرنے ہیں' مجھے کسی کی ترس کھاتی نظروں کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہوں' آئس کریم مجھے بھی بہت پسند ہے۔'' میں نے نیلوفر کی شرمندگی مٹانے کی غرض سے کہا۔

اس نے سکون کا سانس لیا اور ہنس دی۔

''آئس کریم تجو کی بہت بڑی کمزوری ہے۔''

آئس کریم پارلر کے باہر کار پارک کر کے ہم نے وہیں کار میں ہی آئس کریم منگوانے کا فیصلہ کیا۔ پائن ایپل ڈیلائٹ کھاتے ہوئے مجھے وہ تمام دن یاد آ رہے تھے' جب میں اور تیمور

یہاں آئے تھے اور جب تیمور کا خیال آتا تھا تو میرے گرد موجود جیتے جاگتے سبھی لوگ دھند میں لپٹ جاتے تھے' بس ہر طرف وہی نظر آنے لگتا تھا' اس کا ہنسنا' بولنا' ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چلنا۔

مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور میری آئس کریم پگھلنے لگی۔ بلاوجہ کپ میں چمچ ہلاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ یہاں کتنی مرتبہ تیمور کے ساتھ آنا ہوا تھا اور یہیں ایچ کریم بخش سے اس نے مجھے نیٹ کا سوٹ بھی خرید کر دیا تھا جو شاید ابھی تک اس کے گھر میں وارڈ روب میں کسی ہینگر پر لٹکا ہوا ہو گا۔ کتنی یادیں تھیں اس گھر کی' خوشی کی بھی' دکھ کی بھی' راحت کی بھی' تکلیف و اذیت کی بھی۔

جب بل دینے کا وقت آیا تو میں نے اپنے کپ کی طرف دیکھا۔ آئس کریم مکمل طور پر پگھل چکی تھی۔ باقی سب کی جانب دیکھا تو وہ اپنی اپنی آئس کریم ختم کر کے اب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ فیصل ویٹر کو بل کی رقم ادا کر رہا تھا۔ میں نے چپکے سے اپنا کپ کھلے شیشے سے باہر پھینک دیا۔

☆======☆======☆

اور رات کھانا کھانے کے بعد جب نیلوفر نے فیصل کو مخاطب کیا تو ساتھ کچن میں فریج سے پانی نکالتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے۔

''تم تجو کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟''

نیلوفر کا سوال اچانک بھی تھا اور بے وقت بھی۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی تو میں ڈائننگ روم سے اُٹھ کر کچن میں آئی تھی۔ جگ میں پانی ختم ہو گیا تھا اور نیلوفر کے منع کرنے کے باوجود بھی میں خود ہی کچن میں چلی آئی تھی۔

''کیا فرق پڑتا ہے' پانی ہی تو پینا ہے۔'' میں اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے ملازمہ کوارٹر میں چلی گئی ہو گی۔ ایک منٹ میں غائب ہو جاتی ہے یہ۔ ابھی برتن بھی اُٹھانے تھے اور محترمہ گم ہو گئیں۔''

''میں بلا لاتی ہوں۔''

اور ابھی میں فریج کا دروازہ کھول کر بمشکل پانی کی بوتل نکال پائی تھی کہ نیلوفر نے فیصل سے یہ سوال پوچھ لیا۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل ہاتھ میں لیے فریج کا دروازہ کھولے میں ساکت کھڑی تھی۔

''میں' مجھے تجو بہت پسند ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''کس لحاظ سے؟'' حسب عادت نیلوفر نے مزید کریدا۔

''صحیح پوچھو تو پہلی مرتبہ مجھے اس کی خوبصورتی نے متوجہ کیا تھا۔ ظاہر ہے میں اتنا بدذوق تو ہوں نہیں کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو نظر انداز کر دوں' لیکن خوبصورتی کے احساس کے بعد ایک اور خیال نے مجھے جکڑ لیا۔ اس کی شکل دیکھی بھالی سی محسوس ہوئی۔ ذرا سوچا تو یہ خیال آ گیا کہ اس کی مشابہت کس سے ہے۔''

نیلوفر کی دلچسپی عروج پر تھی۔ ''کس سے ہے؟''

چند لمحوں کے بعد فیصل کی آواز اُبھری۔

''ہمارے ہی خاندان کی ایک خاتون ہیں جو اب فوت ہو چکی ہیں۔ بابا جان کے پورشن میں لگی ان کی تصویر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا۔ ان خاتون کے بارے میں ہمارے خاندان میں بہت فیری ٹیلز جیسی باتیں مشہور ہیں اور ہم نے ان سے خاصی انسپائریشن بھی لی ہے۔''

''مثلاً؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''ان کی پورٹریٹ فوٹوگراف بتاتی ہے کہ وہ انتہائی حسین تھیں اور کہنے والے کہتے ہیں کہ ہر لحاظ سے ماڈل تھیں۔ اس وقت خاندان کی پہلی تعلیم یافتہ خاتون جو کانونٹ اور کنیرڈ سے ہوتے ہوئے ایم اے انگریزی کرنے جی سی تک پہنچیں' بہترین طالبہ اور بہترین ڈبیٹر تھیں۔ پیانو اور ستار بجانے کے علاوہ انگریزی میں نظمیں بھی لکھتی تھیں۔ گھر کے کاموں میں سے وہ کون سا کام تھا جو انہیں نہ آتا ہو۔

پھر یوں ہوا کہ ہمارے بابا جان نے خاندان کی روایتوں کے مطابق ان کا رشتہ طے کر دیا۔ اونچی مضبوط حویلی وسیع جائیداد' بینک بیلنس رکھنے والا وہ شخص جو ان کے لیے قطعاً مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے بابا جان کے سامنے بغاوت کر دی اور اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ بابا جان اور خاندان کے سبھی افراد نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ برسوں گزر گئے ایک دن اچانک خبر آئی کہ وہ فوت ہو گئی ہیں۔''

میرے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔

''ممی!'' میں نے زیرِ لب کہا۔

''جب ہم بڑے ہوئے اور ہمیں اس داستان کی خبر ہوئی' ہم نے ان کا ستار اور پیانو دیکھا' ان کی تصویریں نظروں سے گزریں تو فیری ٹیلز جنم لینے لگیں۔ نوجوانی میں یہ کہانی ہمارے لیے بہت تھرلنگ تھی۔'' فیصل کی بات جاری تھی۔

''اور وہ خاتون تمہاری کیا لگتی ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔'' نیلوفر نے بھرپور جوش سے پوچھا۔ غالباً اسے بھی واقعات کی مماثلت سے اندازہ ہو گیا تھا۔

''وہ خاتون میری پھوپھو ہیں اور ان کا نام گلِ رعنا تھا۔''

پانی کی بوتل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

کچن کے ہنی کلر ڈو ینائل ٹائلز پر شیشے کی بوتل کی کرچیاں پھیل گئی تھیں۔ میرا ذہن فیصل کی بات میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

''وہ خاتون میری پھوپھو ہیں اور ان کا نام گلِ رعنا تھا۔''

میں نے ممی کی صرف تصویریں دیکھی تھیں' نہ ان کے منہ سے لوریاں سنی تھیں' نہ انہوں نے مجھے تھپک کر سلایا تھا' نہ اپنے ہاتھ سے کبھی کھانا کھلایا تھا۔ نہ میرے بال سنوارے تھے۔ میرے حوالے سے نہ ان کی کوئی تمنا تھی' نہ خواہش۔ نبیلہ کے بعد انہیں ایک بیٹا چاہیے تھا۔

لیکن ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا تھا؟ میں نے زندگی میں ہر پل انہیں یاد کیا تھا۔ اور ان سے بے تحاشا محبت کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہوتیں تو ان سے بڑھ کر کوئی فرد بھی محبت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے متعلق میرے احساسات بہت نازک تھے۔

فیصل کی بات میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ چکرائے سر کو سنبھالتے ہوئے میں نے دیوار کا سہارا لیا۔ اسی لمحے فیصل' نیلوفر اور ہمایوں گھبرائے ہوئے کچن میں داخل ہوئے۔

''سجو! کیا ہوا؟ ٹھیک تو ہو؟'' نیلوفر نے تشویش سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم اندر چل کر بیٹھو' میں پانی لاتی ہوں۔''

ہم چاروں خاموشی سے لیونگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے فیصل کو

مخاطب کیا۔

''تمہارے گھر والوں نے ممی کو بہت دکھ دیئے اتنے کہ ان کی جان لے لی۔ میں پیدا ہوتے ساتھ ہی ان کے سائے سے محروم ہو گئی۔ پاپا تنہا ہو گئے۔''

''جب یہ واقعہ ہوا اس وقت میں بہت ہی چھوٹا تھا۔ ہاں میں تمہیں ان لوگوں سے ملوا سکتا ہوں جن پر یہ الزام عاید کیا جا سکتا ہے۔'' وہ بولا۔ اسے کچھ حیرت کچھ خوشی تھی۔ گمان تو بہرحال گمان ہی ہوتا ہے۔ حقیقت میں ڈھلے تو چہرے پر کوئی کیفیت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس نے بہت جلدی اپنی حیرت پر قابو پا لیا تھا۔

میں نے منہ پھیر لیا۔

''اور یہ بھی نہیں کہ تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو۔'' اس نے مزید کہا۔

''زندگی پیچھے پلٹنے کا نہیں' آگے بڑھنے کا نام ہے۔'' وہ بولا۔

''ہم دونوں بہنیں اپنے پاپا کے ساتھ بہت خوش ہیں۔ ہمیں کسی تلافی وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اس سے کہا اور پھر نیلوفر کو مخاطب کیا۔ ''فرو! میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

نیلوفر نے ہمایوں سے کار کی چابی لی اور میرے ساتھ باہر نکل آئی۔

''سجو! کتنی حیران کن بات ہے۔ فیصل' ہمایوں کا بہت پرانا دوست ہے۔ دونوں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ ہمایوں کے حوالے سے میرا بھی فیصل سے رابطہ رہا ہے۔ دوسری طرف ہم دونوں بہترین دوست ہیں۔ اس کے باوجود برسوں بیت گئے اور یہ بات آج معلوم ہوئی۔'' نیلوفر نے ڈیفنس روڈ پر مڑتے ہوئے کہا۔

''اب بھی علم نہ ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ فرو! چھوٹی چھوٹی بے ضرر باتیں' بھی میرے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہیں۔ مجھ میں اچھا برا کچھ بھی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اب۔ بس جیسی زندگی چل رہی ہے وہی ٹھیک ہے۔ ذرا سی تبدیلی بھی میرے اعصاب توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ فیصل کون ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق کوئی رشتہ نہیں ہے۔ آفس میں ایک ورکنگ ریلیشن شپ (Working relationship) ہے وہی کافی ہے۔ اس بارے میں' میں پاپا اور بیلا سے ذکر نہیں کروں گی۔ تم بھی مت کرنا۔ یہ لوگ میری ماں کے قاتل ہیں اور جو رشتے کل انہوں نے توڑے تھے۔ انہیں اب میں جوڑنا پسند نہیں کروں گی۔ نہ میں' نہ بیلا' نہ پاپا۔''

''اس میں قصور فیصل کا تو نہیں تھا۔'' نیلوفر نے کہا۔

''نہ ہو' میں بھی کون سا اسے پھانسی پر چڑھانے لگی ہوں۔ بس میں اپنی زندگی میں تبدیلی نہیں چاہتی۔ اس سے جتنا تعلق ہے' اتنا ہی کافی ہے۔''

پاپا اور نبیلہ ابھی تک شادی سے واپس نہیں آئے تھے۔ میں اور نیلوفر لان میں جا بیٹھے۔ ممکن ہے تمہارے نانا اب پشیمان ہوں۔''

''ان کی پشیمانی سے مجھے میری ماں نہیں ملے گی۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں تو شاید نہ ملے لیکن انہیں ممکن ہے کوئی سکون مل جائے۔ تم میں اور تمہاری ممی کی صورت میں کافی مشابہت ہے۔ تم ان کا رنج اور ملال کم کر سکتی ہو۔ مجھے اتنا علم ہے کہ فیصل کی دادی اماں برسوں پہلے فوت ہو چکی ہیں لیکن اس کے دادا جنہیں وہ بابا جان کہتا ہے اور جو تمہارے نانا ہیں۔ وہ ابھی حیات ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے ناں کہ اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی موت نے انہیں کسی ملال میں مبتلا کیا ہو۔'' نیلوفر نے کہا۔

''ملال کیسا؟ انہوں نے شادی کے وقت ہی ممی سے کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے لیے مر گئی ہیں۔ اپنے ماں باپ کی نگاہ میں وہ معتوب ہی تھیں اور اب اگر آخری عمر میں ان کے باپ کو کوئی ملال ہے بھی تو میں اپنی ماں کے اس قاتل کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتی۔ انہی لوگوں کی باتیں ممی کو گھن بن کر لگ گئیں۔ دیمک کی طرح چاٹ گئیں۔ انہی کی وجہ سے میں اپنی ماں کی لوریوں سے بھی محروم رہی۔ ہم بہنوں کے لیے نہ پہلے یہ رشتے تھے اور نہ اب ہیں۔ جو میری ممی کی وفات کا سن کر جنازے میں بھی نہیں آئے۔ ان کے لیے میرے دل میں کیا محبت ہو سکتی ہے۔''

''اگر وہ تم سے یا بیلا سے ملنا چاہیں تو کیا تم انکار کر دو گی؟''

''وہ کس حیثیت میں مجھ سے ملنا چاہیں گے؟ اور میں ان سے کس حیثیت سے ملوں گی' جو باب ختم ہو چکا' بند ہو چکا اسے کھولنے اور دوبارہ شروع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہ اتنی اہم بات بھی نہیں ہے کہ اس پر سر کھپایا جائے۔ جب یہ طے ہے کہ ہمارا ان سے کوئی لینا دینا نہیں تو پھر اس بارے میں سوچنے کا کیا فائدہ؟'' میں نے کہا۔

لیکن میں نے غلط کہا تھا۔ بستر پر لیٹ کر میں اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔ پاپا اور نبیلہ سے میں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں شادی سے لوٹے تو نیلوفر بھی اپنے گھر چلی

گئی۔ نبیلہ نے فنکشن کے کچھ قصے سنائے اور پھر سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

اور اب اپنے بستر پر لیٹی میں سوچ رہی تھی کہ اگر پاپا اور بیلا کو اس بارے میں علم ہوا تو ان کا کیا ردِعمل ہوگا۔

''پاپا کے بہت سے زخم پھر سے ہرے ہو جائیں گے اور بیلا کو وہ ہر چیز ناپسند ہے جو پاپا یا مجھے دکھ میں مبتلا کرے اور ہر ایسی چیز پسند ہے جس سے ہم خوش ہوں۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ جب ہم ان رشتوں کو قبول نہیں کریں گے تو وہ بھی نہیں کریں گی۔

لیکن یہ برا ہوا۔ فیصل کو معلوم ہو گیا کہ اس کی بے خبری میں' میں نے اس کی تمام تر گفتگو سن لی یوں جہاں ممی کے متعلق معلوم ہوا وہیں میں اس کے اپنے بارے میں خیالات اور اس کی پسندیدگی سے بھی واقف ہو گئی۔ کہیں یہ سوچ کر اب جب مجھ تک اس کی پسندیدگی پہنچ ہی چکی ہے' وہ اس بارے میں مزید بے باک نہ ہو جائے۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ تیمور کے بارے میں جانتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں جانتا تو ممکن ہے قدم آگے بڑھائے۔ میں اتنی بے خبر بھی نہیں کہ اس کا لہجہ' اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ اور اس کا انداز مجھے یہ نہ بتا سکے کہ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میری محبت صرف تیمور کے لیے ہے۔ پاپا نے بتایا کہ اس نے رات کا کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ بہت مشکلوں سے اور زبردستی کھانا کھلا کر میڈیسن دی۔ یا اللہ اسے سکون دے۔ اسے زندگی نہیں مل سکتی تو اس کے آخری دن اتنے تکلیف دہ نہ بنا۔

میں کیا کروں۔ وہ مجھے چھوڑنا چاہتا ہے۔ اس طرح اسے سکون آ جائے گا۔ وہ کیوں نہیں سوچتا کہ میں اسی طرح خوش ہوں۔ یہ رشتہ چاہے بے معنی ہو گیا ہے لیکن میرے لیے یہی اہم ہے کہ میں اور وہ اب بھی ایک رشتے کی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں یا پھر میں بہت خود غرض ہو گئی ہوں کہ بلاوجہ ایک بے معنی رشتہ قائم رکھنے پر مُصر ہوں جس کے باعث وہ بھی اذیت میں مبتلا ہے۔

پتا نہیں کیا ہے۔ میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ بس میرے جذبات ہیں اور میرے جذبات کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے۔ میں اب بھی اس بے معنی رشتے کو قائم رکھنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ سب کے نزدیک یہ بے وقوفی اور جذباتی حماقت ہے لیکن یہاں میں اپنے

جذبوں سے ہار جاتی ہوں۔ یقیناً میں خودغرض ہوں کہ اسے یہ خوشی نہیں دے رہی پر کبھی تو انسان خودغرض ہو ہی جاتا ہے۔ صرف اپنے اور اپنے جذبوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ دکھ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔''

صبح ناشتے پر بھی میں انہی خیالوں میں گم تھی۔

''چائے کی پیالی سے کھیلنا بند کرو اور جلدی سلائس کھاؤ۔ سارا ناشتا ٹھنڈا کر دیا ہے تم نے۔'' نبیلہ نے مجھے جھڑکا۔

چائے کا ایک گھونٹ لے کر میں پھر اپنی سوچوں میں کھوگئی۔

''سجو آپ کو آفس بھی جانا ہے۔ جلدی ناشتا کریں۔'' پاپا نے بھی ہدایت دی۔

ناشتے کا ذرا سا بھی موڈ نہیں تھا۔ میں نے پلیٹ اور پیالی اپنے سامنے سے سرکا دی اور پاپا سے مخاطب ہوئی۔

''آپ نے ممی کے فوت ہونے کی اطلاع ان کے اور اپنے گھر والوں کو دی تھی ناں؟''

پاپا نے قدرے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ ''اس بات کا یہاں کیا ذکر۔ آپ ناشتا کریں اس کے بغیر آفس نہیں جانا۔''

''پلیز پاپا بتائیں ناں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''ہاں دی تھی۔'' انہوں نے کہا۔

''اور کوئی بھی نہیں آیا تھا؟''

''نہیں۔''

''ممی کے پیرنٹس (والدین) کہاں رہتے تھے؟''

''عین اسی جگہ جہاں آج کل حفیظ سنٹر بنا ہوا ہے۔'' پاپا نے بتایا۔

''اتنا بڑا گھر تھا ان کا پاپا؟ ہم کتنی مرتبہ وہاں سے گزرے۔ جب ابھی پلازہ نہیں بنا تھا۔ آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔'' نبیلہ نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا۔'' وہ بولے۔

''ہاں' فرق تو کچھ نہیں پڑتا۔ جب ممی نہیں رہیں تو ان کے گھر والوں سے کیا لینا دینا۔'' نبیلہ نے تبصرہ کیا۔

''اور پاپا آپ کے گھر والے کہاں رہتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''مغل پورہ۔''

''آپ پھر کبھی وہاں گئے؟''

''ہاں۔ کبھی کبھار چلا جاتا ہوں۔ دور سے دیکھ کر لوٹ آتا ہوں۔''

نبیلہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''پاپا آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ آپ کو یاد آتے ہیں وہ لوگ؟''

''جب ایک خون ہو تو کبھی دل مچلتا تو ضرور ہے لیکن میں ان کے قریب نہیں جانا چاہتا ورنہ شاید آپ دونوں کی زندگی کا سکون درہم برہم ہو جائے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ ہماری بودوباش ان سے بہتر اور جدا ہے۔ بڑے بھائی کی کافی ساری اولاد ہے۔ بہنوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ بھی وہیں قریب ہی رہتی ہیں۔ ان کے گھر بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے گھر کو میں چھوڑ کر نکلا تھا۔ منجھلا بھائی خود جاپان چلا گیا اور وہاں دوسری شادی کر لی جبکہ یہاں بھی ایک غیر تعلیم یافتہ بیوی اور کم تعلیم یافتہ بچے موجود ہیں۔ اس خاندان کے بیشتر لڑکے آوارہ مزاج اور لوفر ہیں۔ گھنٹوں چھتوں پر پتنگیں اڑاتے گزار دیتے ہیں بہنوں کو مارنا اور ماں سے پیسے بٹور کر باہر اُڑا دینا ان کا معمول ہے۔ خاندان کے ہر گھر کے ہر مسئلے میں ٹانگ اڑانا ان لڑکوں کا فرض ہے۔ کسی گھر کی بیٹی کی شادی اس کے والدین طے کر رہے ہیں۔ یہ بیچ میں کود پڑتے ہیں اور والدین کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنی بیٹی کی شادی فلاں جگہ طے کرنے کی بجائے فلاں جگہ طے کریں۔ کوئی لڑکا میٹرک' ایف اے سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ بری صحبت' گندے حلیے اور غلیظ زبان ان کی شناخت ہے۔ محلے کے شریفوں کا جینا بھی دوبھر ہے۔ اب ایسے میں اگر ربط ضبط بڑھائیں تو یہ خود کو خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا کر دینے والی بات ہوگی۔''

''تو پاپا آپ نے ان کی پوری خبر رکھی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں' میں اس سے باز نہیں رہ سکتا۔''

''اور آپ نے ممی کے گھر والوں کی بھی خبر رکھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ ویسے وہ شہر کے معزز اور نمایاں لوگ ہیں' اس لیے کوئی نہ کوئی خبر ملتی ہی رہتی ہے۔''

"گویا پاپا کسی بھی طرف سے بالکل بے خبر نہیں ہیں۔" میں نے سوچا پھر انہیں مخاطب کیا۔ "آپ کا کیا خیال ہے پاپا ان لوگوں میں سے کسی نے ہماری خبر رکھی ہوگی؟ کسی کو معلوم ہوگا کہ ہم کہاں اور کس حال میں ہیں۔"

"بہت مشکل ہے۔ میری ملاقات ایک مرتبہ بھی آپ کی ممی کے بھائیوں سے نہیں ہو سکی تھی اس لیے انہیں علم نہیں ہے کہ میرا اور ان کا رشتہ ہے' ہاں میری معلومات کے مطابق آپ کے نانا حیات ہیں لیکن وہ بھی گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ بہت ہی کم کہیں دکھائی دیتے ہیں۔"

"پاپا شہر کے نمایاں لوگ بہت باقاعدگی سے جم خانہ آیا کرتے ہیں۔ آپ کی کسی سے ملاقات تو ہوئی ہوگی۔" نبیلہ نے پوچھا۔

"ہاں ہوتی رہتی ہے لیکن ہم میں کسی قسم کی دوستی نہیں ہے۔ یوں بھی میں باقاعدگی سے جم خانہ نہیں جاتا۔ ممکن ہے ان کی جانب سے پہچان کی کوئی صورت بنتی۔ اگر انہوں نے مجھے کبھی دیکھا ہوتا یا یہ ہی ان کے علم میں ہوتا کہ میں نے سول سروس کر لیا تھا۔ جب دو مرتبہ میں ان کے گھر گیا تھا تب ابھی میں کچھ نہیں بنا تھا۔ دیکھا جائے تو طالب علمی کا زمانہ تھا کیونکہ رزلٹ آؤٹ نہیں ہوا تھا۔ پھر آپ کی ممی کی ڈیتھ پر بھی میں نے انہیں اطلاع کے ساتھ صرف گھر کا ایڈریس بھجوایا تھا۔ ان دنوں ہم کراچی میں تھے۔ اس اطلاع کے باوجود بھی ان میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔"

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

"نہ وہ ہمارے لیے کچھ ہیں اور نہ ہم ان کے لیے۔" میں نے سوچا اور آفس کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم کہاں چل دیں؟ ناشتا کیوں نہیں کیا؟" نبیلہ نے کہا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

اور دل چاہتا بھی کیسے؟ مجھے یقین تھا کہ آج بھی تیمور نے ناشتے سے انکار کیا ہوگا۔

"بہت سن لی تمہارے دل کی۔ اب اس کی ایک نہیں چلے گی۔ خودکشی کرنا چاہتی ہو تو ایک ہی مرتبہ کر لو۔ پستول اور گولیاں میں لا دیتی ہوں۔" نبیلہ نے مجھے گھورا اور زبردستی واپس بٹھا دیا۔

میں فیصل کے آفس میں داخل ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہیلو کزن' کیسی ہو؟"

"پلیز فیصل' جو رشتے ٹوٹ گئے ہیں' انہیں مت جوڑو۔" میرے ماتھے پر لکیریں اُبھر آئیں۔

"جو رشتے اللہ میاں نے بنائے ہیں' انہیں میں یا تم کیسے توڑ سکتے ہیں۔"

میں کمپیوٹر میں فلاپی ڈسک ڈالتے ڈالتے رک گئی۔

"ہمارے آپس کے رشتے ایک انتہائی ناگوار حقیقت ہے اور انہیں توڑنے کا آغاز تم ہی لوگوں کی طرف سے ہوا تھا۔ میں اس بارے میں نہ کچھ کہنا چاہتی ہوں اور نہ سننا چاہتی ہوں۔ پلیز تم بھی مجھے اتنا پریشان مت کرو کہ یہاں آ کر سکون کے جو چند لمحے میں خود تراش لیتی ہوں وہ بھی نہ رہیں۔"

چند لمحے وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اپنے سامنے رکھے اسٹوری بورڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں فائل اوپن کر چکی تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم نے ہماری کمپنی کا بسکٹ کا وہ اشتہار تو دیکھا ہی ہوگا جو آج کل ٹی۔ وی پر چل رہا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آج تمہیں وہی بنانے کی پریکٹس کرنی ہے۔"

"مگر وہ تو کافی مشکل لگ رہا ہے۔" میں نے تامل سے کہا۔

"تو میں یہاں کس لیے ہوں۔ اور پھر تکنیک تو تم نے سیکھ لی ہے۔ اب کون سی مشکل باقی رہ گئی؟"

میں اس سے کہتے کہتے رک گئی کہ اپنے اوپر مجھے ذرا بھر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ جب سے مجھے احساس ہوا تھا کہ میں ایک وعدہ تک نہیں نبھا سکی۔ تب سے میرے اندر کچھ مر گیا تھا' خود بخود ختم ہو گیا تھا۔ کتنے اعتماد سے قدم بڑھائے تھے۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ راہ کتنی پُرخار ہے اور سورج جیسے سوا نیزے پر اُتر آیا ہوا ہے۔ سب کی مرضی کے خلاف' کسی کی پروا کیے بغیر میں نے یہ فیصلہ کیا ہی اس لیے تھا کیونکہ مجھے یقین تھا خود پر' اپنی محبت پر۔

لیکن ہوا کیا تھا۔ اتنے گھاؤ لگے تھے روح پر کہ سب عزم' سارا حوصلہ کہیں کھو گیا تھا۔

میں خواب بُنتی رہ گئی اور حقیقت دور کھڑی مجھ پر ہنستی رہی' میرا تمسخر اُڑاتی رہی۔

''نجیلہ شاہ۔''

فیصل نے مجھے چونکا دیا۔ میں پھر سب کچھ فراموش کر کے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئی تھی۔ احساسِ شرمندگی نے مجھے گھیر لیا۔ نہ جانے کیوں ایسا ہوتا تھا کہ حال دھند میں لپٹ جاتا تھا اور ماضی میرے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔

میں جلدی سے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ مجھے ہدایات دیتا رہا اور میں ان کے مطابق کام کرتی رہی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے کام میں بھی مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں ہمایوں کے آفس میں ہوں گا۔ کوئی پرابلم ہو تو پوچھ لینا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ تکنیک مجھے آتی تھی' یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں تھا' اگر میں تھوڑی سی توجہ سے کرتی تو' مسئلہ یہ تھا کہ میں مکمل طور پر توجہ نہیں دے پاتی تھی۔

آفس کا دروازہ کھلا اور فیصل چلتا ہوا میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ ماؤس کو حرکت دیتے میرے ہاتھ رک گئے۔

''ایسے ہی تیمور بھی دیکھا کرتا تھا۔ جب میں اس کے آرٹیکل ٹائپ کرتی تھی۔'' میں نے سوچا۔

بغیر کچھ کہے وہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا اور اپنے کلائنٹس سے فون پر بات کرنے لگا۔

چار دن بیت گئے تھے اور اس نے پھر اپنے اور میرے گھرانے کے درمیان رشتہ داری نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ گھر میں البتہ بات دوسری تھی۔ نبیلہ شادی کے صرف اُن فنکشنز میں گئی تھی۔ جن میں جانا ناگزیر تھا۔ وہ کہتی نہیں تھی لیکن میں اس کے چہرے پر لکھی ان کہی باتیں پڑھ سکتی تھی۔

رات کے کھانے کے سلسلے میں وہ کچن میں مصروف تھی اور میں بھی قریب ہی ایک کیبنٹ پر چڑھی بیٹھی تھی۔

''اب تم امتحان کی تیاری کر رہی ہو تو گھر کے یہ کام ملازمہ کے سپرد کر دو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

وہ مسکرا دی۔ ''تمہیں تو پتا ہے' مجھے ملازموں پر بالکل بھروسا نہیں ہے اور پھر ہم افراد ہی کتنے ہیں۔ تین بندوں کا کھانا پکنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔''

''تم ہی نرالی ہو' ساری دنیا ملازموں پر بھروسا کرتی ہے۔ فضول میں کیوں اپنی جان پر ظلم کرتی ہو۔ یا تو ہم افورڈ نہ کر سکتے ہوں' جب کر سکتے ہیں تو گرمی' سردی حبس میں خود کو خوار کرنے کا فائدہ؟'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں نہیں کہتی' یہ پاپا کہتے ہیں کہ ممی کی شکل صورت تم نے لے لی اور عادتیں اور عقل میرے حصے میں آ گئی۔'' وہ ہنسی۔

''تو کیا میں بے عقل ہوں؟'' میں نے اسے گھورا۔

''اس بارے میں میرے زریں خیالات سے تو تم واقف ہی ہو۔ اَب میں کیا کہوں۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''خیر میرا کیا جاتا ہے۔ اپنی جان خود مصیبت میں مبتلا کی ہوئی ہے۔ میں تو ویسے بھی پکی پکائی کھا لیتی ہوں۔''

''پاپا کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے بتایا پھر قدرے توقف سے کہا۔ ''بیلا شادی پر کسی نے کچھ کہا تو ہو گا۔''

اس کے پریشر ککر میں پیاز ڈالتے ہوئے ہاتھ لمحہ بھر کو وہیں رک گئے۔ پھر شانے اچکا کر بولی۔

''تو ہیل ود دیم۔ میں نہیں پروا کرتی' نہ ایسی باتیں سنتی ہوں۔''

''یعنی کسی نے کچھ کہا ضرور ہے۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو ذرا سی گرمی سے گوری سے سرخ رنگت اختیار کر لیتا تھا۔

''پتا نہیں کسی نے کچھ کہا یا نہیں' میں نے کچھ نہیں سنا۔''

''کان بند کر لیے جیسے کہ تم عموماً کر لیا کرتی ہو۔'' میں چڑ کر بولی۔

''جب تم خودترسی اور خود اذیتی میں مبتلا ہونا چاہتی ہو تو میں خود سے کچھ گھڑ کر سنا دیتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''جب تم مجھ سے کچھ چھپاتی ہو تو مجھے تم میں اور باہر چلتے پھرتے اُن سینکڑوں' ہزاروں

لوگوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا جن سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' میں نے روٹھتے ہوئے کہا۔

''تم اسی لیے شادی پر نہیں گئی تھیں ناں کہ تم یہ سب باتیں نہیں سننا چاہتی تھیں یہ باتیں تمہارے لیے ناقابلِ برداشت تھیں پھر اب سب کچھ میرے منہ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہو؟ تم خود بھی جانتی ہو کہ کس نے کیا کہا ہوگا۔ تم میں سننے کا حوصلہ تھا تو خود جا کر سن لیتیں مجھ میں کہنے کا حوصلہ نہیں ہے۔'' وہ منہ پھیر کر بلاوجہ برتنوں کی ترتیب بدلنے لگی۔

اسی لمحے کال بیل بجی۔ میں کیبنیٹ سے نیچے اتر آئی۔

''شاید فرو اور ہمایوں ہوں۔'' میں نے کہا اور باہر نکل آئی۔

پاپا گیٹ کھولنے کے لیے اُٹھ ہی رہے تھے۔

''پاپا میں دیکھ لیتی ہوں' فرو اور ہمایوں ہوں گے۔ فرو نے کہا تھا کہ وہ آنے کی کوشش کرے گی۔''

وہ واپس بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ میں باہر نکل آئی۔

وہاں اجنبی چہرے تھے' تین خواتین اور تین ادھیڑ عمر مرد۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر ان سے پیچھے میری نگاہ فیصل پر پڑی۔ ایک لمحے میں میری سمجھ میں آ گیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ ٹوٹے رشتے جوڑنے چلا آیا تھا۔

''آپ رعنا کی بیٹی ہیں۔'' ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے کہا۔ یہ سوال نہیں تھا' کوئی جواب بھی نہیں تھا۔ بس حیرت تھی' خوشی تھی۔ ان کی آواز اور لہجے میں جذبات کی حدت تھی۔

میری نگاہیں بے اختیار فیصل کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔

اپنے پیچھے کھلا دروازہ بند کر کے میں اس سے مخاطب ہوئی' میری آواز بہت دھیمی تھی۔
میں نہیں چاہتی تھی کہ پاپا اور نبیلہ کو ان کی آمد کی خبر ہو۔ ایک دم میں خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اور اپنے خوف کا سبب بھی اچانک مجھ پر آشکار ہو گیا تھا۔

یہ وہ احساس تھا جسے میں خود سے بھی چھپانا چاہتی تھی اور اب تک بہت کامیابی سے چھپایا بھی تھا۔

مجھے لگنے لگا تھا کہ فیصل مجھ سے تیمور اور اس کی یادوں کو چھین کر میرے دل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور میں پوری شعوری کوشش کے ساتھ فیصل کو خود سے قریب ہونے سے روکنا چاہتی

تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ٹوٹے رشتے جڑ جائیں اور اس کی قربت کی کوئی راہ نکلے۔ اسی لیے اس بارے میں میں نے خود سے فیصلہ کر لیا تھا۔

''اب یہ رشتے نہیں جڑیں گے۔''

اور اسی لیے میں نے فیصل کو منع کر دیا تھا۔ اپنے اور تیمور کے بیچ میں کسی کو نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ فیصل کی پیش قدمی میرے خوف کی بنیاد تھی۔

''تم کیوں آئے ہو یہاں؟'' میں نے جیسے سرگوشی میں کہا۔

''اس لیے کہ اس بارے میں تنہا تمہارے فیصلے کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہارے باقی گھر والے منع کر دیں' ہم پھر کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔'' وہ بولا۔

''میں جانتی ہوں' وہ بھی منع کر دیں گے۔''

''تو پھر ہمارے مل لینے میں کیا حرج ہے؟ زیادہ سے زیادہ وہ منع کر دیں گے۔''

''میرے پاپا دل کے مریض ہیں' میں نہیں چاہتی کہ تم لوگ ان کے زخم اُدھیڑنے پھر چلے آؤ۔ تم لوگوں کا کیا بگڑے گا۔ تم لوگوں کا تو تب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا جب ممی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اب بھی تم لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ گے اور میرے پاپا......''

میری بات درمیان ہی میں تھی کہ پاپا نے مجھے پکارا۔

''سجو؟''

میں نے مڑ کر بند دروازے کی طرف دیکھا۔

''پلیز' تم لوگ چلے جاؤ۔ جو باب بند ہو گیا اسے بند رہنے دو۔''

''بیٹا! گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں کرتے۔'' ایک خاتون نے محبت اور شفقت سے کہا۔

اسی لمحے دروازہ کھول کر پاپا باہر چلے آئے۔

''سجو بیٹا! بتا تو دیتے ہیں......'' لیکن اسی پل وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

وہ شاید اس لیے باہر نکل آئے تھے کیونکہ میں نے انہیں آنے والوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ پتا ہے فرو ہی آئی ہوتی اور ہم باہر لان میں ہی بیٹھتے لیکن پاپا کو تو اس بارے میں بتانا ضروری تھا ناں۔ ہمیشہ یونہی ہوتا تھا۔ ہم دروازہ کھول کر وہیں سے چلا کر گھر کے اندر سب کو باخبر کر دیتے تھے کہ کون آیا تھا۔

اوراب پاپا باہر چلے آئے تھے۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔

''نہ جانے پاپا پر کیا اثر ہو' شاید ان کے زخم پھر ہرے ہو جائیں۔''

بالآخر پاپا نے کہا۔'' آئیں تشریف لائیں۔''

وہ سب میرے قریب سے گزر کر اندر چلے گئے۔ فیصل جو پیچھے تھا' اسے میں نے آواز دے کر روک لیا۔

''میرے پاپا دل کے مریض ہیں' اگر تم لوگوں کی وجہ سے انہیں کچھ ہوا تو میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔'' کچھ کہے بغیر وہ اندر چلا گیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ دل میں کتنے اندیشوں نے گھر کر لیا تھا۔ پاپا کے حوالے سے نبیلہ کے حوالے سے' اپنے اور تیمور کے حوالے سے۔ مگر یہاں کھڑے رہنے کا بھی کیا فائدہ تھا؟ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی میں اندر چلی آئی۔

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈرائننگ روم سے ہنسنے بولنے کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔

''اللہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم کبھی ملیں گے۔ کتنا عجیب اتفاق ہے یہ ہیں ناں ماموں؟'' نبیلہ کی خوشی سے بھرپور آواز آئی۔ میں وہیں رک گئی۔

''ہاں بیٹا!'' ماموں کی آواز میں خوشی بھی تھی اور آنسوؤں کی نمی بھی۔

''ویسے یہ اتفاق ہرگز نہیں ہے ہم تو خیر وہیں سیٹل تھے' تم لوگوں کو بھی برسوں بیت گئے یہاں رہتے ہوئے' ایک شہر اور ایک جیسی جگہوں پر جانے آنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔ اس لیے اسے اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ آخر اتنے برسوں میں اصولاً کہیں تو سامنا ہونا ہی تھا۔'' فیصل کی آواز آئی۔

وہ سب خوش تھے' اور میں ان کی خوشی پر حیران تھی' انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر میں وہیں سے لان میں نکل آئی اور کرسی پر بیٹھ کر اسی بارے میں سوچنے لگی۔

''چلو وہ لوگ خوش ہو جائیں الگ بات لیکن پاپا اور بیلا کیوں خوش ہیں؟ انہیں احساس نہیں ہے کہ ان ہی لوگوں کی کہی ہوئی باتیں ممی کے لیے روگ بن گئیں اور وہ ہمیں چھوڑ کر بہت دور چلی گئیں۔ بیلا اور پاپا کیسے ان رشتوں کو قبول کر سکتے ہیں' جو ممی کے قاتل ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر میں ستاروں کو تکنے لگی۔ دور چمکتے روشن ستارے بھی زمین کے مکینوں کو تک رہے تھے۔

مجھے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب نبیلہ اور فیصل باہر لان میں چلے آئے۔

''سجو!''

نبیلہ نے پکارا تو میں چونکی۔ فیصل بھی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں سیدھی ہو بیٹھی۔

''تم کیوں یہاں اکیلی بیٹھی ہوئی ہو۔ اُٹھو ماموں بلا رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تمہارے ماموں ہیں اور تم مل چکی ہو۔ میں اس رشتے کو تسلیم ہی نہیں کرتی چاہو تو کھل کر اپنے ان ماموں سے کہہ دو' چاہو تو بہانہ بنا کر معذرت کر دو۔''

''سجو! کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ وہ بہت اچھے ہیں۔ تم ان سے ملو تو۔''

نبیلہ کو میری بات اور لہجے کی تلخی پہ تعجب ہوا۔

''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔'' میں اُٹھ کر اندر جانے لگی۔

''سجو! بات کیا ہے؟'' نبیلہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے روک دیا۔

''مجھ میں اتنا ظرف اور اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ اپنی ماں کے قاتلوں کو قبول کر لوں۔'' میں نے اپنا بازو چھڑایا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' نبیلہ نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کیا ہم دونوں نے قدم قدم پر ممی کو مس نہیں کیا؟ کس لیے؟ اگر ان لوگوں نے ممی کی بات مان لی ہوتی تو وہ کبھی خود سے اتنا بڑا قدم نہ اُٹھاتیں۔ کیا کمی تھی پاپا میں؟ محض اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے ممی کے باپ نے انہیں کتنی بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ وہ پچھتائیں نہیں' لیکن یہ دکھ ان کے ساتھ جونک بن کر چمٹ گیا کہ انہوں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ایک قدم اُٹھایا ہے۔

اور پھر یہی نہیں' جب ممی شادی کے بعد ملنے گئیں تو کتنے تلخ' زہر بھرے الفاظ سے ان کا استقبال کیا جو ممی کی روح میں اتر گئے۔ کتنا دکھ اٹھایا ممی نے اور جب انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ممی ان کے لیے جیتے جی مر گئیں تو اب کیا لینے آئے ہیں یہاں یہ لوگ' جن کے پاس اپنی بیٹی اپنی بہن کو دینے کے لیے ایک دعا تک نہیں تھی' وہ ہمیں کیا دیں گے؟''

''سجو!'' نبیلہ نے حیرت سے کہا۔'' یہ تم کس انداز میں سوچ رہی ہو؟''

''میں نے نہ تمہاری سوچ پر پہرے بٹھائے ہیں بیلا اور نہ عمل پر۔ تم جس طرح چاہے ان سے ملو لیکن پلیز مجھے مجبور مت کرنا کہ میں ان سے ملوں کیونکہ میں ان سے کسی کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں ان لوگوں سے محبت نہیں کر سکتی جو سگی بہن کے جنازے کو کندھا دینے تک نہیں آئے۔''

اندر آ کر میں نے اپنے بیڈروم کا دروازہ بند کر لیا۔ اپنا ذہن ان سوچوں میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے میں نے کتنے کام کرنے کی کوشش کی۔ بستر پر لیٹ کر میگزین پڑھنے کی' کھڑکی سے نظر آتے ستاروں سے باتیں کرنے کی' اپنی الماری ٹھیک کرنے کی' ٹی وی اور پھر فلم دیکھنے کی' لیکن کہیں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں خود اپنی سوچوں کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

پاپا اور نبیلہ کا ردعمل ایسا نہیں تھا جو کسی پریشانی کا باعث بنتا۔ مجھے اس بارے میں بھی فکر تھی کہ ان لوگوں کو دیکھ کر نہ جانے پاپا کیا سوچیں' کہیں تنہائی کا احساس اور پرانے زخم پھر تازہ نہ ہو جائیں۔ کہیں اس دباؤ کی وجہ سے پاپا کو دل کی تکلیف نہ شروع ہو جائے۔

مگر وہ مطمئن تھے۔ یہ بات میرے لیے حیران کن تو تھی لیکن دوسری طرف اطمینان کا باعث بھی تھی کہ پاپا ٹھیک ہیں۔

اب ایک ہی خیال تھا۔ بہت آہستہ آہستہ فیصل میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اور میں اس کی اس پیش قدمی سے خوفزدہ تھی۔ اگر ان سے زیادہ ربط بڑھایا جاتا اور گھروں میں آمدورفت شروع ہو جاتی تو میرے لیے پریشان کن صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی۔ پھر یہی نہیں تھا۔ اب میں سنجیدگی کے ساتھ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرنا چاہتی تھی۔

''یہ حقیقت ہے کہ میرا اور تیمور کا ساتھ چھوٹ چکا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ موت سے بہت قریب ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ میں نہ اسے موت کے پنجوں سے نکال کر لا سکتی تھی اور نہ ہی اس کے ساتھ مر سکتی ہوں۔ جب مجھے زندہ رہنا ہے تو زندگی کے تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے۔ پہلے ہی میں نے پاپا کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ میری ہی وجہ سے انہیں ہارٹ اٹیک بھی ہوا۔ ان کی زندگی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بچا لیا اور نہ کیا ہوتا؟'' سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آ گئی۔

''میں کوشش تو کرتی ہوں کہ ان کے سامنے خوش رہوں پتا نہیں کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔ میں خود سمجھ نہیں پاتی' نہ دل کے درد پر قابو رہتا ہے اور نہ آنسوؤں پر۔ کتنے دکھی ہوتے

ہیں پاپا مجھے اس طرح دیکھ کر۔

لیکن اب مجھے بدلنا ہو گا اور میں ضرور خود کو بدلوں گی۔ زندہ رہنے کے لیے دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے خود اپنے آپ کو مضبوط بناؤں گی۔ کوئی کب تک مجھے تسلی دے سکتا ہے۔ میرے ساتھ رو سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو میں باقاعدہ جاب کروں گی۔ اپنا کیرئیر بنانے پر توجہ دوں گی' ایڈورٹائزنگ کے شعبے سے واقفیت ہے۔ یہی میرے لیے ٹھیک ہے۔ لیکن ہمایوں کی ایجنسی میں نہیں کہیں اور۔ کمپیوٹر بھی سیکھ لیا ہے' پرانا تجربہ بھی ہے۔ اور پھر ہر جگہ ہی این سی اے کے دوست ہیں' سب جاننے والے' اس لیے کہیں بھی مسئلہ نہیں ہو گا۔

یوں اپنی زندگی تباہ کرنے سے نہ میرا فائدہ ہو گا اور نہ مجھ سے محبت کرنے والوں کا۔ بس ٹھیک ہے میں کل ہی فرد سے کہوں گی' اس بارے میں۔ میں کسی کی بات نہیں سنوں گی۔''

دروازے پر نبیلہ کی مخصوص دستک سن کر میں چونک گئی۔

''کھانا کھانے آ جاؤ۔'' اس نے باہر سے آواز لگائی۔

''نہیں کھانا۔'' میرے لہجے میں بے رخی تھی۔

''پاگل ہو گئی ہو' دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔'' اس نے غصے سے کہا اور وہاں سے پلٹ گئی۔

ابھی میں ٹھیک سے اپنی سوچوں کا سرا پکڑ بھی نہیں سکی تھی کہ اس نے دوبارہ دستک دی۔

''یہ لے لو' میں کھانا لے آئی ہوں۔''

''کہا ہے نہیں کھانا۔''

''پاگل پن کی باتیں مت کرو' اپنے کمرے میں ہی سہی لیکن کھانا تمہیں کھانا ہو گا۔'' اس نے سختی سے کہا۔

میں جانتی تھی کہ وہ ٹلنے والی نہیں تھی۔ اور اتنے لوگوں کی موجودگی میں یہ شور شرابا مجھے گوارا نہیں تھا۔ بادلِ ناخواستہ مجھے دروازہ کھولنا پڑا۔ وہ سامنے ہی ٹرالی لیے کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا تو احساس ہوا کہ مہمان ڈائننگ روم میں تھے۔

''سب کے جانے کے بعد تم سے ملتی ہوں۔'' اس نے ٹرالی دھکیل کر اندر کی اور خود وہیں سے پلٹ گئی۔

ٹرالی میں سجے ڈھیروں کھانے دیکھ کر ایک لمحے کو مجھے سخت افسوس ہوا۔

''اتنے سارے مہمان تھے اور بیلا کو اکیلے ہی اتنا کچھ کرنا پڑا۔ کتنی تھک گئی ہوگی وہ۔ اتنے مختصر وقت میں اتنا کچھ بنایا اس نے کتنی بری بات ہے کہ میں نے ذرا سا بھی ہاتھ نہیں بٹایا اس کا۔ وہ میرا اس قدر خیال رکھتی ہے اور میں کچھ بھی نہیں کرتی اس کے لیے۔ کبھی تو اس کے دل میں بھی آتا ہوگا کہ میں بھی اسی طرح خیال رکھوں اس کا۔

میں کتنی بری ہوں کسی کو کچھ نہیں دے سکی۔ پاپا میری وجہ سے دکھی رہتے ہیں اور بیلا جس کی آنکھوں میں اپنی طلاق کے وقت آنسو نہیں تھے اس روز کیسے رو پڑی تھی میرے لیے۔ اور پھر تیمور ہے میں تو اس کے لیے بھی کچھ نہ کر سکی۔ محبت کا دعویٰ تو بہت تھا لیکن کیا دے سکی میں اسے۔ آج وہ کتنا تنہا ہے۔''

یہ رنج اتنا شدید تھا کہ میں خود پر قابو ہی نہ رکھ سکی اور رو پڑی۔

کافی دیر بعد پھر دستک ہوئی۔

''اپنے حجرے سے باہر نکلو' سب جا چکے ہیں۔'' نبیلہ نے باہر سے کہا۔

میں نے آنسو پونچھے لیکن اٹھ کر دروازہ کھولنے اور اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی میرے اندر۔

''اب برآمد ہو بھی چکو' مجھے برتن سمیٹنے ہیں پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہوں میں جلدی سونا چاہتی ہوں۔'' اس نے پھر آواز لگائی۔

اپنی جگہ سے اُٹھ کر میں نے دروازے کا لاک کھولا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر ٹرالی کی طرف بڑھ گئی اور پھر ٹھٹک گئی۔

''تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟ کیوں اتنا پریشان کرتی ہو بجو! اتنا تردد تو بچوں کے ساتھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ میری جان عذاب میں گرفتار کی ہوئی ہے تم نے' اب کیا تمہارے لیے نوالے بھی میں ہی بناؤں؟ تم میرا نروس بریک ڈاؤن کروا کے ہی رہو گی۔ میں بھی تو پاگل ہوں خواہ مخواہ دل جلاتی رہتی ہوں۔ کھاتی ہو کھاؤ نہیں کھاتی تو بھی میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اب تم روؤ اور جو مرضی کرتی رہو' میری ہمت جواب دے گئی ہے۔'' وہ مجھ پر چلا رہی تھی۔ اس کی اونچی آواز سن کر پاپا بھی وہیں آ گئے۔ میں بے اختیار ان سے لپٹ کر رو پڑی۔

''بیلا مت ڈانٹا کرو بجی کو۔'' پاپا کے لہجے میں تھکن تھی۔

''میں جو کر رہی ہوں' وہ بالکل ٹھیک ہے۔ حد ہوتی ہے ناں کسی بات کی۔ اس کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے' اس لیے سر چڑھ گئی ہے یہ۔ ناقابل برداشت حرکتیں ہیں اس کی۔''

''ٹھیک کہتی ہیں بیلا۔'' میں روتے ہوئے پاپا سے بولی۔ ''میں بہت بری ہوں۔ سب میرا خیال رکھتے ہیں' مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن میں کبھی کسی کا خیال نہیں رکھتی۔ کسی کو کچھ نہیں دے سکی' آپ کو بھی اتنے دکھ دیئے بیلا کو بھی اور تیمور سے بھی وعدہ نہ نبھا سکی۔ پاپا میں بہت بری ہوں۔''

''بجی نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میرے منہ سے یونہی نہ جانے کیا نکل گیا۔ پلیز روؤ مت۔ میرا کوئی ایسا مطلب نہیں تھا۔'' نبیلہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔

پاپا مجھے اپنی خواب گاہ میں لے آئے۔ نبیلہ بھی ساتھ ہی آ گئی۔

''آئی ایم سوری بجی۔ میں نے یونہی بکواس کر دی تھی۔ انسان ہوں ناں' اچھا برا کچھ بھی زبان سے پھسل جاتا ہے۔'' وہ اب بھی مجھ سے معافیاں مانگ رہی تھی حالانکہ کہیں بھی اس کا قصور نہیں تھا۔

بڑی مشکلوں سے میرے آنسو تھمے۔ پاپا اور نبیلہ میرا دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران گفتگو کا رخ رشتے داروں کی طرف مڑ گیا۔

''کتنے اچھے ہیں تینوں ماموں اور ممانیاں بھی اچھی ہیں' سب کہہ رہے تھے کہ چھوٹے ماموں سب سے اچھے ہیں۔ پتا نہیں وہ کب امریکہ سے لوٹیں گے۔ اور پاپا فیصل کتنا اچھا ہے۔ سب ہی بہت اچھے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اُڑ کر بابا جان تک جا پہنچوں۔'' نبیلہ کہہ رہی تھی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''بابا جان یعنی ہمارے نانا کو ابھی تک خبر نہیں ہے ہمارے متعلق۔ اگر معلوم ہوتا تو میں ماموں کے ساتھ ہی چلی جاتی۔ ماموں نے کہا کہ پہلے وہ بابا جان کو بتائیں گے اور پھر ہمیں ان کے پاس لے جائیں گے۔ بابا جان اب بھی ممی کو یاد کرتے ہیں۔''

میرے اندر تلخی کا احساس اُبھرنے لگا۔ ''اب یاد کرنے کا کیا فائدہ۔''

''ایسی بات نہیں کرتے۔ آج بھی سب آپ کے منتظر رہے اور آپ نے کسی سے ملنا گوارا نہیں کیا۔'' پاپا نے مجھ سے کہا۔

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''پاپا آپ تو یہ بات نہ کریں۔ میں تو صرف

سوچتی ہوں لیکن آپ نے تو ممی کو یہ دکھ اٹھاتے دیکھا ہے جو ان کے اور آپ کے گھر والوں نے انہیں دیئے تھے۔ اور انہی دکھوں نے میری ممی کی جان لے لی۔

کیا آپ نے کبھی ممی کو مس نہیں کیا' کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کیا؟ آپ کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ممی زندہ رہ سکتی تھیں اگر یہ زہر بھری باتیں ان کی سماعت میں اتر کر ان کی روح تک نہ پہنچی ہوتیں۔ بیٹے شاید ماں کے بغیر گزارا کر سکتے ہوں لیکن پاپا بیٹیاں نہیں کر سکتیں۔ ان میں سے کوئی یہ جان سکتا ہے کہ ہم نے کیا کچھ مس کیا اور کس کس لمحے میں نے اور بیلا نے ممی کی ضرورت محسوس کی۔

اور آج کیوں دعویدار بن کر آ گئے یہ لوگ؟ ہم کیا لگتے ہیں ان کے؟ جو اپنی سگی بہن کے جنازے کو کندھا دینے نہیں آئے' وہ ہمیں کیا دے سکتے ہیں۔ حیرت تو مجھے آپ پر ہے پاپا۔ آپ کیسے یہ باتیں فراموش کر سکتے ہیں۔''

پاپا کے چہرے پر کچھ بجھ سا گیا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔

''وہ پشیمان نہ ہوتے تو آج بھی انہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور میں کچھ بھولا بھی نہیں ہوں کچھ بھول سکتا بھی نہیں ہوں' البتہ ایک بات پر ایمان ہے کہ زندگی دینے اور لینے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ آپ کی ممی کو اسی طرح جانا تھا' تنہائی ہمارا مقدر تھی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ وہ زندہ رہ سکتی تھیں تو یہ بات کفر بکنے کے برابر ہوگی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا ناں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں تھا پھر بھی وہ وفات پا گئیں یا نعوذ باللہ' اللہ تعالیٰ تو ایسا نہیں چاہتا تھا اور انہیں زندہ رکھنا چاہتا تھا لیکن کسی نے انہیں مار دیا۔

یوں نہ ہوتا تو کچھ اور ہوتا مگر ان کی زندگی میں اس سے زیادہ سانسیں نہیں تھیں۔ ملک الموت نے اسی لمحے ان کی روح قبض کی جس لمحے کا فیصلہ پہلے ہو چکا تھا جو لوحِ محفوظ میں لکھا تھا۔

وہ سب جو آپ نے اس بات کے علاوہ کہا میرے دل میں زخم بن کر موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر قدم پر بیٹیوں کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے مگر میں قدرت کے ساتھ لڑ نہیں سکتا تھا۔ آج رعنا ہوتی تو مجھ سے بہتر طریقے سے آپ کے مسائل ہینڈل کر سکتی تھی۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ' لیکن بیٹا میں بہت آگے تک دیکھ رہا ہوں۔ یہی بہت ہے کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہیں اور آج بھی رعنا کو یاد کرتے ہیں۔''

''بہت آگے تک دیکھنے کا مطلب؟'' میں کچھ نہ سمجھی۔

پاپا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں باقاعدہ جاب کروں گی۔'' میں نے موضوع پلٹ دیا۔

اب میں کسی بحث یا اپنی کسی اور عمل سے پاپا اور نبیلہ کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

میری بات سن کر دونوں بہت خوش ہوئے۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''فرو مٹھائی کا ٹوکرا اٹھا لائے گی۔'' نبیلہ ہنسی۔

''میں ان کی ایجنسی میں جاب نہیں کروں گی۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' وہ کچھ نہ سمجھی۔

''یہ کیوں مت پوچھو بس میں کہیں اور جاب کروں گی۔''

''تم یہ ارادہ بھی فرو کے سامنے ظاہر کرو گی تو وہ تمہیں قتل کر دے گی۔'' پھر وہ پاپا کی طرف بڑھی۔ ''آپ ہی اسے تھوڑی سی عقل سکھا دیں۔ فرو کی طرف ہوتی ہے تو ہم سب کو تسلی رہتی ہے۔ آپ اسے منع کر دیں کہ یہ کہیں اور جاب نہیں کرے گی۔''

''بیلا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ پہلے بھی وہیں جاب کرتی رہتی ہیں۔ فرو اور ہمایوں کی وجہ سے مجھے تسلی رہتی ہے۔ پھر اب تو فیصل بھی ہے۔'' پاپا نے کہا۔

میں ان سے کیا کہتی کہ فیصل کی وجہ سے ہی تو میں وہاں جاب نہیں کرنا چاہتی۔

''پاپا میں مصنوعی سہاروں کے ساتھ نہیں جینا چاہتی' خود کو مضبوط بنانا چاہتی ہوں۔'' بالآخر میں نے کہا۔

''دنیا میں ہر شخص سہاروں کے ساتھ ہی زندہ رہتا ہے۔ ہم میں سے کوئی اتنا مضبوط نہیں ہوتا کہ تنہا اور آئسولیشن میں زندگی گزار سکے۔ پھر بھی آپ ایسا چاہتی ہیں تو اس کا بھی طریقہ ہے۔ پہلے چار چھ مہینے ہمایوں کی ایجنسی میں ہی باقاعدہ جاب کریں اور جب ذہنی طور پر سیٹ ہو جائیں تو اپنی مرضی کی کوئی ایجنسی جوائن کر لیں۔'' پاپا نے کہا۔

میں نے اس وقت مزید بحث نہیں کی لیکن اس بارے میں یہ خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑ چکا تھا۔

''پاپا آپ مجھے کمپیوٹر لے دیں' مجھے اس پر کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ اب تو بہت نئے

آئیڈیاز آتے ہیں اور پھر کمپیوٹر کے ساتھ وقت گزارنے کا بھی پتا نہیں چلتا۔ بہت دلچسپ چیز ہے۔'' میں نے فرمائش کی۔

میں فرمائشیں نہیں کیا کرتی تھی۔ کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اب میرے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی کہ پاپا مان گئے۔

''کیوں نہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن کون سا کمپیوٹر لیں گی آپ؟''

''ایپل میکنتاش'' میں نے جلدی سے کہا۔

''پاپا یہ تو نکمی ہے' اسے صرف ڈیزائننگ' کرنی ہے۔ اب جب آپ کمپیوٹر لے کر دینے لگے ہیں تو پھر آئی بی ایم کمپیٹیبل لے دیں' میرا بھی فائدہ ہو جائے گا۔ میکنتاش تو میرے لیے بے کار ہوگا۔'' نبیلہ نے جلدی سے کہا۔

کتنی دیر تک ہم تینوں بیٹھے اس بارے میں منصوبہ بندی کرتے رہے۔

اگلے روز میرا آفس جانے کا ارادہ نہیں تھا۔

''میں جاب کے بارے میں پلاننگ کرنا چاہتی ہوں' اس لیے کم از ہفتہ بھر آفس کے ماحول سے مکمل طور پر الگ رہ کر سوچوں گی۔'' میں نے کہہ دیا۔

نہ جانے کیا سوچ کر نبیلہ نے بحث کی اور پاپا نے بھی یہ عذر تسلیم کرلیا۔

☆======☆======☆

میرا کمپیوٹر پرنٹر کے ساتھ آ گیا تھا اور اس بارے میں مَیں بہت خوش تھی۔ یہ میرے لیے سکون اور پناہ کا ایک ذریعہ تھا۔

جب ایک مرتبہ ممی کے رشتے داروں کے لیے گھر کا دروازہ کھلا تو ہمیشہ کے لئے کھل گیا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی چلا آتا تھا' اتنے ڈھیر سارے مہمان اور ہر ایک ٹولی کے ساتھ فیصل کا آنا فرض ہوتا تھا۔ میرے کمرے کے دروازے کے پیچھے لاؤنج میں قہقہے گونجتے رہتے' نہ ختم ہونے والی باتیں جاری رہتیں اور میں اپنے بیڈروم میں کمپیوٹر کے ساتھ مصروف رہتی۔

چار ماموں اور ان کی فیملیز تھیں ہی' نہ جانے اور کون کون سے رشتے دار ٹپکے پڑ رہے تھے۔ پاپا اور نبیلہ جانتے تھے کہ میں ان میں سے کسی سے ملنا نہیں چاہتی' اس لیے اس بارے میں اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ نبیلہ کی طرف سے بھی مجھے اطمینان تھا کہ اپنی عادت کے برعکس اب وہ ملازمہ کو بھی کھانا پکانے میں شامل کرلیا کرتی تھی۔

میرے بارے میں اکثر رشتہ دار استفسار کرتے تھے' سب ہی ماموں ملنے کے لیے بے چین تھے۔ پاپا اور نبیلہ نے بھی کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

''وہ ملنا نہیں چاہتی۔'' ان سے کہہ دیا تھا یہ بات چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میرے پہلے روز کے رویے اور پھر فیصل کے سامنے ہونے والی گفتگو کے بعد انہیں خود بھی اس بات کا اندازہ تھا۔

دوسری جانب نیلوفر سے بھی میری زبردست لڑائی ہوگئی تھی۔

''ٹھیک بتایا ہے تمہیں بیلا نے۔ میں کہیں اور جاب کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے اس سے کہا تھا۔

''تم نے یہ سوچا بھی تو قتل ہو جاؤ گی میرے ہاتھوں۔ یہاں اپنے گھر والی بات ہے اور کہاں کہاں ماراماری کرو گی۔''

''یہ شہر بھر کی واحد ایڈورٹائزنگ ایجنسی نہیں ہے اور نہ ہی میں اتنی نکمی ہوں کہ جوتیاں چٹخاتی پھروں اور کہیں جاب نہ ملے۔''

''اس روز کہیں اور جاب کے بارے میں سوچنا جب ہماری ایجنسی کا دیوالیہ نکل جائے' جب ہم تمہیں اچھی تنخواہ اور اچھا ماحول نہ دے سکیں۔''

بس یہیں سے بات بڑھ گئی۔ نیلوفر کو میرا فیصلہ قطعی قبول نہیں تھا۔ بحث در بحث ہم دونوں کو غصہ آ گیا۔

''باقی ایجنسیاں تمہیں جتنی تنخواہ دیں گی ہم تمہیں اس سے ایک ہزار بلکہ ڈیڑھ ہزار روپے زیادہ دیں گے۔'' وہ بولی۔

''پیسہ میرا مسئلہ نہیں ہے اور تم بھی اس انداز میں بات نہ کرو جیسے میں تمہارے ہزار ڈیڑھ ہزار اضافی روپوں کی لالچی ہوں۔''

''تو کیا مسئلہ ہے تمہارا؟''

اب یہ سراسر میرا قصور تھا کہ غصے اور بحث کے عالم میں مَیں نے اسے اپنا مسئلہ نہیں بتایا۔ اور بات بلاوجہ طول پکڑ گئی۔

''میں تب تک تم سے نہیں ملوں گی جب تک تم اپنا یہ فیصلہ نہیں بدلو گی۔'' کہہ کر وہ چلی گئی۔

نبیلہ کو ہر روز فون کر کے وہ پوچھا کرتی تھی۔

''سجو کے دماغ میں گھسا کیڑا باہر نکلا یا نہیں؟''

لیکن مجھ سے نہ بات کرنے کی تو جیسے اس نے قسم اٹھائی ہوئی تھی۔ میں نبیلہ کے ہاتھ سے فون لیتی تو وہ کچھ کہنے سننے سے صاف انکار کر دیتی۔

''میں تمہاری بات سننا نہیں چاہتی۔ اس روز رابطہ کرنا جب تم اپنا فیصلہ بدل لو۔'' اور ساتھ فون رکھ دیتی۔

مجھے تاؤ بھی آتا اور رونا بھی۔

''کوئی میری بات نہیں سنتا نہیں سمجھتا۔'' میں سوچتی۔

اس روز بھی ہمیشہ کی طرح کتنے مہمان براجمان تھے۔ میرے بیڈروم کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''بیلا نے چائے بھجوائی ہوگی۔'' میں نے سوچا اور با آواز بلند بولی ''یس۔''

میں مکمل طور پر کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ تھی اور ساتھ ملازمہ کے قریب پہنچنے کی منتظر بھی تھی جسے کمرے کے کونے میں لٹکتا جالا نہ اتارنے پر جھاڑ پلائی تھی' لیکن اس وقت میں چونک گئی جب کمرے میں پھیلی ائیر فریشنر کی خوشبو سے الگ بروٹ کی مہک محسوس کی۔ فیصل میرے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

''تم؟'' مجھے حیرت تھی۔ میں نے دروازہ لاک کرنا اسی لیے چھوڑا تھا کیونکہ نبیلہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے بیڈروم میں رشتہ داروں میں سے کوئی نہیں آئے گا۔ سو یہ خدشہ میرے ذہن میں کہیں نہیں تھا۔

''تمہاری اجازت سے اندر آیا ہوں۔'' اس نے کہا اور بلا تکلف قریب رکھی راکنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

اس لمحے میں اس کا سامنا کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی اور اسے وہاں سے نکال دینا بھی ممکن نہیں تھا۔ میری الجھن اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔

''تم کیوں فیس (Face) نہیں کرنا چاہتیں۔'' وہ بولا۔

''عجیب بے معنی بات کر رہے ہو۔ میرا تمہارا ایسا کیا تعلق ہے کہ میں تمہیں فیس کرتے ہوئے گھبراؤں اور پھر تم اتنے اہم بھی نہیں ہو۔''

اس کے ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میں اپنے بارے میں کب بات کر رہا ہوں۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ تم حقیقت کو اور حالات کو کیوں نہیں فیس کرنا چاہتیں۔ یوں کب تک ایک کمرے میں بند رہو گی۔ ناراضگی اور غصہ ظاہر کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔''

''میں کسی کو اپنی شخصیت یوں ڈسکس کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ جو میرا دل چاہے گا میں کروں گی' تم کون ہوتے ہو اس بارے میں بات کرنے والے۔''

''میں کچھ بھی نہیں ہوں' اس میں کیا شک ہے۔ یہ البتہ الگ بات ہے کہ تمہاری شخصیت ڈسکس کرنے کے لیے کسی کو تم سے لائسنس لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی شک ہو تو خود لاؤنج میں جا کر سن لو دیکھ لو۔''

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''لیکن ایک بات ہے' اس کی بات جاری تھی۔ ''بہت دنوں تک لوگ ایک ہی بات ایک ہی چیز اور ایک ہی شخصیت کو ڈسکس نہیں کر سکتے۔ بور ہونے لگتے ہیں۔ پرانی باتوں کو فراموش کر کے نئے موضوع کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں کب تک دلچسپی رہ سکتی ہے جو Isolate ہو کر رہنا چاہیں۔ ظاہر ہے جو خود تنہا رہنا چاہتا ہو اسے تنہائی سے کون نکال سکتا ہے۔''

''میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے گھر والے میرے پاس اور میرے ساتھ ہیں اور وہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔'' میں اس کی بات سے چڑ گئی۔

''ہاں یہ تو ہے لیکن بیلا کے جانے کے بعد تمہیں دقت ہو جائے گی۔'' اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔

میں سمجھ سکتی تھی کہ وہ مجھے گفتگو میں الجھانا چاہتا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں وہی کر رہی تھی جو وہ چاہتا تھا۔

''کیا مطلب؟ بیلا کہاں جا رہی ہے؟''

''سارا گھر اسی نے سنبھالا ہوا ہے اور اب ظاہر ہے جب چند مہینوں کے بعد اس کی شادی ہو جائے گی تو تم کو یہ ذمہ داری اٹھانی مشکل ہو گی۔ ممکن ہے یہ ذمہ داری نبھانا اتنا مشکل نہ ہو لیکن جب وہ لندن چلی جائیں گی تو گھر میں تم تنہا ہو جاؤ گی۔ خیر اس سے کیا فرق

پڑتا ہے۔تم یوں بھی تنہائی کی عادی ہو۔''

وہ جس انداز سے بات کر رہا تھا میرا دل چاہنے لگا تھا کہ پاس پڑا گلدان اسے کھینچ ماروں۔

مگر یہ ایک الگ بات تھی۔اس کا انداز تو مجھے چڑا ہی رہا تھا ساتھ میں جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ سب میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ بیلا کی شادی اور لندن جانے کا ذکر وہ کچھ اس طرح سے کر رہا تھا جیسے یہ سب کچھ طے ہو جبکہ ایسی کوئی بات ہوتی تو کیا میں بے خبر ہوتی۔اور پھر کس طرح ٹکڑوں میں بات کر رہا تھا وہ۔ جس بات میں میری دلچسپی تھی اس کا مختصر سا حوالہ دے کر میری ذات کو درمیان میں گھسیٹ لاتا تھا۔غصہ اور جھنجلاہٹ تو اپنی جگہ تھے۔ مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جواب میں کیا کہوں۔اتنی بڑی بات میں وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی لیکن یہ سچ تھا تو مجھے کیوں خبر نہیں تھی؟

جب کچھ نہ بن پڑا تو میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔فیصل بہت اطمینان سے اٹھ کر میری خالی کی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔اس کا اطمینان مجھے مزید غصے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔دروازہ کھول کر میں بھرپور غصے سے چلائی۔

''بیلا! بیلا کہاں ہو؟''

لاؤنج سے اٹھتی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

''آ رہی ہوں۔'' نبیلہ کی آواز آئی پھر چند لمحوں بعد وہ خود گیلری میں نمودار ہو گئی۔

گھبراہٹ کے آثار چہرے پر سجائے۔''کیا ہوا؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''اندر آؤ۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

''ہوا کیا ہے؟'' اس کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''فیصل جو کچھ کہہ رہا ہے' کیا وہ سچ ہے؟''

''مجھے کیا پتا فیصل کیا کہہ رہا ہے۔'' وہ کچھ نہ سمجھی۔

فیصل نے ریوالونگ چیئر کا رخ ہماری طرف گھما دیا۔

''میں نے بس اسی قدر کہا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد شاید نبیلہ تنہائی محسوس کرے۔'' وہ یوں بولا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

''یہ کہہ رہا ہے کہ چند مہینے بعد تمہاری شادی ہونے والی ہے اور پھر تم لندن چلی جاؤ

گی۔'' میرا لہجہ خود بخود شکایتی ہو گیا۔

نبیلہ نے ایک نظر فیصل کو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔''ایسا ہوا تو کیا تم خوش نہیں ہو گی؟''

اس کا لہجہ کہہ رہا تھا کہ یہ طے شدہ بات تھی۔میرا دل ٹوٹ گیا۔

''کار کی چابی کہاں ہے؟'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں کہاں جاؤ گی۔'' نبیلہ نے کچھ خوف زدہ ہو کر کہا۔

''خودکشی نہیں کرنے جا رہی۔چابی دو۔'' میں غصے سے ابل رہی تھی۔

''سجو! میری بات سنو' میں سب کچھ تمہیں تفصیل سے بتا دیتی ہوں۔تمہیں کوئی شکوہ نہیں رہے گا۔'' نبیلہ کے انداز میں منت تھی۔

میں اسے نظر انداز کر کے لاؤنج میں آ گئی' کار کی چابی عموماً وہیں لٹکتی مل جاتی تھی۔نبیلہ بھی میرے پیچھے چلی آئی۔

وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔کچھ بزرگ' کچھ لڑکے لڑکیاں۔سب کو نظر انداز کر کے میں نے چابی لی اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔

''سجو کہاں جا رہی ہیں؟'' پاپا کی آواز آئی۔

''فرو کی طرف جا رہی ہوں۔'' میں اپنے لہجے میں اترتے ہوئے غصے پر قابو نہیں پا رہی تھی۔اس پرسش پر نالاں بھی تھی۔ظاہر ہے اور کہاں جا سکتی تھی میں۔جب گھر میں دکھڑے نہیں رو سکتی تھی تو اس کے پاس پہنچ جاتی تھی اور جب اس سے خفا ہوتی تھی تو پاپا اور نبیلہ میں سے کسی کے کندھے پر سر رکھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔

وہ گھر پر ہی تھی' مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔

''کتنا اچھا ہوا تم آ گئیں' ہمایوں اپنے مما' پاپا کو سلام کرنے گیا ہے۔میں نے اس سے کہا مجھے تو معاف ہی رکھو' میں اکیلے میں بور ہونا گوارا کر لوں گی لیکن تمہاری اماں کے دربار میں حاضری دینا مجھے گوارا نہیں۔امید ہے تم بھی راہِ راست پر آ گئی ہو گی۔پھر ہمارا سیلری پیکج منظور ہے؟''

میں نے کار کی چابی اور دوپٹے کا گولا سا بنا کر دونوں چیزیں دور پھینکیں۔غصے کا اظہار کرنے کے لیے فی الوقت یہی چیزیں دستیاب تھیں۔

''اللہ خیر۔ اس وقت تو گرجنے' برسنے دونوں کے آثار ہیں۔'' وہ بولی۔

''میں سخت اپ سیٹ ہوں فرو۔'' صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

''اب تو یہ ہابی ہے' اس میں پریشانی کی کیا بات۔''

''کیا مطلب؟ یعنی میں اپنی خوشی سے اداس ہوتی ہوں؟'' مجھے تاؤ آ گیا۔

''اچھا جانے دو۔ سمجھو میں نے بکواس کی تھی۔ تم بتاؤ کیا پرابلم ہے۔'' اس نے چابی اور میرا دوپٹہ قالین سے اٹھا کر میز پر رکھے اور میرے قریب آ بیٹھی۔

''فرو! بیلا کی شادی ہو رہی ہے۔''

''ہاں' مجھے پتا چلا تو میں خوشی سے اچھل ہی پڑی' بیلا اور انکل کو تو ڈھیر ساری مبارک باد بھی دی تھی لیکن تم سے سخت ناراض تھی' اس لیے تمہیں اس مبارک باد میں شامل نہیں کیا تھا۔'' وہ بولی۔

''یعنی تمہیں بھی علم تھا۔'' میرا دل پھر ٹوٹ گیا۔

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''اچھا اب تو تمہیں پتا چل گیا ناں۔''

''جن کے منہ سے پتا چلنا چاہیے تھا ان کے منہ سے یہ خبر نہیں سنی۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''اچھا چھوڑو بھی' یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے واقعی اس سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو فرو! میری ایک ہی تو بہن ہے اور مجھے اس کی شادی کی خبر غیروں سے پتا چل رہی ہے۔ ہم بہنیں ایک چھت تلے رہتی ہیں' وہ رشتے دار جو چند دن پیشتر ہماری زندگی میں آئے ہیں' اتنے اہم ہیں کہ انہیں یہ بات معلوم ہے اور میں اتنی غیر اہم ہوں کہ کسی نے مجھے بتانے یا مجھ سے کچھ کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ یہ چھوٹی بات ہے کیا؟ میں جانتی ہوں' مجھے کیوں نہیں شامل کیا کسی نے۔ سب سمجھتے ہوں گے کہ میں منحوس ہوں۔'' میں رونے لگی۔

''پاگل ہوئی ہو۔'' نیلوفر نے انتہائی حیرت سے کہا۔ ''یہ ہندوانہ پن تو ہم میں سے کسی نے نہیں دکھایا' تمہارے دماغ میں اس بات کا تصور بھی کیسے آ گیا؟ جتنا سب تم سے پیار کرتے ہیں' تمہاری دل جوئی کرتے ہیں' تمہارا خیال رکھتے ہیں' اتنا تو کبھی کسی نے کسی کے

ساتھ نہیں کیا ہوگا۔''

''تمہاری ان یقین دہانیوں سے حقیقت تو تبدیل نہیں ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''اوہ خدایا۔ یہ کیڑا کس نے تمہارے دماغ میں گھسایا ہے۔ کیا آج تک کسی نے تم سے ایسی کوئی بات کی؟ کسی کے منہ سے تم نے یہ انتہائی گھٹیا لفظ سنا؟''

''زبان سے کچھ کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ ورنہ مجھے بتاؤ کہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے مجھے بے خبر رکھنے کی۔''

نیلوفر نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''تم صرف اپنے بارے میں سوچنے لگی ہو سجو! وہ بھی منفی انداز میں۔ اور یہ ہم سب کی غلطی ہے کہ بلاوجہ ضرورت سے زیادہ تمہارا خیال رکھتے ہیں۔ تم بری طرح سے خود ترسی کا شکار ہو گئی ہو۔ اپنی ذات سے ہٹ کر تمہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔''

میں نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ ایک لمحے کے لیے بھی تم نے یہ سوچنے کی زحمت کی ہے کہ نبیلہ نے اگر تمہیں یہ بات نہیں بتائی تو کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ جو تم پر جان چھڑکتی ہے' اگر اس بارے میں اس نے تمہیں نہیں بتایا تو کیوں؟

تم اس بری طرح سے خود ترسی میں مبتلا ہو کہ اس کا تمام تر الزام بھی تم نے اس کے کھاتے میں ڈال دیا' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک تو اس کی شادی ماموں کے بیٹے سے طے ہوئی ہے اور تمہیں ان لوگوں کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں' دوسرے اسے تیمور کا خیال ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ ایک لمحے کے لیے بھی تمہارے دل میں یہ ملال آئے کہ وہ تمہارے دکھ بھول کر اپنی خوشیوں میں مگن ہو گئی ہے۔

اسی لیے جب اس کے لیے یہ پرپوزل آیا تو اس نے تم سے ذکر نہیں کیا اور پھر جب انکل نے تم سے مشورہ لینا چاہا تب بھی اس نے منع کر دیا۔ وہ بہت پریشان تھی اور تمہاری شدت پسندی سے خوف زدہ بھی۔

''اسے اچھا نہیں لگے گا فرو کہ میری شادی ماموں کی طرف ہو' نہ جانے وہ کیا کہے۔ اس نے کچھ کہہ دیا تو بعد میں اس کا دل بھی دکھے گا اور میرا بھی۔ وہ ممی کے رشتے داروں کو سخت ناپسند کرتی ہے' ان کے آنے پر اپنے بیڈروم سے باہر بھی نہیں نکلتی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کیسے بتایا جائے۔

اور پھر تیمور ہے۔ وہ کیا سوچے گی کہ میں نے اس کے دکھوں کا احساس نہیں کیا اور اپنے لیے خوشیاں تلاش کر کے الگ ہو گئی۔ وہ منہ سے بولے یا نہیں لیکن اسے دکھ ضرور ہو گا اور یہ احساس بھی کہ وہ بالکل تنہا ہو گئی ہے۔ ویسے ہی وہ اب تک سنبھل نہ سکی۔

پاپا اس سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نے منع کر دیا ہے' میں بہت خوف زدہ ہوں۔ نہ جانے کیا ردِعمل ہو تجو کا۔'' نبیلہ نے مجھ سے کہا تھا۔

ایک وہ بہن ہے جو تمہارے لیے اس طرح سوچ رہی ہے اور ایک تم ہو کہ اسے شادی کی مبارک باد تک نہیں دی اور غصے میں بھری ادھر چلی آئیں۔ اپنے سے ہٹ کر دیکھنے کی بھی عادت ڈالو۔ ساری دنیا تمہارے گرد طواف نہیں کر سکتی۔''

میں نیلوفر کی بات سن رہی تھی اور شرمندگی میرے اندر قطرہ قطرہ اترتی جا رہی تھی۔ یہ کیا ہوتا جا رہا تھا مجھے' میں کیوں اس انداز میں سوچنے لگی تھی' کیوں ایسی ہو گئی تھی میں۔ کسی بات میں کوئی مثبت پہلو کیوں دکھائی نہیں دیتا تھا مجھے۔

میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''یہ پرپوزل اتنا اچھا تھا کہ انکل انکار نہیں کر سکتے تھے۔ نادر ڈاکٹر ہے اور ابھی اسٹڈیز کے لیے لندن جانے والا ہے۔ گھر والے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن اسے کوئی لڑکی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ پھر جب ان کا یہاں آنا جانا ہوا' سب نے بیلا کو دیکھا' نادر نے بھی' تو سب ہی کو بیلا بہت اچھی لگی۔ وہ ہے بھی تو کتنی اچھی۔ تمہاری منجھلی ممانی جو اس کی ہونے والی ساس ہیں' وہ تو سخت بے چین ہیں بیلا کو بہو بنانے کے لیے۔'' نیلوفر بتا رہی تھی۔

''انہیں خبر ہے کہ پہلے بیلا......'' میرے دل میں خدشے سر اٹھانے لگے' اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

''ہاں' لیکن اس بات پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے تجو اگر ہم اس کی مہربانیاں دیکھیں تو۔ اتنے دن سے وہ لوگ آ رہے ہیں۔ بیلا کا ہر انداز ان کے سامنے ہے۔ سارا گھر سنبھالا ہوا ہے اس نے۔ پاپا کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی ہے' تم جیسے پتھر سے بھی وہی سر پھوڑتی ہے اور اپنے لیے بھی وقت نکالتی ہے' تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی ہے' خوبصورت ہے اور اس سے بڑھ کر کسی کو کیا چاہیے۔

یوں بھی بیلا نے واضح طور پر انکل سے کہہ دیا تھا کہ اس بارے میں وہ نادر اور اس کے

گھر والوں کو پوری تفصیل سے بتا دیں اور انکل بھی تمہیں معلوم ہے کہ ایسی بات چھپانے کے قائل نہیں ہیں' تمہارے ماموں نے سن کر کہا۔ اچھا ہے بروقت خبر ہو گئی اور چھٹکارا مل گیا۔ بعد میں خدانخواستہ کچھ ہوتا تو بہت برا ہوتا۔ پھر تجو! ٹوٹے رشتے اس سے بہتر انداز میں کب اور کیسے جوڑے جا سکتے ہیں۔'' نیلوفر نے کہا۔

''بیلا خوش ہے؟''

''ہاں' بس اس کے دل میں ایک ہی کانٹا پیوست تھا کہ نہ جانے تمہارا کیا ردِعمل ہو۔ خوش ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی خوشی کا اظہار نہیں کر سکی۔''

میرا دل دکھ گیا۔ صرف میری وجہ سے ایسا ہوا تھا گو کہ اب بھی میرے دل میں ممی کے رشتہ داروں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن نبیلہ خوش تھی اور اتنی اچھی جگہ اس کا رشتہ طے ہو گیا تھا اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہو سکتی تھی۔

''تم نادر سے ملی ہو؟''

''ہاں' کیا کمال بندہ ہے۔ اس قدر ہینڈسم کہ کیا بتاؤں برٹش نیشنیلٹی ہے اس کے پاس۔ اردو بول لیتا ہے لیکن اچھی نہیں۔ زیادہ تر وقت اس نے وہیں گزارا ہے۔ ڈیسنٹ بھی اتنا ہے' زبردست شخصیت کا مالک ہے۔ تم ملو گی تو جی خوش ہو جائے گا۔''

نیلوفر کی باتوں سے مجھے تسلی ہوئی۔

''نادر اور فیصل بھائی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں' نادر تمہارے منجھلے ماموں کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے اور فیصل چھوٹے ماموں کا سب سے چھوٹا بیٹا۔ چار لڑکے لڑکیوں کے علاوہ تمہارے سب کزنز شادی شدہ ہیں۔ میرا مطلب ہے تمہاری ممی کی طرف کے کزنز۔''

تھوڑی دیر تک گلے میں پڑی سونے کی زنجیر میں لگے پینڈینٹ کو بلاوجہ گھماتی رہی۔ پھر بولی۔

''فرو! میں بہت بدتمیزی کر کے آئی ہوں بیلا کے ساتھ۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے۔ کیوں ایسے کرنے لگی ہوں میں۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔''

''تمہارا پرابلم یہ ہے کہ تم نے خود اپنی خوشیوں پر پہرے بٹھا دیے ہیں۔ تم خود خوش نہیں ہونا چاہتیں۔ ورنہ دنیا میں اتنے رنگ ہیں کوئی تو دامن پکڑ ہی لیتا ہے۔ اب جو تم بیلا

کے ساتھ کر آئی ہو' اس کی تلافی اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ تم اس سے معافی مانگو اور اسے یقین دلاؤ کہ تم اس بات سے بہت خوش ہو یہی نہیں تم اس کی شادی سے متعلق ہر بات میں دلچسپی لو' نادر سے ملو' اس کے گھر والوں سے ملو اور سب سے ملتے ہوئے اس بات کا خیال رکھو کہ ہر وقت جو تمہاری شکل پر بارہ بجے رہتے ہیں' اس وقت کو تبدیل کر لو۔ سب یہ نہ سمجھیں کہ تم زبردستی خوش ہو رہی ہو۔''

''اس بات کا وعدہ نہیں کر سکتی میں۔ خوش ہونا میرے اپنے بس میں نہیں ہے۔''

''یہ سب تمہارے بس میں ہے صرف تم خوش ہونا نہیں چاہتیں۔ تم نے وفا کا ایک عجیب سا حصار اپنے گرد کھینچ لیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ جو غیر فطری ہے تم سمجھتی ہو کہ ہنس پڑیں یا خوشی محسوس کی تو یہ تیمور سے بے وفائی ہوئی کیونکہ وہ تکلیف میں ہے۔ یہی بات ہے ناں؟ حالانکہ ہنسنا بولنا' کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا یہ سب فطری تقاضے ہیں۔ چوٹ لگے تو رونا آتا ہے۔ دلچسپ بات پر انسان محظوظ ہوتا ہے' اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ سب انسان کے مزاج کا حصہ ہیں۔ ہاں خود کو زبردستی خوشیوں سے محروم کر دینا' اپنے اوپر پہرے بٹھا لینا یہ بات غیر فطری ہے۔''

میں سر جھکائے سن رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ میں خوش ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں ہنستی تھی تو میرے اندر یہ احساسِ جرم سر اٹھانے لگتا تھا کہ میں تیمور کی تکلیفوں کو فراموش کر رہی تھی۔

اسی لمحے باہر بیل کی آواز آئی۔

''یہ کون آ گیا اس وقت۔'' نیلوفر نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد نبیلہ اور فیصل اندر داخل ہوئے۔ نبیلہ کے چہرے پر واضح طور پر پریشانی تحریر تھی۔ وہ سیدھی میری طرف بڑھی۔

''آئی ایم سوری سجو! مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ پلیز مجھے کچھ کہہ لو مگر مجھ سے یوں ناراض مت ہو۔''

میں آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔

''سوری تو مجھے تم سے کرنی ہے۔ میں کتنی بری ہوں' پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے' میں کیوں کسی کا خیال نہیں رکھتی۔'' میں رونے لگی۔

فیصل کمرے سے باہر نکل گیا۔ کافی دیر بعد میں نارمل ہو گئی۔

''اچھا پلیز اب میرے ساتھ گھر چلو۔'' نبیلہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا۔

میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ فیصل لان میں کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں دروازے میں ہی رک گئی۔

''کیا ہوا؟'' نبیلہ نے پوچھا۔

''بیلا تم خوش تو ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے پاپا کی خاطر یہ رشتہ قبول کیا ہو۔''

''میں بہت خوش ہوں۔ اب تک میں نے اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے کبھی کوئی دعا نہیں مانگی تھی' جب بھی کچھ طلب کیا تھا تو تمہارے اور پاپا کے لیے۔ نادر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اسے اپنے لیے مانگا تھا۔ سب کچھ فراموش کر کے۔ تمہیں اور پاپا کو بھی۔ اس ایک لمحے میں میرے سامنے نادر کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اور دیکھو کیسے لمحوں میں اس نے میری دعا سن لی اور قبول بھی کر لی۔ تم نادر سے ملی نہیں ہو ورنہ تمہیں خود ہی میری خوشی کا اندازہ ہو جاتا۔ وہ بہت ہی اچھا ہے' بہت خیال رکھنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کے ساتھ میں بہت خوش رہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''ان شاء اللہ!'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔

''اب چلیں؟'' اس نے شگفتگی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں مسکرا دی۔

مجھے نبیلہ اور فیصل کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر سب ہی خاموش ہو گئے۔ ان کے خیال میں یقیناً میں بہت بدمزاج تھی لیکن جب اپنے بیڈروم میں جانے کے بجائے میں وہیں لاؤنج میں پاپا کے قریب بیٹھ گئی تو وہی پرانا ہلا گلا لوٹ آیا۔

تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپنے گھر آنے کی دعوت دی گئی' اپنی باتوں میں شامل کیا گیا۔

لیکن یہ حقیقت تھی کہ ان سب کے لیے اب بھی میرے دل میں میل تھا۔ میں اب بھی ان سب کو ہی ممی کی موت کا ذمہ دار سمجھتی تھی اور یہ بات کیسے فراموش کر سکتی تھی کہ ان کے سگے بھائی اور ماں باپ تک جنازے میں شرکت کرنے بھی نہیں آئے۔

یہ باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ نادر نبیلہ کے لیے ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ نیلوفر نے تو اس کی بہت کم تعریف کی تھی۔

''ٹھیک ہے اگر بیلا نے اس کے ساتھ کی دعا مانگی' یہ ہے ہی اتنا اچھا۔'' میں نے سوچا۔

اور جب نبیلہ کچن میں گئی تو میں بھی اس کے پاس چلی آئی۔

''بیلا! بہت تیز ہو تم۔ اسی لیے اب تک اپنی دعاؤں کا اسٹاک بچا رکھا تھا کہ سارا خضوع و خشوع اسی ایک دعا پر صرف کردو اور ساتھ اللہ میاں کو بتا دو کہ دیکھ اللہ میاں اب تک میں نے اپنے لیے تجھ سے کچھ نہیں مانگا' اب مانگا ہے تو دینا لازمی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''قسم سے ایک لمحے میں دعا مانگ لی تھی۔ تو اس قدر خضوع و خشوع تھا اور نہ ایسی دھونس۔ ممکن ہے یہ سب بھی کرتی لیکن وقت نہیں تھا۔ وہ پانی پینے آیا تھا کچن میں اور میری ہنڈیا پہلے ہی جلنے والی تھی۔ لاؤنج سے بھاگ کر یہاں آئی تھی۔ اتنی فارمیلٹیز میں پڑتی تو سالن جل جاتا۔ نادر کی تو خیر تھی' لیکن میری ہونے والی ساس جلا ہوا سالن کھاتیں تو نمبر ضرور کٹتے۔''

''یعنی تم نادر کو پوچھتی ہی نہیں؟'' میں نے شرارت سے پوچھا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ نادر کی اس لیے خیر تھی کیونکہ اسے تو نمکین سالن بھی میٹھا لگنا تھا۔ سو ہنڈیا جلتی یا نہیں' وہ چٹخارے لے کر ہی کھانا کھاتا۔'' وہ پھر ہنسی۔

اس کے ساتھ میں بھی ہنس پڑی۔

کھانے کی میز پر فیصل کی بہن تہمینہ مسلسل مجھے گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کرتی رہی جبکہ میرا اب ایسا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اسے زیادہ لفٹ کرواتی۔ ہاں نادر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ میرا انداز دوستانہ تھا' لیکن باقی سب کے ساتھ ایک فاصلہ ہی رہا۔ یہ میرے بس میں بھی نہیں تھا کہ اس فاصلے کو پاٹتی۔ بار بار میرا ذہن ان محرومیوں کی طرف چلا جاتا تھا جو ممی کے نہ ہونے کے باعث ہمارے اندر گھر کر گئی تھیں۔

''انکل اب تو کوئی مسئلہ نہیں رہا ناں' آپ کہتے تھے کہ تب ہمارے گھر آئیں گے جب سجو راضی ہو گی۔ دیکھیں اتنے دنوں سے ہم ہی یہاں آ رہے ہیں۔ اب پلیز آپ لوگ بھی آئیں بلکہ کل ہی رات کا کھانا ہماری طرف کھائیں۔ ہم بابا جان کو بھی ذہنی طور پر تقریباً تیار کر ہی چکے ہیں۔'' تہمینہ نے کہا۔

''بالکل بھائی صاحب! تہمینہ نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔ کل آپ کو ضرور آنا ہو گا۔'' فیصل کی امی نے کہا پھر میری طرف مڑیں۔

''ٹھیک ہے ناں سجو بیٹا۔''

میں دل پر جبر کر کے مسکرائی۔

''کل کے بارے میں اس وقت کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''اس کی بات چھوڑیں آنٹی! آئے گی کیسے نہیں۔'' نبیلہ نے مداخلت کی۔

میں اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی' جس میں پڑے چاول ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

''سجو! مجھے لگتا ہے کہ تمہاری اسمارٹنس کا راز ہی یہی ہے کہ تم کھانا نہیں کھاتیں۔ کیا ڈائٹنگ کرتی ہو؟'' تہمینہ نے کہا۔

مجھے اس کی باتوں سے اُلجھن ہو رہی تھی۔ اس بات سے اسے کیا سروکار تھا کہ میں ڈائٹنگ کرتی تھی یا نہیں' اور کتنی مقدار میں کھانا کھاتی تھی۔ قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتی۔ لاؤنج میں لگے کلاک نے رات دس بجنے کا اعلان کیا۔ عین اس وقت تیمور کا پتہ کرنے کے لیے فون کیا کرتی تھی۔

''ایکسکیوزمی!'' نیپکن میز پر رکھ کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میری پلیٹ میں کھانا اب بھی ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔

''کیا میری بات سے ناراض ہو گئی؟ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔''

اپنے پیچھے کمرے سے نکلتے میں نے تہمینہ کی آواز سنی۔

☆======☆======☆

فون اُٹھا کر میں اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ دوسری جانب وہی صورتِ حال تھی۔ اب کھانا کھانے کو کیسے دل چاہ سکتا تھا۔

''وہ اتنی شدید تکلیف میں ہے کہ اب میں خود اس کی موت کی دعا مانگنے لگا ہوں اسے یوں تڑپتے دیکھا نہیں جاتا۔ صرف موت ہی اسے اس تکلیف سے نجات دلا سکتی ہے۔ ایسے چند دن جینے کا بھی کیا فائدہ جو اتنی اذیت میں بسر ہوں۔'' اس کے پاپا کے الفاظ میری سماعت میں گونج رہے تھے۔

اور میں بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی کہ اگر میں اس کے قریب ہوتی تو کیا اس کی یہ اذیت دیکھ کر میں بھی یہی دعا مانگتی۔

مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

''کیا اس شخص کے لیے یہ دعا مانگی جا سکتی ہے' جس سے اتنی شدید محبت ہو؟ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی' لیکن کیا میں اسے تکلیف کی شدت سے تڑپتا دیکھ سکتی تھی۔ نہیں' یہ بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ پتا نہیں میں وہاں ہوتی تو کیا کرتی' کہاں سے اتنا حوصلہ لاتی کہ اسے اس حالت میں دیکھ پاتی یا اس کی موت کی دعا کرتی۔ یا اللہ یہ کیسی آزمائش ہے کہ باپ اپنے اکلوتے اور بے حد پیارے بیٹے کی موت کی دعا مانگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔'' میں سوچ رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ انداز نبیلہ کا تھا۔

''یس۔'' میں نے کہا۔

دروازہ کھلا' لیکن نبیلہ اکیلی نہیں تھی' نادر بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں اُٹھ بیٹھی۔

''پلیز! آئیں بیٹھیں۔'' میں نے کہا۔

''ہم جانے ہی والے تھے' سوچا تھوڑی دیر آپ کے ساتھ گپ شپ کرتے جائیں۔'' انہوں نے اپنے خالص انگریزی لہجے میں اُردو بولی۔

''جی ضرور۔'' میں نے بمشکل خیر مقدمی مسکراہٹ ہونٹوں پر چپکائی۔

''تمہارے لیے کھانا لاؤں؟'' نبیلہ نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں تھینک یو' مجھے بھوک نہیں ہے۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک میرے ساتھ بیٹھے رہے۔ الگ بیٹھ کر نادر سے باتیں ہوئیں تو وہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ اچھا لگا۔ وہ اور نبیلہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سے خوش اور مطمئن تھے۔

''اللہ تعالیٰ ان کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے انہیں نظرِ بد سے بچائے اور ہمیشہ یونہی خوش اور مطمئن رکھے آمین۔'' میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔

میں سوچ رہی تھی کہ یہ سب صلہ اللہ تعالیٰ نے نبیلہ کو اس کی محبتوں اور صاف نیت کا دیا تھا۔

سب کو الوداع کہنے میں باہر تک آئی۔ فیصل کی امی نے مجھے خود سے قریب کر لیا۔

''کل ضرور آنا' تم نہ آئیں تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔'' انہوں نے محبت بھری دھونس دی۔

میرے دل میں پھر بھی قربت کا کوئی احساس بیدار نہیں ہوا۔ ہاں جو خوف پہلے ہی کنڈلی مارے بیٹھا تھا اس میں شدت آ گئی۔

میں فیصل سے کسی قسم کا کوئی قریبی تعلق رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے اور تیمور کے بیچ آ جائے۔ میں نے پھر اپنے ارادوں کو مضبوط کیا۔

ان کے جانے کے بعد ہم تینوں لان میں آ بیٹھے۔

''سجو! آپ کو نادر کیسا لگا؟'' پاپا نے پوچھا۔

''پاپا! بہت ہی اچھے' میں تو بے چین ہو رہی ہوں کہ جلدی جلدی بیلا کی شادی ہو۔''

''سب کچھ تو بنا ہی ہوا ہے اور ان لوگوں کو بھی جلدی ہے لیکن بیلا راضی نہیں ہو رہی۔'' انہوں نے کہا۔

''پاپا! میں نے آپ کو وجہ تو بتائی ہے' میں اس موضوع کو ڈسکس نہیں کرنا چاہتی۔''

نبیلہ نے مداخلت کی۔

''کیا وجہ ہے' میں بھی تو سنوں کہ ارسطو یا افلاطون کا کون سا نایاب نکتہ اُٹھایا ہے تم نے۔''

''میں نے کہا ہے ناں کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''جو بات تم پاپا کو بتا سکتی ہو' وہ مجھے کیوں نہیں بتا سکتیں کیوں مجھ سے کچھ شیئر نہیں کرتیں تم۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہاری خوشیوں میں خوش نہیں ہوں گی؟''

''تم ہر بات کا اُلٹا مطلب مت نکالا کرو۔'' وہ جھلاّ اُٹھی۔

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی بات کا اُلٹا مطلب نکالنے کا۔ تم خود مجھ سے کبھی سیدھی بات نہیں کرتیں۔ کچھ شیئر نہیں کرتیں مجھ سے۔'' میں نے منہ پھلا لیا۔

''ارے یہ جھگڑا کیوں ہو گیا۔'' پاپا بولے۔

''اس سے کہیں ناں کہ مجھے بتائے' مجھ سے کیوں چھپاتی ہے یہ باتیں۔ آپ ہی سب کچھ ہیں اس کے لیے تب ہی آپ سے سب باتیں کر لیتی ہے۔ میں کچھ نہیں ہوں اس کی' اس لیے مجھے کچھ نہیں بتاتی۔''

''پاپا! آپ نے خواہ مخواہ یہ ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے منع بھی کیا تھا۔''

''دیکھا پاپا! یہ وقعت ہے اس کی نظر میں میری۔ مجھ سے بھی اس کے سیکرٹ ہیں۔''

''دراصل بیلا آپ کے نقطہ نظر سے مجھے اتفاق نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ بجو بھی اتنی بڑی ہے کہ آپ کو اسے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے۔''

''حد ہو گئی پاپا میں موضوع ختم کرنا چاہتی ہوں۔ آپ ڈسکس کرنے پر مصر ہیں۔ اگر میں ایسا چاہتی ہوں تو کوئی وجہ ہے اس کی۔'' نبیلہ کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

''پاپا بتائیں کیا بات ہے؟'' اب تو میں بھی ٹلنے والی نہیں تھی۔

''بیلا کا کہنا ہے کہ جب تک آپ لائف میں سیٹل نہیں ہو جاتیں' تب تک یہ شادی نہیں کرے گی۔'' پاپا نے کہا۔

چند لمحوں کے لیے میں تو بول ہی نہ سکی۔ سب سے پہلے منفی خیالات نے ہی میرے ذہن پر دھاوا بولا۔

''یہ کیوں قربانی کی دیوی بننا چاہتی ہے صرف اس لیے کہ سب کی واہ واہ سمیٹے۔ مجھے

کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کی ہمدردی کی' مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں کسی کو۔ لائف میں سیٹل ہونا کیا معنی؟ کیا میں بے آرام اور بے یار و مددگار کسی سڑک پر پڑی ہوئی بھیک مانگ رہی ہوں۔ سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتی کہ تیمور کے مرنے کا انتظار کر رہی ہے تاکہ شادی میں ہلا گلا کیا جا سکے۔''

یہ فقط ایک لمحے کی سوچ تھی۔

دوسرا لمحہ ندامت کا تھا۔

''اوہ خدایا کیا ہو گیا ہے مجھے' میں کیوں اس طرح سوچنے لگی ہوں۔ بیلا کی محبت کو بھی اس کی خود غرضی سمجھنے لگی ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں خود' خود غرض ہو گئی ہوں۔ اپنے علاوہ کچھ نہیں سُوجھتا مجھے' وہ اپنی خوشیاں تج کر میری خوشیاں کھوجتی ہے اور میں جواب میں اسے کیا دیتی ہوں؟''

''بیلا۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''کچھ لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں جن کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا ہے' دینے والا اور کچھ میرے جیسے ہوتے ہیں' جن کا ہاتھ سدا نیچے رہتا ہے' لینے والا۔ پہلے ہی تمہاری محبتوں کا اتنا قرض ہے مجھ پر کہ میں کبھی چکا نہیں سکتی۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہنا چاہا۔

لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں بیلا پلیز' مجھے کہنے دو۔ اپنی ساری زندگی کو ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے لوگوں میں بانٹتی رہی تو خود تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اچھا ہوتا ہے اگر کبھی کبھار انسان صرف اپنے لیے بھی سوچے۔

اور دیکھو میں تو سیٹل ہوں۔ میرے پاس پاپا ہیں' میں تمہاری طرح بہت سی ذمہ داریاں تو نہیں نبھا سکوں گی' لیکن تھوڑا بہت چلا ہی لوں گی۔ مثلاً دیکھو'' میں نے بات کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ ''کپڑے ملازمہ دھوئے گی میں پہن لوں گی' صفائی ملازمہ کرے گی میں گھر میں رہ لوں گی' کھانا وہ پکائے گی میں کھا لوں گی' ظاہر ہے یہ ایسا مشکل کام تو ہے نہیں' جو نہ کیا جا سکے۔''

پاپا اور بیلا دونوں ہنس پڑے۔

''اور پاپا تمہیں آئس کریم پارلر لے جائیں گے۔ تم آئس کریم کھا لو گی' جم خانہ لے

جائیں گے تو تم بیڈمنٹن کھیل لو گی' فرو کی طرف لے جائیں گے اور تم گوسپ کر لو گی۔'' نبیلہ نے اضافہ کیا۔

''بالکل درست اور تم لندن سے میرے لیے سوئٹریں بھجوا دو گی تو میں وہ پہن لوں گی' بگ بین بھجواؤ گی تو میں اپنی ریسٹ واچ ملا لوں گی' ٹین ڈاؤننگ اسٹریٹ بھجوا دو گی تو میں اس میں رہائش اختیار کر لوں گی۔ یہ سب کون سا مشکل کام ہے۔''

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اور تیمور سے بچھڑنے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ ہنس دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اسے بھول گئی یا اس کی محبت کو فراموش کر دیا۔ ہنسنا ایک فطری امر ہے اور دلچسپ باتوں پر ہنس لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انسان کو زندہ رہنا ہو تو ان چھوٹے چھوٹے سہاروں کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ نہ رہیں تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔

☆======☆======☆

رات کو جب نبیلہ اپنی خواب گاہ میں جانے لگی' تو میں نے اسے آواز دی۔

''ہوں' کیا بات ہے؟'' وہ میری طرف پلٹی۔

''یہ طے ہے کہ تم اسی وقت شادی کرو گی' جس وقت کے لیے تمہارے سسرال والے اصرار کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس بارے میری نادر سے بات ہو گئی ہے۔ ہم دونوں نے باہمی رضامندی سے طے کر لیا ہے کہ شادی چھ سے آٹھ مہینے بعد ہو گی۔ اب تم اس موضوع پر مزید مت سوچو۔ ظاہر ہے جسے میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے منہ سے مانگا ہے اسے میں بھی گنواؤں گی نہیں۔ بس میں گھر حالات سیٹ کر کے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ پھر چند قدم آگے بڑھ کر اس نے میرے گال پر پیار کیا اور بولی ''گڈ نائٹ۔''

میں اسے دیکھتی رہی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو میں بھی اپنے بیڈروم میں چلی آئی۔

پاپا نے اس روز ٹھیک کہا تھا' وہ بہت دور تک دیکھ رہے تھے۔

میں نے اپنی گھڑی کلائی سے اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اور بالوں کا برش اُٹھا لیا۔

صبح سے ہی نبیلہ کو فکر تھی کہ شام کو ڈنر پر جاتے ہوئے کیا کپڑے پہنے جائیں۔

''تم کیوں فکرمند ہو' کون سا بالکل ڈائریکٹ تمہارا سسرال بنتا ہے۔'' میں نے اسے چھیڑا۔

''نادر بھی تو ہو گا۔'' وہ ہنسی۔

''ہاں پھر تمہاری فکر جائز ہے۔ ویسے بیلا منگنی کروانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا۔

''کیا فائدہ؟''

''ہیرے کی انگوٹھی ملے گی۔ اگر تمہاری ہونے والی ساس ہیرے کی چار انگوٹھیاں پہن کر خوب ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر سکتی ہیں تو ایک انگوٹھی تو تمہارا حق بھی بنتا چاہیے۔''

''ہاں اس زاویے سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' وہ ہنسی۔

''اس قسم کے کاموں میں میرے زرخیز ذہن سے مدد لیا کرو بلکہ میں تو وہ ترکیب بھی بتا دوں گی کہ کیسے بڑی اماں کی انگلیوں سے بھی سب انگوٹھیاں پار کر لو۔''

''اچھا ان ترکیبوں سے بعد میں مستفید ہوں گی' پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا پہن رہی ہو۔''

''میرا ارادہ نہیں ہے جانے کا' میں کمپیوٹر پر کچھ کام کروں گی۔''

''اس بارے میں تمہارے ارادے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تمہیں جانا ہے' اگر میری اور میری بات کی ذرا سی بھی اہمیت ہے تمہاری نظر میں تو تم انکار نہیں کرو گی۔ میں نے آنٹی اور ماموں سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں لے کر آؤں گی اور کچھ نہیں تو میری عزت کی خاطر ساتھ چلو۔''

☆======☆======☆

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے وہاں جانا پڑا۔ شاہ جمال میں واقع اس وسیع و عریض گھر میں جیسے جشن کا سماں تھا۔ ہماری آمد سے قبل ہی باقی ماموں اور ان کی تمام ترفیملیز وہاں آ چکی تھیں۔

شادی شدہ کزنز کے بچے اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ فیصل کے بھی بڑے بھائی اور بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ جبکہ تہمینہ کی منگنی ہو چکی تھی۔ اتنے لوگوں اور اُچھلتے کودتے بچوں کی موجودگی میں گھر بھرا بھرا سا لگ رہا تھا۔ ہمارا استقبال یوں کیا گیا جیسے تاج برطانیہ ہمارے پاس ہو۔ وہ بھی کوہِ نور ہیرا جڑا ہوا۔ اتنی پذیرائی دیکھ کر مجھے عجیب اُلجھن سی

ہونے لگی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں نکل بھاگوں۔

''میں نے اتنی دعائیں مانگی تھیں کہ تم آ جاؤ۔'' تہمینہ میرے قریب آ بیٹھی۔

''بیلا نے زور دیا اس لیے آنا پڑا ورنہ مجھے کافی کام تھا۔'' گو کہ ایسے بات کرنا بدتمیزی کے زمرے میں آتا ہے' لیکن میں نے اسے جتانا ضروری سمجھا۔ یہاں تک آتے ہوئے یہ خیال میرے ذہن کے ساتھ چپکا ہوا تھا کہ مجھے ان کے ساتھ قرب کا کوئی تعلق گوارا نہیں تھا۔

لمحہ بھر کو اس کا چہرہ پھیکا پڑا لیکن پھر وہ ہنس دی۔ ''چلو کسی بہانے سہی تم آئیں تو۔''

پھر وہ دوڑتے بھاگتے اور گود میں پڑے بچوں کے بارے میں مجھے بتانے لگی کہ کون کس کی اولاد تھا۔ ان بچوں کو دیکھ کر میرے اندر خلا سا پھیلنے لگا۔

''کاش! میری بھی کوئی اولاد ہوتی۔'' دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ زندگی کی کتنی بڑی خواہش حسرت بن گئی تھی۔ تنہائی کا احساس مزید گہرا ہو گیا تھا۔

''یہ میرا بھانجا ہے مہدی۔ دیکھو کتنا پیارا ہے' ہے ناں۔'' اس نے چند ماہ کا بچہ میری گود میں دے دیا۔

وہ واقعی اتنا پیارا تھا کہ بے اختیار میں نے اسے چوم لیا۔

''اللہ تعالیٰ ان سب بچوں کو سلامت رکھے۔'' میرے دل سے دعا نکلی۔

پھر میں نے نبیلہ کو متوجہ کیا۔ ''دیکھو بیلا! یہ کتنا پیارا ہے۔''

''ہاں' میں نے دیکھا ہے' فیصل کا بھانجا ہے ناں مہدی۔'' وہ بولی۔

''بچے کتنے پیارے ہوتے ہیں بیلا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں حسرت اتر آئی۔

''ہاں۔''

میں نے بچہ واپس تہمینہ کو پکڑا دیا۔ وہ اپنی بہن کے حوالے کر کے پھر میرے قریب آ بیٹھی۔

''ہم نے بابا جان کو آپ لوگوں کے متعلق بتا دیا ہے۔ حالانکہ کتنے دن تک انہیں ذہنی طور پر تیار کرتے رہے' پھر بھی ان کا زخم نئے سرے سے تازہ ہو گیا۔ وہ کبھی نہیں بھول سکے پھوپھو کو اور جب فیصل نے انہیں بتایا کہ تمہاری شکل پھوپھو سے ملتی ہے' تب سے ان کی عجیب حالت ہے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح تم سے مل لیں۔ شام کا انتظار کرنا مشکل تھا

ان سے پھر ڈیڈی نے انہیں سُلا دیا۔ ابھی سوئے ہی ہوئے ہیں۔''

ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے کسی کام سے تہمینہ اٹھی۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ میری جانب کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ یہ غیر مہذب حرکت تو تھی' لیکن میں کسی کو بتائے بغیر گھر کے اندر چلی آئی۔ باہر عجیب اُلجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔

گھر کی تمام تر رونق اور گہما گہمی باہر تھی۔ اندر خاموشی اور سکون تھا۔ کچھ نوکر تھے جو کام سے ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ میں بلاوجہ گھر میں جھانکنے لگی۔ پورا گھر بہت ہی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا اور مکینوں کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔

گھومتے پھرتے مجھے اندازہ ہوا کہ مکان کے چار پورشن تھے۔ ایک حد تک ایک دوسرے سے الگ اور ایک حد تک منسلک۔ چاروں پورشنز میں ہی رہائش کے آثار تھے۔ سب سے آخر میں' میں جس پورشن میں پہنچی' وہاں باقی گھر کی نسبت زیادہ سناٹے کا راج تھا۔ بڑے سے لیونگ روم میں ٹھٹک کر رک گئی۔ سامنے دیوار پر ممی کی بڑی سی پورٹریٹ فوٹو گراف لگی ہوئی تھی۔ میں نے ممی کی بہت سی تصویریں دیکھی ہوئی تھیں۔ خود ہمارے گھر میں بھی جگہ جگہ ان کی تصویریں لگی ہوئی تھیں' لیکن اتنی خوبصورت اور اتنی بڑی کوئی تصویر نہیں تھی۔ میں دم بخود سی اُسے دیکھے گئی۔

''اس میں شک نہیں کہ میری ممی کے ساتھ مشابہت ہے' لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ممی کے حسن کا دس فیصد بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کتنی خوبصورت تھیں ممی اور پاپا کہتے تھے کہ جتنی خوبصورت تھیں۔ اتنی ہی خوب سیرت بھی تھیں۔ اللہ میاں بھی اچھے لوگوں کو جلدی اپنے پاس بلا لیتا ہے کاش میں نے ممی کو دیکھا ہوتا' ان کے خوبصورت ہاتھوں نے میرے بال سنوارے ہوتے' مجھے کھلایا ہوتا۔''

''کون ہے؟''

بھاری مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ایک دم میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ میں جانتی نہیں تھی' انہیں دیکھا بھی کبھی نہیں تھا' پھر بھی ایک لمحے میں پتا چل گیا تھا کہ وہ بابا جان تھے۔

اُن کا چہرہ روشن اور نورانی تھا۔ اتنی عمر کے باوجود وہ بغیر سہارے کے کھڑے تھے۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اُن کی حالت عجیب ہو گئی۔ کبھی وہ میری جانب دیکھتے اور کبھی ممی کی تصویر کی طرف۔

''رعنا' رعنا! میری بیٹی۔'' انہوں نے اپنے بازو وا کر دیے۔

میرے دل میں کتنے شکوے تھے۔ میں انہیں اپنانے یا ان سے کوئی رشتہ قائم کرنے کے حق میں نہیں تھی لیکن اس لمحے نہ جانے کیا ہوا۔ بھاگ کر میں ان کے سینے سے لگ گئی۔ ہماری آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کا کوئی حساب نہیں تھا۔

''کہاں چلی گئی تھیں میری بیٹی' اپنے بابا جان کا بھی خیال نہیں آیا۔ کبھی تو پلٹ کر دیکھا ہوتا۔ کبھی تو اپنی صورت دکھائی ہوتی۔ کیا اتنا بھی میرا حق نہیں تھا کہ تمہیں ڈانٹ دیتا۔ کتنی آسانی سے تم نے میری محبتیں' میری شفقتیں بھلا دیں۔ جو یاد رکھنا چاہیے تھا' وہ بھلا دیا' جو بھلا دینا چاہیے تھا اُسے یاد رکھا۔ تمہارے غم میں تمہاری ماں بھی ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ کہاں سے میں وہ وقت واپس لاؤں؟''

بابا جان کی آغوش میں کتنا تحفظ تھا' کتنی محبت تھی' کتنی دیر ہم یونہی کھڑے آنسو بہاتے رہے۔

انہیں احساس ہوا کہ میں ان کی بیٹی گل رعنا نہیں تھی۔

''تم بجیلہ ہو؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میری بیٹی' میری رعنا کی نشانی۔'' انہوں نے میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''ادھر میری خواب گاہ میں آجاؤ۔''

اُن کی وسیع و عریض خواب گاہ میں بھی ممی کی بہت سی تصاویر تھیں۔ میں صوفے پر اُن کے قریب بیٹھ گئی۔

''مجھے لگا میری بیٹی زندہ ہو کر آگئی ہے۔ بالکل تم ہی جیسی تھی۔'' اُن کی نگاہیں میرے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

میرے ہونٹوں سے آہ سی نکلی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ لبوں پر آگیا۔

''وہ اتنی پیاری تھیں تو آپ نے ان کو اتنا دکھ کیوں دیا۔ اب پچھتانے سے وہ واپس تو نہیں آجائیں گی۔''

''حقیقت وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ تب لگتا تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں' وہ بالکل درست ہے' اس سے ہٹ کر کہیں کوئی سچ نہیں ہے۔ خاندان بھر کی مخالفت مول لے کر میں نے تمہاری ماں کو پڑھایا لکھایا۔ میں سب کو بتا دینا چاہتا تھا کہ تعلیم انسان میں شعور بید

اکرتی ہے۔ میری بیٹی ایک سلجھی ہوئی تعلیم یافتہ لڑکی کی صورت میں خاندان بھر میں نمایاں ہو گی۔ سب سے مختلف' سب سے بہتر۔ میں چاہتا تھا کہ اسے زندگی کی تکلیفوں سے نبرد آزما ہونے کا سلیقہ آجائے۔ ہمارے خاندان میں سمجھا جاتا تھا کہ تعلیم عورت سے فرمانبرداری اور حیا چھین لیتی ہے۔ میں اس خیال کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا۔

خاندان کی روایتوں سے بغاوت کر کے میں نے گل رعنا کو بہترین تعلیم دلوائی۔ میری اکلوتی بیٹی میرا فخر اور میرا مان تھی۔ میں نے اسے بیٹوں سے بھی بڑھ کر محبت دی۔ اس پر کبھی بے جا پابندی عاید نہیں کی۔ موسیقی جسے ہمارے خاندان میں حرام سمجھا جاتا تھا' اس کی خواہش پر اس کے سکھانے کا بندوبست کیا۔ اس کے شاعرانہ ذوق کے پیش نظر اس کی لائبریری اُردو اور انگریزی شاعری کی کتابوں سے بھر دی۔ اس نے کالج کے اسٹیج پر اداکاری کرنے کی اجازت مانگی' میں نے بلا تامل دے دی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی کوئی ایسا قدم کبھی نہیں اٹھائے گی' جس سے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔

لیکن جس روز میں نے اُسے بتایا کہ اس کا رشتہ طے کر دیا گیا ہے تو اس کی آنکھوں میں اُبھرنے والی بے یقینی اور احتجاج دیکھ کر میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے لیٹ ڈاؤن کرے گی۔ وہ بہت محبت کرنے والی تھی۔ اُس نے کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ کبھی کسی مقام پر اُسے ٹوکنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور مجھے اس بات پر فخر تھا کہ تعلیم نے بھی اس سے اس کی فرمانبرداری نہیں چھینی تھی۔

آج جب میں اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میرے نزدیک فرمانبرداری کا کیا مفہوم تھا یہ کہ میں اسے گائے بکری کی طرح جدھر چاہتا ہانک دیتا۔ ہاں میرے نزدیک فرمانبرداری کا یہی مفہوم تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے جو ہر مقام پر اپنی بیٹی کے لیے پورے خاندان سے ٹکر لی' ہر مقام پر اس کا ساتھ دیا تو اس کے جواب میں میرا حق تھا کہ اس کی زندگی کے فیصلے میں ہی کرتا اور اس کا فرض تھا کہ میرے کہے ہر حرف پر سر جھکا کر میری محبت اور محنت کا صلہ دیتی۔

میں نے اسے تعلیم دلوائی تھی کہ اس میں شعور بیدار ہو' سمجھ بوجھ پیدا ہو' وہ اچھے برے کا فیصلہ کر سکے اور ایک بہتر زندگی گزار سکے۔ میں نے اسے فائٹ کرنا سکھایا تھا مگر ایک بات میں بھول گیا تھا۔ ذہین تعلیم یافتہ افراد ایک حد تک بہت حساس ہوتے ہیں۔ انسانوں اور

جانوروں کے درمیان صرف ایک فرق ہوتا ہے۔ نطق کا' ورنہ دونوں ہی حیوان ہیں' لیکن افسوس کہ ہم اپنے اوپر انحصار کرنے والے انسانوں کو یہ حق دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ اپنی پسند کے علاوہ ان کی زبان سے نکلنے والا ایک لفظ سننا بھی ہمیں گوارا نہیں ہوتا' اس لیے کہ غصے سے' سختی سے' زور زبردستی سے ہم ان کی زبان بند کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جب ایک انسان کے لیے زبان بندی کا حکم نامہ جاری ہو جائے تو اس میں اور کسی بھیڑ بکری میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اسی کو ہم فرمانبرداری سمجھتے ہیں اور حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔

سو جب رعنا نے احتجاج کیا تو میری اَنا پر بہت شدید ضرب لگی۔ میں نے اسے سب کچھ دیا تھا' لیکن فیصلہ کرنے کا حق اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں نے خاندان کی ہر روایت سے ٹکر لی تھی کیونکہ میں ان سب کو غلط سمجھتا تھا' لیکن یہ خیال بھولے سے بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ کہیں کسی جگہ میری اولاد بھی کسی ایسی روایت سے ٹکر لے سکتی ہے جو میرے نزدیک درست تھی اور جسے وہ غلط سمجھ سکتے تھے۔

اپنے بیٹوں کی شادیاں میں نے اپنی پسند سے اپنے خاندان میں ہی کیں۔ ان میں سے کسی نے میری پسند اور میرے فیصلے سے انحراف نہیں کیا۔ میری سب بہوئیں اَن پڑھ تھیں اور گھٹے ہوئے ماحول سے آئی تھیں۔ میں نے بیٹوں سے کہا کہ وہ ان سے تعاون کریں اور انہیں اپنے ماحول میں ڈھالیں۔ خود میں نے اس بات کا خیال رکھا اور وہ بھی بہت اچھی اور محبت کرنے والی بہوئیں' بیویاں اور مائیں ثابت ہوئیں۔ ایسے میں میرے ذہن میں کب یہ خیال آ سکتا تھا کہ میری بیٹی میرے کسی فیصلے کے خلاف احتجاج کر سکتی تھی۔

اپنی طرف سے میں نے اس کے لیے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ خاندان سے باہر رشتہ طے کرنے میں کوئی عقل مندی تھی۔ خاندان میں سب مل کر کسی کا گریبان بھی پکڑ سکتے ہیں۔ باہر کہیں میری بیٹی کو کوئی تکلیف پہنچی تو ہمارا سارا خاندان مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جس شخص کو میں نے رعنا کے لیے منتخب کیا تھا وہ ایگری کلچر میں ماسٹرز کر چکا تھا۔ ذہنیت کچھ زمینداروں والی تھی' لیکن میرا خیال تھا کہ رعنا کی تعلیم و تربیت ضرور اس کے کام آئے گی۔ خاندان میں اس سے بہتر رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ رعنا نے اس احتجاج میں بھی شائستگی اور حفظ مراتب کو ملحوظ رکھا۔ اول تو میں رشتہ طے کر چکا تھا اور زبان سے پھرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پھر جس شخص کو اس نے منتخب

کیا تھا' اس کے بارے میں بھی تحقیق پر کچھ اچھی رپورٹ سامنے نہیں آئی۔ تمہارے پاپا ابھی دنوں ماسٹرز کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے۔ اور ان کے مستقبل کے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ ان کا گھرانہ کسی صورت بھی اس لائق نہیں تھا کہ وہاں رعنا کی شادی کی جا سکتی۔ پھر جس انداز سے انہوں نے رشتہ کی بات کی وہ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ شریفوں کے گھروں میں طریقے اور سلیقے سے پیغام بھجوایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شخص منہ اُٹھا کر رشتہ مانگنے چلا آئے۔ اقرار کی تو پہلے بھی کوئی صورت نہیں تھی' لیکن میں نے رعنا کو سمجھانے کی خاطر آخری قطعی اور حتمی انکار کر دیا۔

یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رعنا اتنا بڑا قدم اٹھا لے گی اور اس کے فیصلے سے میرے دل پر کیا گزری۔ یہ کون جان سکتا ہے اور اس کی ماں تو اس صدمے کے باعث بستر سے جا لگی۔''

وہ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔

''میں سمجھتا تھا کہ شادی بیاہ کے بارے میں صرف والدین ہی درست فیصلہ کر سکتے ہیں' لیکن بعد میں جب کبھی میں نے اس شخص کی خانگی زندگی کا جائزہ لیا' جسے رعنا کے لیے منتخب کیا تھا تو یہ احساس شدید ہوتا گیا کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ میری بیٹی جیسی نفیس' حساس اور خوش ذوق لڑکی کے لیے وہ حویلی ایسا قید خانہ ثابت ہوتی' جس میں رہتے ہوئے وہ روشنی اور ہوا کے لیے بھی ترس جاتی۔ اس کی حالت پھانسی کی سزا کا انتظار کرنے والے قیدی جیسی ہوتی۔ اور جب یہ ملال شدید ہو گیا اور میں نے چاہا کہ میں اپنی بیٹی کو پھر اپنی زندگی میں شامل کر لوں تو خبر آئی کہ اس نے ہمیشہ کے لیے ہم سے ناتا توڑ لیا ہے۔''

یہ وہ مقام تھا جہاں میں اپنی تلخی کبھی نہیں چھپا سکتی تھی۔

''آپ لوگوں اور پاپا کے رشتہ داروں کی باتوں نے انہیں ختم کیا۔ آپ کا کیا گیا' آپ کے سامنے آپ کے چاروں بیٹے ہیں' خوش اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ دکھ تو ہم نے اُٹھائے ہیں۔ جب اسکول بھجوانے سے پہلے پاپا میرے بالوں میں بُرش کر کے پونیاں بناتے تھے تو میں سوچتی تھی کہ یہ کام تو مائیں کرتی ہیں۔ میری سب سہیلیاں تو یہی بتاتی ہیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ یہ حیرت حسرت بن گئی۔ صرف ہم بہنوں کی خاطر پاپا نے اپنی سوشل لائف ختم کر دی تھی' آفس سے آنے کے بعد وہ اپنا تمام تر وقت ہمیں دیا کرتے تھے۔ یہاں

تک کہ ہماری خاطر گڑیوں کے گھر بھی سجاتے تھے۔

لیکن بیٹیوں کی زندگی میں کچھ مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں انہیں صرف ماں کی ضرورت ہوتی ہے اور پاپا ہمارے لیے کچھ بھی کر لیتے وہ باپ ہی تھے۔ آپ لوگوں کی زہر آلود زبانوں نے ہماری ماں ہم سے چھین لی تھی۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ کو ملال تھا' کیسا ملال تھا آپ کا کہ بیٹی کے جنازے پر آپ کی آمد کا انتظار ہوتا رہا اور آپ کو کندھا دینے بھی نہیں آئے۔ میری ممی کا ایسا قصور تو نہیں تھا کہ وہ اس حق سے محروم کر دی جاتیں۔'' میں رو پڑی۔

بابا جان کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے۔ انہوں نے مجھے اپنے سے قریب کر لیا۔

''وہ خبر سن کر ہم اپنے آپ میں کب رہے تھے۔ تمہاری نانی تو ایک صدمے سے ہی نہیں سنبھل سکی تھیں۔ اس دوسرے صدمے نے ان کی جان لے لی۔ ہم تو ختم ہو کر رہ گئے۔ کراچی اتنا دور بھی نہیں کہ ہم وقت پر نہ پہنچ سکتے' لیکن اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ یہاں تمہاری نانی کی میت رکھی تھی اور وہاں تمہاری ماں کی۔ وہاں جا کر کیا کرتے اب۔ ہم نے تو اسے اس کی زندگی میں ہی کھو دیا تھا۔''

میں گنگ ہو کر ان کے بوڑھے چہرے کی طرف دیکھتی رہی جہاں دکھوں کی خزاں چھائی ہوئی تھی۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ میری بیٹی کی اتنی پیاری نشانیاں ہیں۔'' وہ بولے۔

ان کی باتیں سن کر میرے تمام شکوے ڈھل گئے۔ جو کچھ بیتا اس میں میرے نزدیک نہ ممی غلط تھیں اور نہ بابا جان۔ دونوں نے اپنے طور پر ایک بہتر فیصلہ کیا تھا۔ ہم اپنے طور پر کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔

''بابا جان!'' میں نے محبت سے انہیں مخاطب کیا۔ ''فیصلہ کسی سے بھی غلط ہو سکتا ہے اور یہ کسے علم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ یہ علم تو بس اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ اسی لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ فیصلہ درست ہوا یا غلط۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ بس انسان کی نیت صاف ہونی چاہیے کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔''

یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اگر ممی کے والدین اور بھائی ان کے جنازے پر نہیں آئے تھے تو اس کی کوئی وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ بس ایک شکوہ تھا جو دل میں گھر کر گیا تھا۔ آج یہ

شکوہ بھی نہیں رہا۔

''مجھے فیصل نے اتنا بتایا تھا کہ رعنا کی ایک بیٹی بالکل رعنا جیسی ہے اور کچھ نہیں بتایا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ آپ ملیں تو خود ہی سب کچھ پوچھ لینا۔ نبیلہ کا تو بتا دیا' لیکن جمیلہ کا کچھ نہیں بتایا اور ہاں نبیلہ کہاں ہے؟''

''وہ باہر ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ اب وہ بہو بن کر ہمارے پاس آ جائے گی۔ میں نادر سے کہوں گا کہ لندن جانے سے پہلے کچھ دن وہ نبیلہ کے ساتھ اسی گھر میں ٹھہرے۔ میں نے رعنا کو دلہن بنے نہیں دیکھا' جتنی خوشیاں اور ارمان تھے سب دل میں رہ گئے۔'' اُن کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

میں خاموش رہی۔ جانتی تھی کہ اولاد کے حوالے سے ملنے والے دکھ والدین کو کس طرح ختم کر دیتے ہیں۔ میرے اپنے پاپا کی مثال میرے سامنے تھی۔ کتنے عرصے بعد آج میں نے انہیں خوش دیکھا تھا۔ کم از کم نبیلہ کی طرف سے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

''اب اپنے بارے میں بتاؤ کہ کیا کرتی ہو؟'' بابا جان نے پوچھا۔

''میں؟ بس کچھ نہیں۔'' میں سمجھ نہ پائی کہ انہیں کیا بتاؤں۔

''ارے کچھ بھی کیوں نہیں؟ رعنا تو کبھی فارغ نہیں بیٹھتی تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ یہ بتاؤ کتنا پڑھا ہے؟''

''گریجویشن کی ہے این سی اے سے۔'' میں نے کہا۔

اُن کے چہرے پر خوشی کا تاثر پھیل گیا۔

''پتا ہے رعنا بھی پینٹنگ کیا کرتی تھی۔ اس میں خداداد صلاحیت تھی جب چھوٹی سی تھی تو اُس نے فرمائش کی تھی اور میں نے اسے ڈھیروں رنگین پنسلیں اور Craons لے کر دیئے تھے۔ تب ابھی وہ اسکول بھی نہیں جاتی تھی۔ اپنے دن کا بیشتر حصہ تصویریں بنانے میں گزار دیتی تھی۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی تصویریں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں' تمہیں دکھاؤں گا۔''

میں اُن کے چہرے پر پھیلی بچوں جیسی خوشی دیکھتی رہی۔

''کہیں منگنی تو نہیں ہوئی تمہاری؟'' تھوڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ تیمور کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

''میری شادی ہو چکی ہے۔'' میں نے آہستہ سے بتایا۔

''اچھا۔'' انہیں تعجب ہوا اور خوشی بھی۔

''تمہیں دیکھ کر مجھے یہ خیال تو آیا ہی نہیں' شوہر کہاں ہیں تمہارے' انہیں ساتھ کیوں نہیں لائیں؟ بچے ہیں یا نہیں؟ فیصل نے تو مجھے بتایا ہی نہیں اور کسی نے بھی اس بارے میں نہیں بتایا۔ بہت بے وقوف لوگ ہیں یہ۔ تمہارے سسرال والوں کو بھی تو انہیں بلانا چاہیے تھا ڈنر پر۔''

میری آنکھیں جھلملانے لگیں۔ بہت دقت ہو رہی تھی خود پر قابو پانے میں۔ یہ آنسو ان سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکے۔

''کیا ہوا جمیلہ؟'' یوں لگا جیسے ان کا دل ڈوبنے لگا ہو۔

''کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے' مجھے لگ رہا ہے جیسے میری رعنا رو رہی ہو' اسے کچھ ہوا ہو۔'' وہ بولے۔

اتنا تو انہیں احساس ہو چکا تھا کہ وجہ جو بھی تھی اس کا تعلق میری شادی کے ساتھ تھا۔

''بیٹا کیا ہوا؟'' وہ بمشکل پوچھ سکے۔

میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اب تک تیمور کے خیال نے مجھے کتنا رلایا تھا' پھر بھی آنسو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ میرے فقرے بے ربط تھے پھر بھی میں نے سب کچھ کہہ سنایا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ سب کو اپنے غم میں شریک کر لوں۔ زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ بھی ہے میرے آنسوؤں میں شریک ہو جائے۔ نیلوفر شاید ٹھیک ہی کہتی تھی کہ میں خود ترسی میں مبتلا تھی' لیکن پوری کوشش کے باوجود بھی میں اس سے باہر نہیں نکل پائی تھی۔ خود سے وعدے کرتی تھی' تہیہ کرتی تھی اور پھر ہار جاتی تھی۔ اپنی اس کمزوری سے میں خود نالاں تھی۔ مگر پوری کوشش کے باوجود بے اختیار ہو جاتی تھی۔

بابا جان کے سینے میں جیسے کسی نے خنجر پیوست کر دیا ہو۔ دکھ کے مارے ان کے منہ سے الفاظ تک نہیں نکل رہے تھے۔ چند لمحے وہ میری جانب دیکھتے رہے' پھر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

ایک مرتبہ پھر شکوہ میرے ہونٹوں تک آ گیا۔

''نانی اماں نے ممی کو بد دعا دی تھی ناں۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے' پہلے نبیلہ کو دکھ اٹھانے پڑے اور اب میں اٹھا رہی ہوں۔ شکر ہے ممی نہیں ہیں ہمارے یہ دکھ دیکھنے کے لیے ورنہ ان کے دل پر بھی وہی بیتتی جو پاپا کے دل پر بیت رہی ہے۔''

انہوں نے میرے ماتھے پر بوسا دیا۔

''نہیں بیٹا نہیں' ماں باپ کب اپنی اولاد کو بد دعا دے سکتے ہیں۔''

''انہوں نے تو دی تھی' دادی اماں نے بھی دی تھی۔'' میں مصر تھی۔

اس سے قبل کہ وہ کچھ کہہ سکتے' خواب گاہ کا دروازہ کھول کر فیصل اندر چلا آیا۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

''آپ یہاں آنسو بہانے کا شغل کر رہی ہیں اور باہر کب سے آپ کی تلاش جاری ہے۔ یہاں تک کہ میں ہمایوں کے گھر سے بھی ہو آیا کہ شاید کوئی دماغی لہر آپ کو وہاں لے گئی ہو۔''

پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں ہر ایک کے سامنے آنسو بہا سکتی تھی اور بہایا کرتی تھی سوائے فیصل کے۔ نہ جانے کیوں میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ میں تو اس سے کسی قسم کا تعلق واسطہ رکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے اور اس کی بات سن کر میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''میں باہر بیلا اور انکل کو تسلی دے آؤں۔'' فیصل نے کہا اور واپس مڑ گیا۔

''فیصل۔'' بابا جان نے اسے پکارا۔ ''نبیلہ اور اپنے انکل کو یہیں لے آنا۔''

وہ لمحے جو بہت خوبصورت تھے جب سب اکٹھے تھے۔ بس وہ ایک عجیب سا خلا تھا۔ جو میرے اندر گھر کر چکا تھا۔

''تیمور بھی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔'' میں سوچ رہی تھی۔

اور یہ تنہائی تو میرے ساتھ تھی' ہر جگہ' ہر مقام پر۔

''آپ اتنی خاموش خاموش کیوں رہتی ہیں؟'' تہمینہ اچانک پوچھتی۔

اور میں مسکرا دیتی۔ ''میں سب کی باتیں سن رہی ہوں۔''

''آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔'' کھانے کے دوران وہ بار بار مختلف ڈشز میری

جانب بڑھاتی رہی۔

وہی نہیں، سب ہی ہم سے انتہائی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ پھر فیصل تھا جو مجھ سے دور رہا لیکن میری جانب ہی متوجہ تھا۔

باتیں تھیں کتنی ڈھیر ساری، نہ ختم ہونے والی۔ تقریباً سوا دو ڈھائی بجے کے قریب ہم گھر جانے کے لیے نکلے۔

''آپ کے ساتھ ڈرائیور نہیں ہے؟'' فیصل کی امی نے پوچھا۔

''نہیں کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔'' نبیلہ نے کہا۔

''تو اب کون ڈرائیو کرے گا؟'' نادر نے پوچھا۔

''سجو ہی کرے گی، میں تو رات کو ڈرائیونگ نہیں کرتی اور پاپا کو بھی ڈاکٹر نے منع کیا ہوا ہے۔''

''نہ بیٹا! اتنی رات گئے اکیلی بچی کیسے ڈرائیو کر سکے گی۔'' فیصل کی امی بولیں۔

''میں کرتی رہتی ہوں، عادت ہے مجھے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔'' میں نے انہیں تسلی دینا چاہی۔

کوئی بھی اس بات پر تیار نہیں تھا کہ میں اتنی رات گئے ڈرائیو کروں۔ سب ہی اپنی اپنی تجاویز پیش کر رہے تھے اور مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔

''میرے لیے نائٹ ڈرائیونگ مشکل بات نہیں ہے آج تو پاپا اور بیلا بھی ساتھ ہیں۔ جبکہ میں تو تنہا بھی رات کو ڈرائیو کر لیتی ہوں۔''

لیکن اس نقار خانے میں کوئی بھی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ نادر ہماری کار ڈرائیو کرے گا اور دوسری کار میں فیصل ہمارے پیچھے آئے گا تا کہ نادر ہمیں چھوڑ کر فیصل کے ساتھ واپس جا سکے۔

سڑکیں، تاریک اور سنسان تھیں۔ کہیں کہیں اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ دن میں جو فاصلہ ٹریفک کی موجودگی میں خاصا طویل ہو جاتا تھا، رات کو خالی سڑکوں کی وجہ سے سمٹا ہوا لگ رہا تھا۔

ہماری اور فیصل کی گاڑی آگے پیچھے گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ میں چابیاں لے کر مین ڈور اور دیگر تالے کھولنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ نبیلہ، نادر اور فیصل کو چائے آفر

کرنے لگی۔

''بس میں ایک منٹ میں چائے بنا دیتی ہوں۔ اس طرح نہیں جانا تم لوگوں نے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

میں تالا کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

''اب بیلا بے چاری کیا چائے بنائے گی۔ میں ہی بنا دیتی ہوں۔'' میں نے سوچا اور کچن میں چلی آئی۔

ابھی پتیلی میں پانی بھر کر چولہے پر رکھا ہی تھا کہ نبیلہ آ گئی۔

''ارے واہ، کمال کر دیا تم نے۔ نادر کو واپسی کی جلدی ہے، اس کی امی اپنی دوائیں اپنے گھر ہی بھول آئیں۔ اب اسے انہیں لے کر جلدی گھر جانا ہے، پھر بھی میں نے چائے پر روک لیا ہے۔'' وہ بولی۔

''تم جا کر اپنے مجنوں کے پاس بیٹھو، میں چائے بنا دیتی ہوں۔ اگر تمہیں اپنے آپ کو چولہے میں ہی جھونکنا تھا تو پھر نادر کو روکنے کی کیا ضرورت تھی، تم جاؤ، میں ابھی چائے لاتی ہوں۔''

وہ ہنس پڑی۔

''تھینک یو۔ اور ہاں فیصل چائے نہیں پیے گا۔ کہہ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پی تھی۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا پھر خیال آیا۔ ''پاپا کہاں ہیں؟''

''سونے سے پہلے حسب معمول نہانے کے لیے گئے ہیں۔ وہ بھی چائے کے لیے منع کر گئے ہیں۔''

''تم خود ہی آ کر ٹرے لے جانا۔ مجھے ان کپڑوں سے اُلجھن ہو رہی ہے، فوراً ان سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مڑ گئی۔

چائے بناتے ہوئے نبیلہ کے چہرے پر پھیلے قوسِ قزح جیسے رنگوں کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ خوش تھی اور میرے دل سے دعا نکلی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔

ٹرے میں بمشکل برتن سجا پائی تھی کہ نبیلہ آ گئی۔

''تھینک یو۔''اس نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے میرے گال پر پیار کیا اور تڑے اٹھا کر باہر نکل گئی۔

کچن میں بکھری دو چار چیزیں ٹھیک کر کے میں بھی باہر نکلنے کا ارادہ کر رہی تھی جب فیصل اندر چلا آیا۔

''نبیلہ۔''

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ مناسب موقع ملا اور نہ وقت۔''اس نے کہنا شروع کیا۔

عورت کے بہت اندر ایک حس ہوتی ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ اس کے مقابل کھڑا مرد اسے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کیا کہنے جا رہا ہے۔ میری حس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ وہ لمحہ بہت قریب ہے جس سے میں خوفزدہ تھی۔

نہ جانے میں کیوں اس قدر کمزور تھی لیکن مجھے احساس ہے کہ میرا یہ خوف میرے چہرے پر بھی چھا گیا تھا۔

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اب بھی میرے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ تم جاؤ یہاں سے۔''میری کوشش تھی کہ میرے اندر کا خوف میری آواز اور میرے لہجے میں نمایاں نہ ہو۔

چند لمحے وہ میری جانب دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہوں۔ اچھا یہ لے لو۔''کہہ کر اس نے اپنی جیب سے والٹ نکالا اور اس میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میری جانب بڑھایا۔

کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے وہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''فیصل۔''نبیلہ کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی اور پھر ہم دونوں کو وہاں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''ہاں۔''فیصل نے اس سے کہا۔

''نادر بلا رہا ہے۔''

میں وہ تہہ شدہ کاغذ مٹھی میں دبائے کھڑی رہی۔ اور وہ دونوں کچن سے باہر بھی نکل

گئے۔ ان کے جانے کے بعد مجھے خود پر اور فیصل پر بے انتہا غصہ آیا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ میں نے اس سے کاغذ لے لیا تھا؟ میں انکار بھی تو کر سکتی تھی۔ اور پھر اس کو کیا ضرورت تھی کاغذ تھما دینے کی اور اس میں کیا لکھا ہوا تھا؟

میں نہیں جانتی تھی کہ اس میں کیا لکھا ہوا تھا۔

''اور جاننا چاہتی بھی نہیں۔''میں نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی۔

چولہے کے قریب پڑی ماچس اُٹھا کر میں نے دیا سلائی جلائی اور تہہ شدہ کاغذ کو جلتی تیلی کی لو کے قریب لے گئی۔

لیکن ایک ہی لمحے میں ارادہ بدل گیا۔

شاید تجسس، غصے پر غالب آ گیا۔

یا پھر میں بہت ہی کمزور تھی۔

یا شاید بہت عرصے سے میں خوبصورت لفظوں اور جذبوں کے اظہار سے محروم اپنے غم میں سُلگ رہی تھی۔

جذبے اور خوبصورت لفظ شاید عورت کی فطری کمزوری ہوتے ہیں۔ کچھ عورتیں اس کمزوری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کچھ دل پر جبر کر کے حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہیں اور کچھ اپنے اندر کی مضبوطی کی وجہ سے انہیں خود پر حاوی نہیں ہونے دیتیں۔

افسوس میں اس کمزوری کا شکار ہو گئی تھی۔ میں ان عورتوں میں شامل ہو گئی تھی جو پہلے اپنے گرد محرومیوں کا جال بُنتی ہیں اور جب اس میں پوری طرح قید ہو کر اپنا دم گھٹتا محسوس کرتی ہیں تو اسے کتر کر نکل بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں۔

مجھے خود پر غصہ آیا۔ اپنی کمزوری پر غصہ آیا۔ پھر بھی میں اسی کمزوری کی اسیر ہو گئی۔

باہر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی ہلکی سی آواز اُبھری، پھر ریورس ہونے کی مخصوص آواز اور اس کے بعد گیٹ بند ہونے اور تالا لگنے کی۔ رات کے سناٹے میں یہ آوازیں مدھم لیکن واضح تھیں۔

''بیلا آتی ہو گی۔''میرے ذہن میں خیال آیا۔

اور میں تیزی سے کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ کاغذ کا یہ ٹکڑا میں اسے دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اس وقت نہیں۔

بیڈ سائیڈ لیمپ کی مدھم روشنی میں میں نے مٹھی میں دبے کاغذ کی تہیں کھولیں۔

وہ کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا جیسے عموماً دفتروں میں فون نمبر لکھنے یا مختصر پیغام نوٹ کرنے یا دینے کے کام آتا ہے۔ اس سفید کاغذ پر صرف ایک فقرہ تحریر تھا۔

''دل بھیج دو' ورنہ خودکشی کا ارادہ ہے۔''

کتنی دیر خاموشی سے میں اس تحریر پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔

اور پھر ایک ہی پل میں غصے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''میں کیوں اسے اس انداز میں دکھ رہی ہوں۔'' ہاتھ میں تھامے کاغذ کے کئی پرزے کر کے میں نے انہیں دور پھینک دیا۔ ''ایسا تو میں نے تب بھی کبھی نہیں کیا تھا جب میں نادان اور کم عمر تھی۔ کسی کے ہاتھ سے خط نہیں لیا تھا۔ کسی ایسی حرکت پر توجہ نہیں دی تھی۔ پھر آج کیوں؟ آج جب کہ میں شادی شدہ ہوں۔ تیمور کی بیوی ہوں۔ پھر میں نے کیوں کاغذ کے اس ٹکڑے کو اس قدر غور سے دیکھا۔ میں نے تیمور سے محبت کی ہے اور کرتی ہوں۔ سب سے ٹکر لے کر سب کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کی ہے۔''

مگر اسی لمحے میرا ذہن بھٹک گیا۔ ''ہاں شادی کی۔ سب کی مخالفت کے باوجود' سب سے ٹکر لے کر اور میرے ہاتھ کیا آیا؟ انسان قربانی دیتا ہے مگر کس حد تک؟ کاش تیمور نے مجھے اولاد کی خوشی ہی دے دی ہوتی۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی سہارا تو ہوتا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں زندہ رہوں تو بھی کس کے لیے؟ میرے پاس تو تیمور کا ساتھ بھی نہیں ہے۔ مستقبل کی امید اور جدوجہد انسان کو زندہ رہنے پر اُکساتی ہے۔ مگر میرا مستقبل کیا ہے؟ کس کی خاطر جدوجہد کروں میں؟ کھانے پینے پہننے اوڑھنے کو مل ہی رہا ہے اس سے بڑھ کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کروں بھی تو کس کے لیے؟ کیا صرف اپنے لیے؟ صرف اپنے لیے انسان کب تک جی سکتا ہے؟ اور پھر میں کب اتنی اہم ہوں کہ صرف اپنے لیے زندہ رہوں۔ اور ایسا بھی کرلوں لیکن جب ساری زندگی بھاگ بھاگ کر بالآخر تھک جاؤں گی اور اپنے گرد کسی سہارے کی تلاش میں نگاہیں دوڑاؤں گی تو کتنی مایوسی ہوگی۔ وہی تنہائی جو آج ہے۔ کل اور گہری ہو جائے گی۔''

آنسوؤں سے میری گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اس لمحے بھی حق دوستی نبھانے' تنہائی میں رفاقت دینے ڈھیروں آنسو میری آنکھوں میں اُتر آئے۔ بے بسی کے احساس نے مجھے اندر

تک کاٹ کر رکھ دیا۔

میری محرومیوں کا فائدہ اُٹھا کر ساری رات وہ الفاظ میری کھلی اور بند آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے۔

''دل بھیج دو' ورنہ خودکشی کا ارادہ ہے۔''

☆======☆======☆

دن تو بیت ہی گیا لیکن شام ہوتے ہی میں کمپیوٹر کے بہانے اپنے بیڈروم میں قید ہو گئی۔ کرنے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ یونہی اسکرین پر نظریں جمائے کرسی پر جھولتے ہوئے تیمور کے متعلق سوچ رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں بیزار ہوگئی۔

''کون ہے' آجاؤ۔''

اس وقت میں سب کچھ کرسکتی تھی سوائے کسی بحث مباحثے کے اور مجھے یقین تھا کہ اب نبیلہ مجھے قائل کرنے آئی ہوگی کہ میں سب کے درمیان آ کر بیٹھوں۔

لیکن میری توقع کے برعکس اندر آنے والا فیصل تھا۔ یعنی نبیلہ کے آنے اور بحث کرنے سے زیادہ مشکل مرحلہ بھی کوئی ہوسکتا تھا۔

بروٹ کی مہک سے میرا پورا کمرا ابھر گیا۔

''اوہ خدایا' یہ کم از کم ایک بوتل پرفیوم اپنے اوپر اسپرے کر کے ضرور آیا ہوگا۔'' میں نے ناگواری سے سوچا۔

''بیٹھنے کو نہیں کہوگی؟ خیر تم سے اتنے آداب میزبانی کی توقع بھی نہیں ہے۔ میں خود ہی بیٹھ جاتا ہوں۔'' وہ قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آئی ایم سوری میں تمہارے ساتھ بیٹھ نہیں سکوں گی۔ مجھے باہر جانا ہے۔'' میں نے لہجے میں بھرپور رکھائی سمونے کی کوشش کی۔

''تم حقیقت کا سامنا کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں فرار کی راہیں تلاش کرتی ہو۔'' وہ بولا۔

اس کا تجزیہ سو فیصد درست نہیں تھا تو سو فیصد غلط بھی نہیں تھا لیکن مجھے مشتعل کرنے کے لیے کافی تھا۔ انسان اپنی خامیوں کے بارے میں کسی کے منہ سے نکلے الفاظ برداشت نہیں کرسکتا پھر بھی میں نے خود پر قابو پالیا۔

''مجھے تمہاری بات سے اتفاق نہیں ہے۔'' میری کوشش تھی کہ میرے لہجے میں مضبوطی

کی جھلک ہو۔

''تو پھر بہتر ہوگا کہ ایک مرتبہ تفصیل کے ساتھ میری بات سن لو اور اپنی کہہ دو۔''

''میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی نہ ہی اس کی ضرورت سمجھتی ہوں۔ یوں بھی جو تم چاہتے ہو وہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے؟'' وہ جان چھوڑنے پر راضی نہیں تھا۔

''اس لیے کہ میں شادی شدہ ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میرے خیال میں یہ ایک دھماکا تھا۔

لیکن فیصل کے چہرے پر نہ حیرت نمودار ہوئی نہ صدمے کا کوئی تاثر۔

''تو؟''

حیران ہونے کی باری میری تھی۔ اس کے اس ایک لفظ کا کیا جواب تھا میرے پاس۔

''تو؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری ازدواجی حیثیت میری محبت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اور پھر تمہاری شادی شدہ زندگی کس بھنور میں پھنسی ہوئی ہے یہ بھی میں جانتا ہوں۔ میری بات تلخ ضرور ہے لیکن یہی حقیقت ہے کہ خود تمہیں بھی خبر نہیں ہے کہ تمہاری شادی کا اختتام اچانک کسی دن طلاق پر ہوگا یا بیوگی پر' جبکہ علیحدگی پہلے ہی ہو چکی ہے۔''

اس سے قبل بھی یہ بات مختلف انداز میں بہت لوگوں کے منہ سے میں سن ہی چکی تھی لیکن کسی نے اتنی صاف گوئی اور کھردرے پن سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ میرے کتنے زخم اُدھیڑ ڈالے تھے اس نے۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی لیکن درمیان میں آنسوؤں کا پردہ حائل ہو گیا تھا۔

''میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا جمیلہ! لیکن جب تک تم زندگی میں اپنے مقام کا تعین نہیں کرلوگی تب تک یونہی دکھ اُٹھاتی رہوگی۔ پہلے یہ جاننے کی کوشش کرو کہ تمہارا اصل پرابلم کیا ہے پھر ہی اسے حل کر سکوگی۔''

''پلیز بس کرو۔ اس وقت تم میری سب سے بڑی پرابلم ہو۔ سمجھے۔ میں تمہیں دیکھنا اور تم سے ملنا نہیں چاہتی۔ تم سے بات نہیں کرنا چاہتی پھر بھی تم میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں ہو۔ میں صرف اور صرف تیمور سے محبت کرتی ہوں اور اسی سے محبت کرتی رہوں گی۔ پلیز

میرے اور تیمور کے بیچ سے ہٹ جاؤ۔'' میری آنکھیں جل رہی تھیں۔

''میں تمہارے اور تیمور کے بیچ میں نہیں ہوں۔ جیسے تم میرے اور نادیہ کے بیچ نہیں ہو۔ محبت بہت وسیع اور گہری ہوتی ہے۔ ایک انسان سے محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم نے دوسرے سے محبت کرنا چھوڑ دی ہے۔ ہمارے دل میں بہت جگہ ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں اور بہت سے رشتوں کو اکٹھے سمویا جا سکتا ہے اس میں۔

میں اس بات کو بہت عرصے بعد سمجھ پایا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے' لیکن یہ جانتا ہوں کہ زندگی کیا ہے۔ زندہ رہنے کے تقاضے انسان کو بہت کچھ سمجھا اور سکھا سکتے ہیں۔ چاہے وہ یہ سب سیکھنا اور سمجھنا چاہے یا نہیں۔ ورنہ نادیہ کے بعد میرے پاس کیا رہ گیا تھا؟ میرے لیے ممکن ہوتا تو شاید میں اپنی جان ہی دے دیتا۔ اس ایک صدمے سے نکلنے کے لیے مجھے چھ برس کا عرصہ لگا۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنی زندگی اور اپنی ذات میں' میں اس قدر گم تھی کہ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کہیں کوئی اور بھی کسی دکھ' کسی غم میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

وہ کیا صدمہ تھا جو اس نے جھیلا تھا؟ وہ تو ہمیشہ خوش خوش نظر آیا تھا۔ اور نادیہ کون تھی؟ کہاں چلی گئی تھی وہ؟ ان کے درمیان تعلق کی جو نوعیت تھی' وہ تو اس کی باتوں سے ظاہر ہو ہی رہی تھی۔

میری سوچیں' حیرت اور سوال' شاید سبھی میرے چہرے پر تحریر تھے۔ اس نے خود ہی جواب دینا شروع کر دیے۔

''میری زندگی میں نادیہ سب سے اہم تھی۔ وہ تھی بھی بہت ہی اچھی۔ اس سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں میٹرک میں تھا۔ ڈیڈی بہت سخت تھے اس لیے کار میں اسکول آنے جانے کی عیاشی صرف بہنوں کے لیے تھی۔ مجھے اور سلمان کو سائیکل پر اسکول جانا پڑتا تھا۔ ہم دونوں بھائی بھی اس سفر سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ سلمان کالج چلا گیا' اسے موٹر سائیکل بھی مل گئی لیکن میرے اسکول آنے جانے کے لیے سائیکل ہی کام آتی رہی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ امی کی سفارش پر مجھے اسپورٹس سائیکل مل گئی تھی۔

ایسے ہی ایک دن میں اسکول جا رہا تھا جب ٹریفک سگنل پر رکی ایک سفید ٹیوٹا کرولا پر میری نگاہ پڑی۔ اسکول کے سفید یونیفارم میں ملبوس وہ بے نیازی سے کھڑکی سے باہر دیکھ

رہی تھی اور اس لمحے کے سحر نے مجھے ہمیشہ کے لیے جکڑ لیا۔ یہ بات محض لمحے بھر کی تھی۔ اشارہ سبز ہوا اور اس کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں نے کوشش کی کہ اس گاڑی کا پیچھا کروں لیکن کامیاب نہ ہوا۔ صبح کے رش میں وہ کہیں گم ہو گئی۔

یہ واقعہ معمولی سا تھا بلکہ شاید یہ کوئی واقعہ تھا ہی نہیں۔ پھر بھی میرے لیے بہت اہم تھا۔ اس سے پہلے میں ایسی کیفیت سے کبھی نہیں گزرا تھا۔ میری زندگی میں لڑکیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور نہ ہی گنجائش۔ میں بہترین طالب علم تھا۔ بے حد شرارتی بھی۔ اور میری شرارتیں سب اس لیے برداشت کر لیتے تھے کیونکہ میں تعلیم اور کھیل دونوں میں بہت اچھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لڑکیوں کا دائرہ کار بہت مختلف ہوتا ہے اور وہ لڑکوں اور مردوں کی دلچسپیوں کو سمجھنے کی اہل ہی نہیں ہوتیں۔ وہ صرف گڑیوں سے کھیل سکتی ہیں اور بس۔

لیکن نادیہ کو دیکھ لینے کے بعد میرے خیالات میں ایک عجیب سی کنفیوژن پھیل گئی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سفید اسکول یونیفارم میں ملبوس لڑکیوں کے ہجوم میں میں اسے کیوں تلاش کرتا تھا۔ ہر سفید ٹویوٹا کرولا پر میری نگاہیں کیوں ٹک جاتی تھیں۔ اور اسپورٹس کے سامان کی دکانوں میں جھانکنے کے بجائے اب میں چوڑیوں کی دکانوں میں کیوں جھانکنے لگا تھا۔

ابھی اس بات کا مجھے کوئی جواب نہیں مل سکا تھا کہ میری اس سے اگلی ملاقات ہو گئی۔

اس روز بھی حسبِ معمول میں اعظم گیریژن گرلز کالج کے سامنے سے گزرتے ہوئے گیٹ سے نکلتی اور ٹولیاں بنا کر باتیں کرتی لڑکیوں کے ہجوم کی طرف متوجہ تھا۔ میرا تمام تر دھیان اسی جانب تھا۔ بالکل اچانک ایک کھمبا راستے میں آ گیا اور میں سائیکل سمیت زمین پر۔ لڑکیوں کی ایک ٹولی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سائیکل اٹھا کر اور اپنی بچی کھچی عزتِ نفس سمیٹ کر میں نے ہنستی لڑکیوں کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ وہ لڑکیاں تعداد میں چھ تھیں اور اب تک میرے یوں گر جانے سے محظوظ ہو رہی تھیں لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان میں وہ بھی تھی جسے کتنے دن سے میں تلاش کر رہا تھا۔

مجھے وہ لمحات تمام تر جزئیات سمیت یاد ہیں سفید یونیفارم میں اس کی گوری رنگت بہت کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ لمبے سنہری مائل بالوں کی دو چوٹیاں آگے ڈال رکھی تھیں۔ ہاتھ میں مکئی کی چھلی تھی جس پر خوب سارا مسالہ لگا رکھا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس کے موتیوں کی لڑی

جیسے دانت چمک رہے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔ چند لمحے تو میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ وہ مجھے اپنی جانب یوں ایک ٹک دیکھتے پا کر کچھ کنفیوژ ہو گئی تھی۔ اس کی باقی سہیلیوں کو احساس ہوا تو انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ اسکول کے اندر واپس چلی جائیں۔ اس نے قدم اٹھایا تو میں بھی جیسے ہوش میں آ گیا۔

''میں نے پا لیا۔'' چلاتے ہوئے میں اس کی جانب بڑھا اور اس کے دونوں کندھے تھام لیے۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں کتنے دن سے تلاش کر رہا تھا؟''

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہیں سکی۔ اس کی سہیلیاں بھی آنکھیں پھاڑے ہم دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

''اس مہینے کی تین تاریخ کو جب تمہاری سفید ٹویوٹا کرولا شامی روڈ سے عابد مجید روڈ کی طرف مڑتے ہوئے سرخ بتی پر رکی تھی' یاد ہے تمہیں؟ میں تمہارے قریب ہی اپنی سائیکل پر تھا مگر تم نے مجھے دیکھا نہیں تھا لیکن میں نے تمہیں دیکھا تھا اور تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ میں اس روز سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔'' میں جوش سے کہہ رہا تھا۔

میری بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پوری قوت سے خود کو چھڑا کر اسکول کے اندر بھاگ گئی۔ اسی لمحے میری نگاہ دور کھڑے MP (ایم پی) پر پڑی جو میری جانب مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سائیکل سیدھی کی اور تیزی سے وہاں سے نکل بھاگا۔

''اس وقت تو ایم پی سے جان بچا کر بھاگو۔ یہ تو پتا چل ہی گیا کہ وہ بار بی ڈول یہاں پڑھ رہی ہے۔ اب اس کے متعلق کچھ اور جاننا مشکل نہیں۔'' میں نے تیزی سے پیڈل چلاتے ہوئے سوچا۔

لیکن برا ہوا۔ اس نے تمام تر واقعہ اپنے خونخوار قسم کے ڈیڈی کو سنا دیا۔ جو اتفاق سے بریگیڈیر بھی تھے اور اگلے روز میری گت بنانے کے لیے اسکول کے باہر ہی موجود تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مجھے بروقت خبر مل گئی اور میں بھاگ گیا ورنہ خیر نہیں تھی۔ پھر تو یہ معمول ہو گیا۔ ڈرائیور کے بجائے وہ اپنی ڈیڈی کے ساتھ ہی اسکول آنے جانے لگی۔ میں نے تو بہت مرتبہ چاہا کہ بے خطر اس آتشِ نمرود میں کود پڑوں اور اس کے ڈیڈی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑھک لگاؤں۔

''اوئے میں تیری دھی چک کے لے جاریاں۔ کرلے جو کرنا اے۔''

لیکن ان کی مونچھیں اور ہاتھ میں پکڑی فائبر گلاس کی چھڑی مجھے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

بہر حال میری سی آئی ڈی اپنا کام کر رہی تھی اور نادیہ کے بارے میں میرے پاس تھوڑی بہت معلومات جمع ہو چکی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ کیولری گراؤنڈ میں اس کا گھر کہاں تھا۔ اس کی امی بہت پیاری اور محبت کرنے والی خاتون تھیں اور اس کا بھائی پی ایم اے میں ٹریننگ لے رہا تھا۔ پھر جب مجھے یہ پتا چلا کہ وہ ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ سروسز کلب جایا کرتی تھی۔ تو میرے دل کی کلی کھل اٹھی۔

وہیں میری اس سے اگلی ملاقات ہوئی۔ میں اسی تاک میں تھا کہ کب اس کی امی اور ڈیڈی سے نگاہ بچا کر اس سے بات کر سکوں۔ نہ جانے کس کام کی خاطر وہ کار کی چابی لے کر پارکنگ کی طرف بڑھی۔ ہاتھ میں چپس کا پیکٹ اور پیپسی کا کین لیے۔ موقع اچھا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ کار کا دروازہ کھول کر وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور ڈیش بورڈ میں رکھی کیسٹیں الٹنے پلٹنے لگی۔ دروازہ تھام کر میں نے اندر جھانکا اور اسے مخاطب کیا۔

''نادیہ۔''

اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی پہلے اس کا چہرہ سفید پڑا اور پھر ایک دم سرخ ہو گیا۔

''پلیز نادیہ! میری بات سن لو۔''

اس نے گھبرا کر مدد کے لیے ارد گرد دیکھا۔

''مجھے اپنا دوست سمجھو' میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا' پلیز تم از کم ایک مرتبہ میری بات سن لو۔''

''میں تم سے ڈرتی بالکل نہیں ہوں۔ سمجھے۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اور میرے ڈیڈی بھی یہیں ہیں۔ تم جیسے کو تو وہ کچا ہی چبا ڈالیں۔'' اس نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

''ارے جاؤ بڑے دیکھے ہیں کچا چبانے والے۔'' میں نے اپنی عزتِ نفس بچانے کی کوشش کی۔

''ویسے تو میرے ڈیڈی کو دیکھ کر تمہاری گھگھی بندھ جاتی ہے۔ جیسے میں جانتی نہیں ہوں۔'' اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

''یہ ڈیڈی کیوں ٹپک پڑے درمیان میں۔ مجھے تم سے کچھ اور بات کرنی تھی۔''

اس کے گورے رنگ میں پھر سرخی گھلنے لگی۔ کار سے باہر نکلنے کے راستے پر میں کھڑا تھا۔

''پلیز' میرا راستہ چھوڑ دو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ اچانک روہانسی ہو گئی۔ کہاں تو ایک لمحے پہلے تک وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور کہاں اب بالکل رونے والی ہو رہی تھی۔

''میں نے کہا ناں کہ مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس میں تو تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

مجھے خود بھی حیرت تھی کہ اچانک ہی کنفیوژن کی دھند کیسے چھٹ گئی تھی۔ اب سے لمحہ بھر پہلے تک بھی میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ میں نادیہ کے لیے کیا محسوس کر رہا تھا اور اب بالکل اچانک ہی میں نے اظہارِ محبت بھی کر دیا تھا۔

لیکن اسے حیرت نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

''مجھے امی نے بتا دیا تھا کہ سب جھوٹے لڑکے یہی باتیں کرتے ہیں اور میں کسی کی بھی بات پر دھیان مت دوں۔''

''مگر میں تو جھوٹ نہیں کہہ رہا۔''

''امی کہہ رہی تھیں کہ سب ایسے ہی کہتے ہیں پر اصل میں جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔''

''وہ ٹھیک نہیں کہہ رہیں' میں سچ مچ تم سے محبت کرتا ہوں۔ وہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں جبکہ میں سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔''

''بس اب مجھے جانے دو۔'' وہ بولی۔

''پہلے تم کہو کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

''نہیں۔''

''ہاں۔'' وہ چلائی۔

میں خاموش ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے قائل کرتا' کیسے سمجھاتا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

''اچھا بتاؤ کہ تم کیسے مانو گی کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' بہت سوچ کر میں نے سوال پوچھا۔

اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ لمحہ بھر بعد وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''امی کہتی ہیں کہ سچ صرف وہی بولتا ہے جو سیدھے راستے سے آئے۔''

میں کچھ نہ سمجھا۔ ''سیدھا راستہ کیا ہوتا ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے کہا۔

مجھے یقین تھا کہ اسے سیدھے راستے کا پتا معلوم تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ مجھے کبھی نہیں بتائے گی کہ سیدھا راستہ کون سا اور کہاں تھا۔ یہ مجھے خود ہی معلوم کرنا تھا۔

''مجھے نہیں پتا کہ سیدھا راستہ کیا ہوتا ہے لیکن میرا وعدہ ہے کہ اب میں سیدھے راستے سے آؤں گا تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ میں تم سے سچ مچ محبت کرتا ہوں لیکن پلیز میرا انتظار ضرور کرنا۔''

میں وہاں سے ہٹ آیا۔ وہ اپنی امی کے پاس واپس چلی آئی اور میں اپنے دوستوں کے پاس۔ میری تمام تر دلچسپی کا محور وہی تھی۔ وہ بھی اپنی امی کے قریب بیٹھ کر چپس کترتے ہوئے کن انکھیوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

کچھ عرصہ میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ سیدھا راستہ کون سا تھا۔ اسی دوران Send ups آئے اور گزر گئے۔ میرے لیے پڑھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ جو کتاب کھولتا تھا اس کے لفظ غائب ہو جاتے تھے' اور ان کی جگہ نادیہ کی صورت اُبھر آتی تھی۔ رات کو بھی اس کا خیال ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ ظاہر ہے ایسے میں امتحانوں کا نتیجہ کیا آ سکتا تھا۔ میں فیل تو نہیں ہوا تھا لیکن جیسے پاس ہوا تھا اس سے فیل ہو جانا ہی بہتر تھا۔

رپورٹ کارڈ ابو کے دربار میں پہنچا۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ ابو تک پہنچنے سے پہلے ہی کارڈ

درمیان سے غائب کر لوں گا لیکن ہوا یہ کہ وہ اتفاقاً اسکول کے باہر سے گزر رہے تھے اور اتفاقاً ہی اسکول کے اندر بھی چلے آئے۔ وہیں اتفاق سے ان کی ملاقات میرے کلاس ٹیچر سے ہو گئی اور میری شامت کا سامان پیدا ہو گیا۔

ابو بہت سخت تھے لیکن کچھ باتوں میں ان کا رویہ ہم سب سے بہت دوستانہ تھا۔ میں جب ان کے دربار میں پہنچا' اس وقت وہ سخت غصے کے عالم میں تھے۔

''اپنا رپورٹ کارڈ دیکھا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ڈوب مرنے کا مقام ہے یہ۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم پاس ہو گئے ہو؟''

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ابو کا پارہ چڑھ گیا۔

''سی گریڈ لے کر تمہارا خیال ہے کہ تم پاس ہو گئے؟''

''ابو! آپ مجھے صفائی کا موقع دیئے بغیر میرے گلے پر چھری نہیں پھیر سکتے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''گویا تمہارے پاس صفائی میں کہنے کے لیے بھی کچھ ہے۔ بہت خوب۔ کہو کہ تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو۔''

میں نے ایک نظر لاؤنج میں بیٹھے ہوئے سبھی لوگوں کی طرف دیکھا۔ امی' ابو' آپا' سلمان' تہمینہ سب میری طرف متوجہ تھے۔ سبھی کے لیے یہ دلچسپ منظر تھا کیونکہ اس سے قبل گھر میں کبھی کسی کا سی گریڈ نہیں آیا تھا۔

''میں ایک سوال کا جواب سوچتا رہا اور اسی دوران سب سوالوں کے جواب غلط ہو گئے۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''کمال کر دیا تم نے تو۔ بھئی ہم میں سے کسی سے پوچھ لیتے۔ ممکن ہے ہم جواب بتا سکتے۔'' آپا بولیں۔

''ایسا کیا سوال تھا؟'' ابو نے مجھے گھورا۔

''یہ کہ سیدھا راستہ کون سا ہے؟''

سب ہنس پڑے۔

''بھائی سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ سیدھا راستہ کون سا ہے؟'' تہمینہ نے

اپنی علمیت کا رعب دیا۔

''تم ٹھہرے سدا کے اُلٹے' سیدھے راستے سے تمہارا کیا کام؟'' سلمان بولا۔

''چپ کرو۔'' ابو نے سب کو جھڑکا پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''صاحبزادے اصل بات اتنی سیدھی نہیں ہوگی جتنا سیدھا اسے بتا رہے ہو۔ انسانوں کی طرح بتاؤ کیا بات ہے۔''

''ابو! اگر کوئی آپ سے کہے کہ سیدھے راستے سے آئیں تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''اس کا مطلب ہوگا کہ کھڑکی سے آنے کے بجائے دروازہ استعمال کریں۔'' سلمان نے کہا۔

سب ہنس پڑے۔

''تم سے کس نے سیدھے راستے سے آنے کے لیے کہا ہے؟'' ابو نے بغور میری جانب دیکھا۔

ابو بہت جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور اب ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں اصل بات کا کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔

میں نے دیکھا تھا کہ گھر میں سبھی مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ سو اسی امید کے سہارے میں نے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

''دراصل مجھ سے نادیہ نے یہ بات کہی ہے۔''

امی اور آپا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ تہمینہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے دلچسپی سے میری طرف تکنے لگی۔ سلمان اُچھل ہی پڑا اور ابو ہولے ہولے اثبات میں سر ہلاتے میری طرف دیکھے گئے۔

''بہت خوب۔'' بالآخر انہوں نے کہا۔

''یہ نادیہ کون ہے؟'' امی بھی میدان میں اُتر پڑیں۔

''وہ بہت اچھی ہے امی اور اتنی خوبصورت ہے کہ بس بندہ اسے دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔ اعظم گیریژن میں پڑھ رہی ہے میٹرک میں۔ بڑے خونخوار قسم کے ڈیڈی پائے ہیں اس نے۔ ایک بھائی ہے جو الحمدللہ پی ایم اے میں ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی بہت خونخوار قسم کا ہوگا اس کے ڈیڈی بریگیڈیر ہیں۔ ایمان سے انڈینز انہیں صرف دیکھ کر ہی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ آپ چاہیں تو اسے سروسز کلب جا کر دیکھ سکتی ہیں۔ وہ بہت

باقاعدگی سے وہاں جاتی ہے ویسے گھر کا ایڈریس بھی ہے میرے پاس اور فون نمبر بھی ہے۔''

میں بہت خلوص نیت سے یہ تمام تر معلومات انہیں فراہم کر رہا تھا لیکن ہوا کیا؟

''بے شرم' بے حیا' کسی بڑے چھوٹے کا کوئی لحاظ نہیں۔ بہنیں قریب بیٹھی ہوئی ہیں اور تم اپنی عشق کی داستان سنا رہے ہو۔ کچھ اماں باوا کا لحاظ نہیں' ابھی تو تم زمین سے اُگے بھی نہیں ہو ابھی سے لڑکیوں کے پیچھے دوڑنے لگے۔''

امی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ مجھے یہ سب کیوں کہہ رہی تھیں۔ ہمارے گھر کی تو روایت تھی کہ جو پریشان ہوتا تھا۔ سب اس کی دلجوئی کرتے تھے۔ اس کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے تھے جبکہ یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ ہوگیا تھا۔

وہ تو اچھا ہوا کہ جب امی نے مجھے سامنے سے دفع ہو جانے کو کہا تو سلمان میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے نکال لایا۔

''امی کو کیا ہوا؟ وہ مجھے ڈانٹنے کیوں لگیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''واہ بھولے میاں! تمہارا کیا خیال تھا کہ امی اگلے لمحے ہی تمہارا رشتہ لے کر نادیہ کے گھر چلی جاتیں؟''

''مگر یہ میں نے کب کہا؟''

''سیدھے راستے سے آنے کا اور کیا مطلب ہوتا ہے؟''

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اپنا سر پیٹ ڈالا۔'' یہ تو بہت آسان بات تھی۔ میری کیوں سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اور تم نے یہ نادیہ والا قصہ امی کے سامنے کیوں شروع کر دیا۔'' سلمان ہنسا۔

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق یہ پڑتا ہے کہ آئندہ سے امی نے کچھ ایسا انتظام کرنا ہے کہ تم نادیہ کا نام بھی نہیں لے سکو گے' ملنا تو دور رہا۔''

''مگر کیوں؟ سچ سلمان میں نادیہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ''مجھے پتا ہے' میں بھی صائمہ' عفت' شبانہ اور صوفیہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''چار لڑکیوں سے؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میرے سائے تلے آج آؤ تم بھی بیک وقت چار کیا چھ چھ لڑکیوں سے محبت کرنے لگو گے۔''

''نہیں' میرے لیے نادیہ ہی ٹھیک ہے۔''

''بات اب تک کہاں پہنچی؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

جواباً میں نے تمام تر واقعہ کہہ سنایا۔

''بہت پھسڈی محبت ہے۔'' سلمان نے تبصرہ کیا۔ ''خیر پھر بھی کہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں گا۔''

سلمان نے ٹھیک کہا تھا۔ میرا سائیکل پر اسکول آنا جانا بند ہو گیا۔ اب ابو ہی مجھے کار پر اسکول چھوڑنے اور لانے لگے۔ ایک ٹیوٹر گھر پر آنے لگا۔ وہاں سے جان چھوٹتی تو ابو یا امی کسی اور کام میں جوت دیتے۔ ٹیلی فون کے قریب جاتا تو اس قدر پرسش ہوتی کہ دیوار سے سر پھوڑ لینے کو جی چاہتا۔

فائنل امتحان قریب تھے اور امی ابو کی ساری کوششوں کے باوجود ہر ٹسٹ میں میرے نمبر انتہائی کم آرہے تھے۔ ایک مرتبہ ابو نے سخت قسم کی پٹائی بھی کی۔ ہر حربہ آزمایا لیکن کسی میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

میں نادیہ کو دیکھے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ ہر روز نہ سہی' تب بھی ہر دوسرے روز کسی نہ کسی ترکیب سے اسے دیکھ ضرور لیتا تھا۔ امی' ابو کے انتظامات پکے تھے تو کم میں بھی نہیں تھا کہیں نہ کہیں جُل دے ہی دیتا تھا۔

جب سب کو اندازہ ہوا کہ میں باز آنے والا نہیں ہوں تو معاملہ اوپر کی عدالت میں یعنی بابا جان تک پہنچا۔ میری طلبی ہوئی۔

''بابا جان میں امی' ابو کی غیر موجودگی میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے یہ سنتے ہی تخلیہ کا حکم دے دیا۔

''اب کہو۔''

میں نے انہیں نادیہ کے متعلق سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی کہ امی ابو کے کیے ہوئے انتظامات بھی میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ بہت فلمی قسم کے ڈائیلاگ بھی بولے تا کہ ان کا دل

پسیج جائے۔

''بابا جان میں اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن نادیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اگر امی' ابو نے میرے ساتھ یہی سلوک جاری رکھا تو میں میٹرک میں فیل ہو ہی جاؤں گا' وہ الگ بات ہے لیکن امی ابو کے ہوش تب ٹھکانے آئیں گے جب میں ابو کے ریوالور سے ہی خودکشی کروں گا۔ وہ بھی عین نادیہ کے گھر کے سامنے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ محبت کرنے میں برائی کیا ہے آخر۔''

بابا جان نے مجھے ڈانٹا پھر سمجھایا اور بالآخر اس وقت ہتھیار ڈال دیے۔ جب میں نے رعنا پھوپھو کا حوالہ دیا۔

''اچھا کیا تھا رعنا پھوپھو نے کہ ظالم سماج سے ٹکر لے کر اپنی محبت پا لی تھی۔ اگر پھوپھو یہ کر سکتی ہیں تو کیا میں نہیں کر سکتا؟ آپ لوگوں کی مرضی ہے۔ باقی سب خاندان کے جاہلوں کے پلے باندھیں لیکن میرے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی میں نادیہ کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی روز یا تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا یا پھر خودکشی کر لوں گا اور آپ لوگ اسی طرح روتے رہ جائیں گے۔ جیسے اب رعنا پھوپھو کے لیے مل کر سب روتے ہیں۔''

آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ کسی گھٹیا فلم کے جذباتی ڈائیلاگ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میری عمر بھی ایسی تھی جب ان باتوں کا شعور نہیں ہوتا کہ کس کے سامنے کس انداز میں بات کرنی چاہیے سو جو میرے منہ میں آیا' وہ میں نے کہہ دیا۔

لیکن اس کا نتیجہ اچھا نکلا۔ امی ابو کو حکم ملا کہ وہ میرا رشتہ لے کر نادیہ کے گھر جائیں۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' امی بوکھلا ہی گئیں۔

''کیسے نہیں ہو سکتا؟'' بابا جان بولے۔

''ابھی میٹرک تک تو کیا نہیں ہے اس نے پھر بڑے دو بہن بھائی ہیں جن کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوا۔ عمر دیکھی ہے اس کی۔ یہ عمر ان فضول کاموں میں صرف کرنے کی نہیں پڑھنے اور کچھ بننے کی ہوتی ہے۔ ابھی سے لڑکیوں کے چکر میں پڑ گیا تو کیا مستقبل بنا پائے گا؟ آپ نے اس کا send ups کا رزلٹ دیکھا ہے امتحان سر پر ہیں اور صاحبزادے عشق فرما رہے ہیں میرا تو خیال تھا بابا جان کہ آپ اس کے کان کھینچیں گے۔ آپ تو الٹا اس کی طرف

داری کرنے لگے۔'' ابو جی نے کہا۔

میں دروازے سے چپکا بحث سن رہا تھا۔ کتنی دیر تک دلیل جواب دلیل ہوتا رہا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو صرف اس انتظار میں تھا کہ اس تمام تر بحث کا نتیجہ جان سکوں۔

ابھی تک کسی کو بھی خبر نہیں تھی کہ میں باتھ روم میں چھپا سب کی باتیں سن رہا تھا۔ شاید میں چھپا ہی رہتا لیکن جب ابو جی کی دی ہوئی تجویز پر بابا جان کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھا تو رہ نہ سکا۔

''آپ اسے سمجھائیں کہ یہ میٹرک اور ایف ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کرے گا تو ہی ہم اس کا رشتہ لے کر نادیہ کے گھر جائیں گے۔'' ابو نے کہا۔

بابا جان نے پُرخیال انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

یہ بات میری برداشت سے قطعی باہر تھی۔ میں بھی میدان میں کود پڑا۔

''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے باتھ روم سے برآمد ہو کر کہا۔ ''اول تو مجھے ایف ایس سی نہیں کرنی۔ مجھے فائن آرٹس کی طرف جانا ہے اور دوسرے یہ کہ ایف اے میں تو میں تب پہنچوں گا جب میٹرک پاس کرلوں گا اور میٹرک میں تب تک نہیں پاس کرسکتا جب تک آپ لوگ نادیہ کو میری زندگی میں نہیں لائیں گے۔''

ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے کچا چبا ڈالیں، امی میری نالائقی اور نافرمانی پر دلبرداشتہ ہو کر رونے لگیں۔ بابا جان مجھے سمجھانے لگے لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر اب میں نے کمپرومائز کرلیا تو مجھے ہر مقام پر، ہر جگہ پر کمپرومائز کرنا ہوگا اور میں نادیہ کو کبھی نہیں پاسکوں گا۔

میں سب کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نادیہ کے مل جانے کے بعد نہ صرف میری پرانی سب صلاحیتیں لوٹ آئیں گی بلکہ میں کچھ زیادہ بہتر صلاحیتوں کا بھی مالک بن جاؤں گا۔ مثلاً میں جو پہلے کیمسٹری میں اے گریڈ لیا کرتا تھا۔ آئندہ سے اے پلس لیا کروں گا۔ اسی طرح فزکس میں اے پلس کے بجائے اے پلس پلس لیا کروں گا۔ مگر نہ جانے کیوں امی اور ابو یہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھے۔

اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ نادیہ کو پانے کے لیے میں نے کتنے ڈرامے کیے تھے

لیکن امی ابو کو منا نہیں سکا تھا۔ بالآخر ایک آخری ڈرامے نے انہیں میری بات ماننے پر مجبور کر دیا۔

یہ خیال اصل میں سلمان کو آیا تھا۔

''جہاں اتنے ڈرامے کرلیے وہاں ایک اور بھی کرلو کامیابی کی شرح اسی فیصد گارنٹی کے ساتھ۔'' اس نے کہا۔

میں نے لٹکے منہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے یقین ہے یہ اسّی فیصد کام نہیں آئے گا۔ اس کی جگہ بیس فیصد ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ میں تو سنجیدگی سے خودکشی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''بالکل، تمہیں یہی کرنا ہوگا۔'' سلمان چلایا۔

''یعنی مجھے مرنا ہوگا؟ اور اگر میں مرگیا تو مجھے یقین ہے نادیہ کو تم لے اُڑو گے۔''

''ابے جا، مجھے نادیہ سے کیا سروکار نہ ہی میں ان کاموں میں اتنا سنجیدہ ہوتا ہوں۔'' سلمان نے مجھے دھپ مارا۔

''تو پھر مجھے مرنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہو؟''

''جائیداد ہتھیانے کے لیے۔'' وہ بھنا گیا۔ ''میں کون سا سچ مچ تمہیں مرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ یہ تو ڈراما ہوگا جس کی ہدایات میں دوں گا۔''

میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''آج شام کو جب سب آنٹی عابدہ کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے جائیں گے اور گھر پر میں، تم اور بابا جان ہوں گے تب یہ ڈراما کھیلا جائے گا۔ تم ایک Sulsid note چھوڑ دو گے جس پر تحریر ہوگا کہ تم امی ابو کی ہٹ دھرمی اور نادیہ کی محبت کی خاطر یہ جہاں چھوڑ رہے ہو۔ دیلیم کی شیشی بابا جان کی دواؤں والے ڈبے سے پار کرلیں گے جو تم کھاؤ گے لیکن میں تمہیں بروقت کلینک لے جاکر تمہارا معدہ واش کرادوں گا۔ یوں امی ابو کو جھٹکا لگے گا اور وہ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہوجائیں گے۔''

میں تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا، لیکن اس میں مجھے کافی جھول نظر آئے۔

''یہ خودکشی کرنے کا ذرا زنانہ سا طریقہ لگتا ہے اور پھر مجھے یقین ہے کہ ابو جی کو بھی ضرور شک ہوجائے گا کہ یہ ڈرامہ تھا کیونکہ اس میں مجھے بال برابر بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔

طریقہ کچھ ایسا ہونا چاہیے جس سے مجھے کچھ تو نقصان پہنچے۔''

''تو میں ریوالور دیتا ہوں' اسے آزمالو۔'' سلمان کا موڈ آف ہو گیا۔

''ریوالور نہیں لیکن خنجر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''تم پاگل ہوئے ہو؟''

''پاگل ہی ہوں۔ جب اتنا بڑا ڈراما کرنا ہی ہے تو اس میں حقیقت کا رنگ بھی ہونا چاہیے۔ میں بابا جان کے بیڈروم میں جا کر ان کے سامنے خود کو زخمی کروں گا۔ تم ذرا کار تیار رکھنا کیونکہ نادیہ کو حاصل کیے بغیر میں مرنا نہیں چاہتا۔''

''مذاق مت کرو۔''

''یہ مذاق نہیں ہے۔ سوچو کیا زبردست منظر ہو گا۔ ادھر بابا جان گھبرائیں گے۔ سب سے قیمتی ووٹ انہی کا ہے۔ وہ ضرور قائل ہو جائیں گے۔ پھر جب شادی کی تقریب میں امی' ابو کو یہ خبر پہنچے گی کہ میں بُری طرح سے زخمی ہوں تو ان کا کیا حال ہو گا۔ آپا اور تہمینہ کا ووٹ بھی بہت قیمتی ہے اور مجھے پتا ہے کہ میری ایسی حالت دیکھ کر وہ امی ابو کو ضرور مجبور کریں گی نادیہ کے گھر جانے کے لیے۔ خود امی کا کیا حال ہو گا وہ تو کھانا بھی میرے بغیر نہیں کھا سکتیں۔ رہے ابو تو ان کی طرف سے میں اب بھی کچھ مشکوک ہوں لیکن جب گھر کے اتنے افراد زور ڈالیں گے تو وہ بھی ضرور مجبور ہو جائیں گے۔'' میں جوشِ مسرت سے کہہ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے۔''

سلمان میری اس تجویز کے حق میں نہیں تھا لیکن میرے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا بلکہ میں تو تصور ہی تصور میں یہ تمام تر منظر دیکھ بھی رہا تھا۔

آخر دم تک سلمان نے مجھے روکنے کی بے حد کوشش کی لیکن میں راضی نہیں ہوا۔

''بس تم اتنا کرنا کہ ایک تو کار ٹھیک ٹھاک رکھنا۔ دوسرے وہ تمہارے دوست کے بڑے بھائی ڈاکٹر ہیں' ان سے درخواست کرنا کہ میرے زخم کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔'' میں نے کہا۔

وقتِ مقررہ پر میں بابا جان کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ سلمان دروازے کے باہر مستعد کھڑا تھا۔ بابا جان بستر پر لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر کہا۔ ''آؤ بیٹا بیٹھو' میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔''

''میرے بارے میں کوئی نہیں سوچتا۔ نہ آپ نہ امی ابو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''ایسے نہیں کہتے' یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اپنے قریب ہی بستر پر میرے لیے جگہ بنائی۔

''مجھے نہیں بیٹھنا آپ کے پاس۔ یوں بھی میں جانتا ہوں کہ آپ کو کتنی محبت ہے مجھ سے۔ خواہ مخواہ نمائش کرنے کا کیا فائدہ۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو آپ نادیہ کو میری زندگی میں لانے کے لیے کوشش کرتے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بے فکر ہو جاؤں' وہی ہو گا جو میں چاہوں گا لیکن بجائے اس کے کہ آپ میرا ساتھ دیتے' آپ بھی امی ابو کے ساتھ مل گئے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ میں نادیہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جس میں نادیہ نہ ہو' اسی لیے میں اپنی زندگی ختم کر رہا ہوں۔''

میں نے خنجر والا ہاتھ نمایاں کیا۔ بابا جان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''تم کوئی احمقانہ کام نہیں کرو گے۔'' انہوں نے اپنے خالص بارعب انداز میں کہا۔

لیکن میں کہاں باز آنے والا تھا۔ خنجر سیدھا کر کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ میرا ارادہ خود کو تھوڑا بہت نقصان پہنچانے کا تھا' تاکہ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہو سکے' لیکن اس وقت جوشِ جذبات میں مَیں نے طے شدہ رفتار اور طاقت کے بجائے کچھ زیادہ رفتار اور طاقت سے خنجر پیٹ میں اُتار دیا۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ خون سے میرے ہاتھ تر ہو گئے تھے۔ بابا جان میری طرف بڑھے تھے' اس کے بعد کیا ہوا' یہ خبر نہیں ہوئی۔ ہاں کچھ آوازیں تھیں جو اُبھر اور ڈوب رہی تھیں لیکن میرے ذہن میں اتنی دُھند تھی کہ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

☆======☆======☆

آگے کی داستان بہت طویل ہے۔

سلمان کو ڈاکٹر سے یہ درخواست کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ وہ میرے زخم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے۔ کیونکہ حقیقت میں ہی میں اپنی خاصی چیر پھاڑ کر چکا تھا۔ پورے ڈیڑھ ماہ مجھے ایڈمٹ رکھا گیا۔ اور یہ ڈیڑھ ماہ ایک طرف انتہائی تکلیف دہ تھا اور دوسری جانب انتہائی خوشگوار۔

امی ابو تو فوراً نادیہ کے لیے رشتہ لے جانے پر راضی ہو گئے لیکن اس کے خونخوار قسم کے

ڈیڈی کو بہت سے اعتراضات تھے جن میں سے چند ایک یہ تھے۔

۱۔ میں انتہائی نامعقول گدھا تھا جس نے ایک روز ان کی بیٹی کے ساتھ' انتہا درجے کی بدتمیزی کی تھی۔

۲۔ میں انتہا پسند تھا اور اگر اپنی جان لینے کی کوشش کر سکتا تھا تو ان کی بیٹی کو بھی اس حد تک نقصان پہنچا سکتا تھا۔

۳۔ میں انتہائی نکما تھا اور میرا میٹرک تک پاس کر لینا مشکوک تھا۔ جبکہ ان کی بیٹی بہت لائق تھی۔

۴۔ میرا ارادہ انتہائی ناکارہ فیلڈ میں جانے کا تھا جب کہ ان کی نظر میں آرمی کے علاوہ کوئی پروفیشن اس قابل نہیں تھا جسے اپنایا جا سکتا۔

۵۔ میں کم عمری میں ہی عشق و عاشقی کے چکر میں پڑ گیا تھا اور جیسے راہ چلتے ان کی بیٹی پسند آ گئی تھی کل اسی طرح کوئی اور لڑکی بھی پسند آ سکتی تھی۔

۶۔ میں اپنی حرکات سے انتہائی لوفر لگتا تھا جب کہ اس کی بیٹی بہت سلجھی ہوئی تھی۔

۷۔ اب تک میں کچھ نہیں بن سکا تھا اور قوی امید تھی کہ آئندہ بھی کچھ نہیں بن سکتا تھا۔

سو اس کے ڈیڈی نادیہ کا رشتہ یہاں طے کرنے پر کسی صورت تیار نہیں تھے لیکن پھر بابا جان نے نہ جانے جادو کی کون سی چھڑی گھمائی کہ ان سے ایک ملاقات کے بعد ہی وہ راضی ہو گئے۔

میرے لیے وہ دن کتنا پُرمسرت تھا جب نادیہ اپنے امی اور ڈیڈی کے ساتھ کلینک میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھا۔ سیاہ اور سرخ کے امتزاج کا پھولدار کرتا شلوار پہنے' سنہری مائل بال کھولے وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا اسے دیکھنا۔ وہ گلدستہ اور کارڈ میرے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے امی اور ڈیڈی مجھ سے باتیں کرتے رہے لیکن وہ بالکل خاموش بیٹھی نظریں جھکائے اپنے دوپٹے سے کھیلتی رہی۔ کبھی کن انکھیوں سے میری جانب دیکھتی اور مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر نگاہیں چرا لیتی۔ ایسے میں اس کے چہرے کی گلابی رنگت میں سرخی گھلنے لگتی تھی۔

وہ جب تک وہاں موجود رہے اس کے ڈیڈی مجھے انسان بننے کی ہدایات کرتے رہے اور ان کے نزدیک انسان صرف وہی تھے۔ جو خاکی وردی زیب تن کرتے تھے۔ جب کہ میرا انسان بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اب جب امی' ڈیڈی اور بابا جان نے میری خواہش پوری کی تھی تو میرے لیے بھی ضروری تھا کہ میں ان کی خواہش پوری کرتا۔ اور پھر نادیہ کے ڈیڈی کو بھی بتانا تھا ناں کہ میں نکما ہرگز نہیں تھا اور میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کر سکتا تھا۔

گھر والوں اور ڈاکٹروں کی ہدایات نظرانداز کر کے میں نے خوب محنت کی اور وقت پر ہی امتحان بھی دیئے۔ نتیجہ بھی بہت اچھا آیا اور کالج میں پہنچ گیا۔

میرے اور نادیہ کے ملنے پر پابندی تب تک تھی جب تک امتحان ختم نہیں ہو جاتے۔ امتحانوں کے بعد ہم گھر والوں کی موجودگی میں مل سکتے تھے۔ کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا تھا اور کبھی وہ اپنے امی' ڈیڈی یا بھائی کے ساتھ ہماری طرف آ جاتی تھی۔ گھر کے سب لوگوں کے ساتھ وہ گھل مل گئی تھی۔ سب اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ جواباً وہ بھی سب کا خیال رکھتی تھی۔ شروع شروع میں مجھ سے وہ کچھ دور دور رہی' لیکن جب یہ جھجک ختم ہوئی تو ہم دونوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی دوستی کا آغاز ہو گیا۔

اس کے ڈیڈی نے لاکھ کوشش کی کہ میں آرمی جوائن کر لوں' لیکن ان کی ہر بات ماننے کے باوجود بھی میں نے ان کی یہ بات نہیں مانی اور اب مجھے ڈر بھی کس بات کا تھا' نادیہ ہر لمحے' ہر پل میرا ساتھ دیتی تھی۔

وہ ہوم اکنامکس کالج میں چلی گئی تھی اور میں فائن آرٹس پڑھ رہا تھا پھر بھی اکثر ہم دونوں مل کر بیٹھتے تھے ذرا وقت گزرا تو ہم دونوں کو کچھ اور آزادی بھی مل گئی تھی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔

اب جب کبھی ہم پرانے دن یاد کرتے تو بہت ہنستے تھے۔ وہ میرے ''میں نے پالیا۔ میں نے پالیا'' کو یاد کر کے محظوظ ہوتی اور میں سروسز کلب میں اس سے ہونے والی گفتگو یاد کر کے ہنستا۔

وقت یونہی گزر رہا تھا۔ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد میں کوئی ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کر لوں گا اور پھر دو سال بعد میری اور نادیہ کی شادی ہو جائے گی۔

اس نے تھیسز کے سلسلے میں حتی المقدور میری مدد کی۔ وہ بہت ایکسائٹڈ تھی اس بارے میں کیونکہ اس سمیت سبھی کو یقین تھا کہ مجھے Distinction ملے گی۔ جب تک تھیسز ڈسپلے رہا' وہ صبح سے شام تک کالج میں رہی اور جب رزلٹ اناؤنس ہونے میں تھوڑی سی تاخیر ہوئی تو اس کی بے چینی قابلِ دید تھی۔ پھر جب پتا چلا کہ مجھے Distinction ملی ہے تو وہ خوشی سے رو ہی پڑی۔

وہ سب لمحے کتنے خوبصورت تھے۔ جو اس نے میرے نام کر دیئے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ تھی جب اس کے ڈیڈی بھی قائل ہوئے تھے کہ میں نکما ہرگز نہیں ہوں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے مجھے تحفے میں گھڑی بھی دی تھی۔

ابھی مجھے کالج میں کچھ دیر ٹھہرنا تھا لیکن نادیہ کا جانا ضروری تھا۔

''اگر بھائی کی طرف اسلام آباد جانا ضروری نہ ہوتا تو میں ابھی رکتی۔'' اس نے میرے ہاتھ اپنے خوبصورت ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''کتنے دن سے وہ کہہ رہے تھے کہ آؤ تا کہ ریحانہ کی طرف باقاعدہ رشتہ لے جایا جا سکے اور میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ جب تک فیصل کا تھیسز ختم نہیں ہو جاتا' میں تو نہیں آ سکتی۔ امی کو بھی بہت شوق ہو رہا ہے اپنے اکلوتے بیٹے سے ملنے کا۔ شوق مجھے بھی بہت ہے ریحانہ سے ملنے کا' لیکن ایسا ہر کام تمہارے بعد۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔ اس کے موتیوں کی لڑیوں سے دانت چمکے۔ ''میں نے امی سے کہا تھا کہ رات دس بجے تک نکلیں گے لیکن وہ نہیں مانیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ فریش ہو کر ریحانہ کی طرف جائیں۔ میرا بہت موڈ تھا کہ تمہاری Distinction کی خوشی میں' میں ایک شاندار سی پارٹی دوں آج ہی' لیکن اب یہ پارٹی اگلے ہفتے پر ٹل گئی۔'' پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''تم ایسا کرنا کہ اپنے سب فرینڈز کو اگلے جمعہ انوائٹ کر لینا تب تک میں آ چکی ہوں گی۔ اس پارٹی میں' میں سب کچھ اپنے ہاتھ سے بناؤں گی اور تب ہی میں تمہیں گفٹ بھی دوں گی۔

''بتاؤ' کیا گفٹ چاہیے تمہیں؟''

''تم سے تھوڑی سی قربت یعنی نکاح۔'' میں نے کہا۔

ایک لمحے کو اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ اور پھر ہنس پڑی۔ ''تم معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ شادی دو سال بعد ہو گی۔''

''معاہدے کی خلاف ورزی تو میں کروں گا ہی کیونکہ دو سال بہت طویل عرصہ ہے لیکن

یہ خلاف ورزی آہستہ آہستہ کروں گا۔ پہلے نکاح اور پھر چند دن بعد رخصتی پر زور۔''

وہ پھر ہنس پڑی۔ ''تم نے بھی عجیب سا گفٹ مانگا ہے سوچنے دو کہ ڈیڈی کو کیسے مائل کروں۔''

''تمہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا' میرے بابا جان بات کر چکے ہیں۔ امید ہے اسلام آباد سے واپس آنے کے بعد جلد ہی کوئی تاریخ رکھ دی جائے گی۔''

''تم کتنے گھنے ہو' مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی۔ میں سب کچھ بتا دیتی ہوں تمہیں اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ بابا جان ڈیڈی سے بات کر چکے ہیں۔ ذرا مجھے اسلام آباد سے آ جانے دو پھر پوچھوں گی تمہیں۔''

وہ چلی گئی اور میں دوستوں کی مدد سے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

''رات بارہ بجے تک اسے اسلام آباد پہنچ جانا چاہیے اور سوا بارہ بجے تک اسے مجھے فون کر کے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دے دینی چاہیے۔'' میں نے حساب لگایا۔

میں اس کے فون کا انتظار کرتا رہا لیکن اس کا فون نہیں آیا۔ ہاں وہ فون آیا جس نے سب کچھ ختم کر دیا۔

''کھاریاں کے قریب اس کی کار کا ایک کوسٹر کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا ہے' وہ زخمی ہے۔''

لیکن یہ جھوٹ تھا کہ وہ زخمی ہے۔ جب میں کھاریاں سی ایم ایچ پہنچا تو پتا چلا کہ وہ وہیں موقع پر دم توڑ گئی تھی۔ وہ بھی اور اس کی امی بھی۔ اس کے ڈیڈی شدید زخمی تھے۔

کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ خبر میرے لیے کیا تھی۔ میں سانس لے رہا تھا لیکن اپنے اندر سے مر گیا تھا۔ میرے لیے دنیا اسی لمحے ختم ہو گئی تھی جب نادیہ نہیں رہی تھی تو دنیا میں کیا رہ گیا تھا۔ اسی لمحے قیامت کیوں نہیں آ گئی تھی۔ یہ دنیا اسی کے لیے' اسی کی خاطر تو آباد تھی تو جب وہ نہیں تھی تو دنیا کیوں قائم تھی۔

میں کبھی اس اذیت ناک وقت کو یاد نہیں کرنا چاہتا۔ دہرانا نہیں چاہتا۔

تم بتاؤ سحر کیا میں کبھی نادیہ کو بھول سکتا ہوں؟ میرے اور اس کے بیچ کوئی آ سکتا ہے؟''

وہ اپنی بات ختم کر چکا تھا اور میں سحر کی سی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''بولو۔ کیا تم میرے اور نادیہ کے بیچ آسکتی ہو؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا اور میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ زندگی کی تلخیاں میری برداشت سے باہر ہو چکی تھیں۔

''تم کیوں ڈرتی ہو کہ میں تمہارے اور تیمور کے بیچ آجاؤں گا۔'' اس نے میرے ہاتھ میرے چہرے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''کسی ایک انسان سے محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم نے دوسرے سے محبت کرنا چھوڑ دی ہے۔ ہمارے دل میں بہت جگہ ہوتی ہے۔ اس میں بہت سے لوگوں اور بہت سے رشتوں کو اکٹھے سمویا جا سکتا ہے۔

تم بھی یہ بات سمجھ جاؤ گی' لیکن شاید اس میں کچھ وقت لگے۔ میری غلطی ہے کہ میں نے تمہیں اس غم کو اپنے اندر جذب کرنے کا وقت نہیں دیا لیکن جانتی ہو میری جلد بازی کی وجہ کیا ہے؟ میں تمہیں اتنی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا' کیونکہ میں ایسی ہی تکلیف سے گزر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ دکھ انسان کو کیسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اس کے باوجود تم میرے اور نادیہ کے بیچ میں نہیں ہو لیکن تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔ چاہو تو مجھ سے محبت نہ کرو۔ یہ زبردستی کا رشتہ ہوتا نہیں ہے لیکن پلیز اپنی زندگی کو یوں ختم مت کرو۔ کیونکہ جب تک تمہاری سانسیں لکھی ہیں تب تک تم زندہ رہو گی۔ اپنی زندگی کو خود اپنے لیے اذیت ناک مت بناؤ۔''

وہ باہر چلا گیا اور میں اپنی خواب گاہ میں تنہا رہ گئی۔ جاتے جاتے وہ میرے لیے ایک سوال چھوڑ گیا تھا۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دو افراد سے بیک وقت ایک نوعیت کی محبت کر سکیں؟''

☆======☆======☆

اس کا جواب اتنا سادہ اور آسان نہیں تھا۔ جبکہ ایک جانب میری تیمور سے شدید محبت تھی اور دوسری جانب نہ ختم ہونے والی محرومیاں۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ جواب کی تلاش کرتے وقت اپنی محبت اور محرومیوں کے احساس سے الگ ہو سکتی۔

میں شاید اس کے اور نادیہ کے بیچ میں نہ آسکتی' لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ وہ میرے اور تیمور کے بیچ آگیا تھا' ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ میں اس کے بارے میں مسلسل سوچ رہی

تھی؟ میرا خوف درست ثابت ہو گیا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ ڈالوں۔ آخر میرے لیے ہی اتنے امتحان کیوں تھے۔ تیمور کے لیے میری دیوانگی کی حد تک محبت مجھے مجبور کر رہی تھی کہ فیصل ہی کیا اس کے لیے میں یہ دنیا ہی چھوڑ دوں۔ جب وہ نہیں ہو گا تو دنیا میں کیا رہ جائے گا۔ لامتناہی تنہائی کے علاوہ؟

اور لامتناہی تنہائی کا احساس الگ کچوکے دے رہا تھا۔ مجھے سب کچھ مل جاتا تب بھی میری کوکھ خالی ہی تھی۔ اس اذیت کو کون جان سکتا ہے جو یہ احساس مجھے دیتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ محبت میں سود و زیاں ہوتا ہے یا نہیں۔ مگر جب یہ احساس میرے دل میں جاگتا تھا تو میں انتہائی تلخ ہو جاتی تھی۔ تیمور سے کم از کم اتنا شکوہ ضرور کرتی تھی۔ وہ سن نہیں سکتا تھا میرے آنسو' میری محرومی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں یہ شکوہ کیا کرتی تھی۔ وہ جان پاتا یا نہیں اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔ مجھے دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

یا شاید میرے خوف کی بنیاد ہی یہ تھی کہ میں تیمور کے ساتھ ساتھ فیصل سے بھی محبت کرنے لگی تھی۔ یہ خیال انتہائی تکلیف دہ تھا۔ میں اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن کیا یہ حقیقت نہیں تھی؟

میں کیوں اس کی موجودگی میں بے چین رہتی تھی؟ کیوں ہر وقت اس کا موازنہ تیمور سے کرتی رہتی تھی۔ اور پھر خوفزدہ ہو کر اس کی ذات رد کرنے لگتی تھی؟ خود کو باور کرانے کی کوشش کرتی تھی کہ فیصل مجھے سخت ناپسند تھا۔ اس کے آتے ہی خود کو اپنی خواب گاہ میں مقید کر لیتی تھی۔ میں نے ہر طرح کوشش کی تھی کہ وہ میرے نزدیک نہ آسکے۔ اس کے ساتھ میرا رویہ انتہائی روکھا پھیکا ہوتا تھا اور میں خود کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ چونکہ ان سب نے میری ممی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس لیے مجھے ان سب سے نفرت تھی۔

اس انکشاف نے جیسے مجھے برف کا بنا دیا تھا۔ میرے اندر دور دور تک خلا پھیل گیا تھا۔ میں تیمور سے بے وفائی پر آنسو بہانا چاہتی تھی لیکن آج میری آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ قدرت کی ستم ظریفی پر قہقہے لگانا چاہتی تھی لیکن گہرے سناٹے نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

میں نہیں جانتی کہ فیصل کب اور کیسے میرے دل میں اتر آیا تھا۔ میں ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہوتی تو ممکن ہے اس کی طرف ایک کے بعد دوسری نگاہ کبھی نہ ڈالتی' یا شاید وہ باقی دوستوں کی طرح ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میرے حلقۂ احباب میں شامل ہو جاتا۔ پتا نہیں کیا ہوتا' لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ یوں میرے دل پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید میری محرومیوں نے مجھے بہت کم ہمت بہت کمزور کر دیا تھا اور شاید انہی کو سیڑھی بنا کر وہ میرے دل میں اُترا تھا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا۔ اب حقیقت صرف اس قدر تھی کہ بے شک تیمور کے لیے میری محبت اتنی ہی شدید تھی لیکن وہ تنہا میرے دل کا مالک نہیں تھا۔

میرے گرد سناٹے گہرے ہو گئے تھے۔ پاپا پوچھتے تھے۔

''سجو آپ نے جاب کے بارے میں کیا سوچا پھر؟''

اور میں حیران ہو جاتی تھی' وہ کتنی فضول سی بات کے متعلق استفسار کر رہے تھے۔

نبیلہ سی ایس ایس کی تیاری چھوڑ کر اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ خریداری کے وقت اس کے ساتھ ساتھ رہوں اور میں اس بارے میں انکار نہیں کر سکتی تھی لیکن جب اچانک وہ پینوراما یا برکت علی کی دکان میں کسی ساڑھی پر ہاتھ رکھ کر بہت شوق کے ساتھ مجھ سے پوچھتی۔

''سجو' یہ میرے اوپر کیسی لگے گی؟''

تو میں چونک جاتی تھی۔ سوچتی تھی کہ زندگی میں ان چیزوں کی آخر کیا اہمیت تھی؟ کیوں وہ اس قدر شوق سے رنگ برنگ اور چمک دمک والے کپڑوں کے انتخاب میں پریشان ہو رہی تھی؟

اور جب نیلوفر انتہائی جوش و خروش سے کہتی۔

''قسم سے سجو کیا تباہی اشتہار بنایا ہے بسکٹ کا ہماری کمپنی نے' تو دیکھے گی تو پاگل ہی ہو جائے گی۔'' اور میں بیزار ہو جاتی تھی۔ یہ سب کتنی بیکار کی باتیں تھیں۔

مجھے بھی سب نے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ شاید سبھی کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ آخر کوئی کب تک دن رات کے چوبیس گھنٹے ایک ہی شخص کی دل جوئی میں صرف کر سکتا ہے۔ یا پھر شاید سب کے نزدیک یہ بھی میرے علاج کا ایک طریقہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے اپنی زندگی کے جگسا پزل کے ٹکڑے جوڑ کر بے ربط کہانی کو

ترتیب دینے کی کوشش کرتی رہتی تھی اور لاؤنج سے قہقہے اور افراتفری' شور شرابے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

کبھی میں تنہا ہی بابا جان کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ ہم گھنٹوں اکٹھے گزار لیتے تھے۔ بغیر بور ہوئے۔ جب بھی ہم ملتے تھے۔ پہلے ایک گھنٹے میں ممی کے متعلق ڈھیروں باتیں کرتے تھے۔ بابا جان مجھے ان کی بنائی ہوئی پینٹنگز دکھاتے تھے۔ ان کی لائبریری میں رکھی کتابوں پر لکھے ان کے دلچسپ تبصرے سناتے تھے۔ ان کے پیانو کے قریب بیٹھ کر ان تمام دھنوں کو دہراتے تھے جو کبھی ممی بجایا کرتی تھیں۔ یہ یادیں کبھی ہمیں ہنساتی تھیں اور کبھی بہت رلاتی تھیں۔ پھر ہمارے آنسو ہمیں سناٹوں کے سمندر میں دھکیل دیتے تھے۔ اس کے بعد ہم دونوں گھنٹوں گم صم' اپنی سوچوں میں ڈوب کر گزار دیتے تھے۔

لیکن اب بھی میرا ایک معمول برقرار تھا۔ میں اب بھی تیمور کے پاپا کو فون کرتی تھی اور وہ میرے فون کے منتظر رہتے تھے۔ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں ایک تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح مجھ سے باتیں نہیں کرتے تھے۔ اب وہ اتنا چاہتے تھے کہ انہیں ایک پنچنگ بیگ ہمیشہ میسر رہے۔ اپنا غصہ اور اپنی بے بسی نہ وہ تیمور پر نکال سکتے تھے' نہ اس کی ممی پر۔ مجھ سے وہ ایک عجیب و غریب رشتے میں منسلک تھے۔ انہیں مجھ سے نفرت تھی کیونکہ میں اپنی خودغرضی میں تیمور سے طلاق نہ لے کر اسے اذیت میں مبتلا کر رہی تھی اور انہیں مجھ سے محبت تھی کیونکہ میں ان کی نفرت کے اظہار کو برداشت کر رہی تھی۔ ان کی بے بسی سمجھتی تھی۔ جب بھی میں انہیں فون کرتی تھی' وہ سب سے پہلے مجھے طلاق لینے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور جب میں ان کی یہ بات نظرانداز کر کے تیمور کے متعلق دریافت کرتی تھی۔ تو ان کے اندر غصے اور بے بسی کا لاوا اُبلنے لگتا تھا۔ میں سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی رہتی تھی۔ جب وہ تھک جاتے تھے تو فون بند کر دیتے تھے اور میں جانتی تھی کہ اسی لمحے سے وہ میرے اگلے فون کا انتظار کرنے لگتے تھے۔

ہر شام کی طرح اس شام بھی میں راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے اپنی زندگی کے ٹوٹے' بکھرے ٹکڑے جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا یہ سب یوں جھولتے ہوئے ٹھیک ہو جائے گا؟'' غصے کی ایک تیز لہر نے مجھے اپنی

لپیٹ میں لے لیا۔ ''نہیں یوں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا اور تب تک حل نہیں ہوگا جب تک میں اسے حل کرنے کی کوشش نہیں کروں گی۔''

راکنگ چیئر سے اُٹھ کر میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چلی آئی۔ بالوں میں برش پھیرا' لپ اسٹک لگائی اور بیگ کندھے پر ڈال کر اپنی خواب گاہ سے باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں چھوٹے ماموں کی ساری فیملی اکٹھی تھی۔ سلمان بھائی' ان کی بیوی اور بچے' آپا' ان کے میاں اور بچے' تہمینہ' ماموں' ممانی اور فیصل' وہ سب چھوٹی چھوٹی خوشیاں ایک دوسرے سے شیئر کر کے خوش ہو رہے تھے۔ بچوں کی معصوم حرکتوں پر قہقہے لگا رہے تھے۔ دلچسپ نوک جھونک میں مشغول تھے۔ میں دروازے میں کھڑی سب کو دیکھ رہی تھی لیکن انہوں نے مجھے دیکھنے کے باوجود نظرانداز کر دیا۔

''فیصل۔'' بالآخر میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ہوں۔''

''میرے ساتھ آ سکتے ہو؟''

''اوہ شیور۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

کسی نے ہماری جانب توجہ نہیں دی۔ شاید جان بوجھ کر ہم باہر نکل گئے۔

''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کہیں بھی' مجھے تمہارا مشورہ چاہیے۔''

''میرا مشورہ؟ شاید میں تمہیں کچھ اچھا مشورہ نہ دے سکوں۔''

''صرف تم ہی مجھے مشورہ دے سکتے ہو' پلیز انکار مت کرنا۔ کیونکہ تم ہی میری تکلیف کو سمجھ سکتے ہو۔ نہ پاپا' نہ بیلا نہ فرد۔ کوئی نہیں۔ میں اپنی زندگی کے شاید سب سے بڑے کرائسس سے گزر رہی ہوں اور اس سے نکلنا چاہتی ہوں۔ باقی سب میرے مسئلے کو میرے حوالے سے سوچتے ہیں۔ میرے حوالے سے اسے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے رویے میں غیر جانبداری نہیں ہے۔''

''غیر جانبدار تو میں بھی نہیں ہوں۔ ممکن ہے میرے مشورے کو تم میری غرض سمجھو۔'' وہ بولا۔

''تو کیا کہیں کوئی بھی نہیں' جو مجھے اس کرائسس سے نکال سکے۔'' میں مایوس ہوگئی۔

''صرف تم ہی خود کو اس کرائسس سے نکال سکتی ہو اور کوئی نہیں۔ اچھا جانے دو۔ اب ہم باہر نکل ہی آئے ہیں تو چلو تمہیں کسی سے ملواؤں۔'' اس نے کار ڈیفنس سے باہر کے راستے پر ڈال دی۔

''کس سے؟''

''بہت اچھے لوگ ہیں۔ تم مل کر مایوس نہیں ہوگی۔''

میں پھر اپنی سوچوں میں گم ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد کار کیولری گراؤنڈ کے ایک خوبصورت سے مکان کے گیٹ سے گزر کر ڈرائیو وے پر رک گئی۔

''یہ کس کا گھر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رشتہ تو کوئی بھی نہیں ہے لیکن یہ سب لوگ میرے دل میں رہتے ہیں۔'' پھر اس نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔ ''دیکھ لو اس ایک دل میں کیا کیا چھپا رکھا ہے میں نے۔''

ڈور بیل کے جواب میں ایک وجیہہ مرد نے دروازہ کھولا۔

''واہ آج تو خوب آئے۔ ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔'' وہ گرم جوشی سے فیصل سے گلے ملا۔

''یہ جمیلہ ہیں میری کزن بھی اور دوست بھی۔'' فیصل نے میرا تعارف کرایا۔

''آج تو تم نے حد ہی کر دی۔ اچھا اندر آؤ۔ ڈیڈی' تمہاری بھابی اور بچے سب ہی تمہیں بری طرح مس کر رہے تھے۔''

ہم تینوں اندر آ گئے۔ میں کچھ الجھن سی محسوس کر رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے۔ خواہ مخواہ ہی فیصل مجھے وہاں لے آیا تھا۔ میرے لیے اس وقت صرف اپنے مسئلے کی اہمیت تھی۔ جو مجھے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔

لاؤنج کی فضا میں ہنسی اور قہقہے گونج رہے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو دو پیارے پیارے بچے آ کر فیصل سے لپٹ گئے۔

''انکل! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ آپ نے آئس کریم کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔'' ایک بچہ چلایا۔

''اور مجھے ۲۰۰۱ (سی تو تھ ورنڈ اینڈ ون) لے جانے کا کہا تھا جب آپ لوڈو میں ہار گئے تھے۔'' دوسرا پہلے سے زیادہ زور سے چلایا۔

"بی ہیو یور سیلف سنی اینڈ گڈو۔ انکل کو بیٹھنے تو دو۔" بچوں کی ماں نے انہیں جھڑکا۔

"یہ سنی ہے۔" فیصل نے تعارف کروایا۔ وہ پیارا سا بچہ چار سال کا تھا۔ پھر اس نے چھوٹے بچے کی طرف اشارہ کیا جو غالباً تین سال کا تھا۔ "اور یہ گڈو ہے۔ اور یہ سنی کی مما ہیں جو بہت مزے دار کھانے پکاتی ہیں۔ بالکل جیسے بیلا پکاتی ہے اور یہ ہیں میجر جنید۔ یہ ڈیڈی ہیں۔" اس نے ایک بزرگ کی طرف اشارہ کیا جو ہماری وہاں آمد سے بہت خوش تھے۔ "اور بچو! یہ ہیں آپ کی آنٹی جمیلہ۔"

"یہ وہی آنٹی ہیں ناں انکل۔" سنی کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر جھک کے فیصل کے کان میں سرگوشی کی۔

فیصل ہنس پڑا اور جواباً اس کے کان میں سرگوشی کی۔

میری اُلجھن میں اضافہ ہو گیا۔

وہ سب میری جانب متوجہ تھے' مجھ سے بہت محبت کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ بھابی نے کھانے پینے کی کتنی چیزیں میرے سامنے ڈھیر کر دی تھیں۔ ڈیڈی مجھ سے این سی اے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے تھوڑی دیر قبل والی اُلجھن بالکل ختم ہو گئی۔

"آپ فیصل کی کلاس فیلو تھیں؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے تو کبھی کالج میں فیصل کو نہیں دیکھا تھا۔ جب میں نے ایڈمیشن لیا تھا اس سے کچھ پہلے فیصل کا تھیسز ختم ہو گیا تھا۔"

"بہت محنت طلب کام ہے یہ تھیسز بھی۔ دن رات کا ہوش نہیں رہتا۔" وہ بولے۔

"جی مجھے یاد ہے کام کر کے یوں لگنے لگا تھا جیسے پاگل ہی ہو جائیں گے۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کب دن ہوا' کب رات۔" میں نے کہا۔

"فیصل کا تو خیر یہ کام تھا ہی' مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے تھیسز فیصل کا نہیں نادیہ کا ہو۔" وہ آہستہ سے ہنسے۔

میں چونک گئی۔ وہ کون تھے؟ نادیہ سے ان کا کیا رشتہ تھا۔ سوالیہ نگاہوں سے میں نے فیصل کی جانب دیکھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو بچو آئس کریم کھانے چلیں اور ۲۰۰۱ سٹی بھی ہو آئیں۔"

سنی اور گڈو اُچھل ہی پڑے۔

"اور انکل پیس' بھی چلیں گے۔" سنی چلایا۔

"چپ کرو۔ تم لوگ زیادہ ہی سر چڑھ گئے ہو۔" بھابی نے بچوں کو گھورا۔

"نہیں بھابی ڈانٹیں نہیں۔" فیصل نے کہا پھر بچوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "چلو اپنے جوتے پہنو' جلدی کرو۔ بھابی آپ اور جنید بھائی بھی چلیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم ساتھ چلو گی یا یہیں ٹھہرو گی؟"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ مجھے بتائے بغیر نادیہ کے گھر لے آیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ مجھے غیر جانبداری سے کوئی مشورہ نہیں دے سکتا تھا لیکن یہاں ڈیڈی غیر جانبدار رہ کر مجھے مشورہ دے سکتے تھے۔

"میں یہیں رکوں گی۔" میں نے کہا۔

"ہمیں شاید کچھ وقت لگ جائے' تم پریشان مت ہونا۔ میری ضرورت پڑے تو مجھے پیج کر لینا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ سب چلے گئے۔ لاؤنج میں' میں اور ڈیڈی رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں نے اس سکوت کو توڑا۔

"مجھے فیصل نے نادیہ کے متعلق بتایا تھا۔"

ان کی آنکھوں میں یادوں کے رنگ پھیل گئے۔

"مجھے بہت افسوس ہوا۔" میں نے بات آگے بڑھائی۔

"جانے والے اپنے ساتھ بہت کچھ لے جاتے ہیں بس ان کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ رونے سے کوئی واپس آ سکتا تو ہم نے دریا بہا دیئے ہوتے مگر جانے والے کب آتے ہیں۔ ہاں اتنے برس بیت جانے کے بعد مجھے ایک سبق ملا۔" وہ کہتے کہتے رک گئے اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولے۔ "آپ مجھے نادیہ جیسی لگ رہی ہیں۔ میں آپ کو بیٹی کہہ سکتا ہوں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو جمیلہ بیٹی مجھے یہ سبق ملا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم نے زندگی میں خوشی کے لمحے گزارے ہوتے ہیں۔ جب وہ ہم میں نہیں رہتے اور ہم ان کے لیے آنسو بہاتے ہیں تو ان

کی روح کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔

آپ کی آنٹی نے زندگی بھر خود سے بڑھ کر میرا' بچوں اور گھر کا خیال رکھا۔ نادیہ میری اتنی پیاری بیٹی تھی کہ اسے میرے ماتھے کے بل گوارا نہیں تھے۔ وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتی تھی جس سے مجھے تکلیف ہو۔

میں نے سوچا کہ جب انہوں نے اپنی زندگی میری خوشی کے لیے وقف کر دی تو کیا ان کے لیے میں اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ آج میں انہیں کوئی دکھ نہ دوں۔ میری بیٹی جو میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی اب جب اس کی روح مجھے روتے دیکھتی ہوگی تو اس پر کیا بیتتی ہوگی۔

پتا نہیں جمیلہ بیٹی آپ روح کو حقیقت سمجھتی ہیں یا محض خیال لیکن میں روح کو حقیقت ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی آنٹی اور نادیہ اب بھی میرے گرد ہیں صرف میں انہیں دیکھ نہیں سکتا جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ان کی خاطر ویسے ہی ہو جاتے ہیں جیسا کہ وہ ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی زندگی میں وہ میری خاطر ویسی ہی رہیں جیسا کہ میں انہیں دیکھنا چاہتا تھا تو کیا یہ ان کا حق نہیں کہ میں بھی ویسا ہی بن جاؤں جیسے وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھیں؟

نادیہ میرے گھر کی رونق' زندگی اور روشنی تھی۔ جنید آٹھویں کلاس سے ہی ملٹری کالج کے لیے ایسے گھر سے نکلا کہ پھر ہم سے دور ہی رہا۔ ملٹری کالج کے بعد جے بی سی پھر پی ایم اے پھر نوکری۔ سو ہمارے گھر کی ساری رونق نادیہ ہی تھی۔ وہ بہت خوش رہنے والی ہنس مکھ اور شور شرابہ کرنے والی تھی' اسے اپنی طرح ہنسنے' خوش رہنے والے لوگ پسند تھے۔ خاموشی تنہائی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔

جب وہ ہم سے بچھڑ گئی تو جیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہی گھر جو اس کی دلچسپ باتوں اور قہقہوں سے جیسے روشن روشن سا لگتا تھا' ایک دم تاریک ہو گیا۔ میں تو اس کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا۔ نہ اس کا' نہ آپ کی آنٹی کا۔ جب ٹھیک ہو کر گھر آیا تو ویران در و دیوار دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ صرف چند دن میں جیسے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ میں ان ڈاکٹروں پر بھی برس پڑا جو مجھے موت کے منہ سے کھینچ لائے تھے۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے تھی۔

لیکن آئندہ مجھے ایسی ہی زندگی گزارنی تھی۔ آپ کی آنٹی اور نادیہ کے بغیر۔

پھر بہت دن بیت گئے تب مجھے سمجھ آئی کہ ان کی محبت میں' مَیں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہا۔ میں تو اُلٹا اُن کو دکھ دے رہا تھا۔ جب نادیہ کی روح اس گھر میں آتی ہوگی

تو اسے کتنا دکھ' کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ وہ خاموشیوں اور تنہائیوں سے دور بھاگتی تھی اب وہ کس احساس کے ساتھ اس گھر میں داخل ہوتی ہوگی؟

یوں رہنا آسان نہیں ہے لیکن دنیا کو قائم رکھنے کے لیے یوں رہنا پڑتا ہے۔ سو میں نے خود کو تبدیل کرنا شروع کیا۔ ویسا بنانا شروع کیا جس سے نادیہ خوش ہو۔ پھر میں نے جنید کی شادی کی۔ یہ آپ کی آنٹی کی بڑی خواہشوں میں سے ایک تھی۔ نادیہ چلی گئی تھی اور ریحانہ آ گئی تھی۔ بہو بھی تو بیٹی ہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میری ایک بیٹی واپس لے لی تو ایک دے بھی دی۔ وہ بہت مہربان ذات ہے۔ اگر ہم اس کی مہربانیوں پر نگاہ ڈالیں تو۔ افسوس کہ انسان کو اس کی توفیق کم ہی ہوتی ہے۔ ہم دکھوں کا شکوہ تو کرتے ہیں لیکن اس کی مہربانیوں کے شکر گزار نہیں ہوتے۔

ریحانہ آئی تو گھر پھر رہنے کے قابل ہو گیا۔ یہاں پھر رونق' روشنی اور زندگی آ گئی۔ پہلے سنی آیا پھر گڈو جن کی وجہ سے ہر وقت در و دیوار سے مسرت پھوٹتی رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے اب جب بھی نادیہ یہاں آتی ہوگی تو بہت خوش ہوتی ہوگی۔ اسے ایسے گھر ہی اچھے لگتے تھے۔''

وہ خاموش ہو گئے تھے۔

میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ''آخر اللہ تعالیٰ اتنے پیارے لوگوں کو ہم سے کیوں چھین لیتا ہے؟''

''وہ چھینتا نہیں ہے اپنے پاس بلاتا ہے۔ ہم سب کو اس کے پاس جانا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کو پہلے چلے جانا ہے اور کسی کو بعد میں۔ غور کریں تو موت وہ واحد حقیقت ہے جس میں کسی قسم کا جھول نہیں ہے۔''

میں خاموشی سے روتی رہی۔

''نادیہ کی موت نے فیصل کو بھی جیسے ختم کر دیا تھا وہ پاکستان چھوڑ کر پہلے انگلینڈ اور پھر امریکہ چلا گیا۔ اب کتنے برسوں بعد لوٹا ہے۔ میں نے اس سے بھی کہا کہ یہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔ نادیہ تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی' یوں خود کو مار کر تم نادیہ سے اپنی محبت کا ثبوت پیش نہیں کر رہے۔ الٹا اسے دکھ دے رہے ہو۔ جب اس نے تمہیں اپنی زندگی میں کوئی دکھ نہیں دیا تو تمہیں کیا حق ہے کہ تم اسے دکھی کرو۔

تم زندہ ہو' زندہ رہو۔ کیا تم اللہ تعالیٰ سے لڑنا چاہتے ہو؟ زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

نعمت ہوتی ہے' اس کا شکر ادا کرو۔ تم نے کبھی اس کی مہربانیوں کو شکر گزاری کی نظر سے نہیں دیکھا جبکہ اس کی مہربانیاں بے شمار ہیں۔ ہاں جب اس نے تم سے ایک ہستی واپس لے لی تو تم شکایت کرنے لگے۔

جمیلہ بیٹی! مجھے فیصل نے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ وہ زندگی جیسی نعمت کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونے لگا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں' فیصل کو میں برسوں سے جانتا ہوں جب ابھی وہ صرف اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ کون شخص غیر خاندان اور غیر مانوس لوگوں میں اپنی بیٹی کا رشتہ اتنی کم عمری میں طے کرتا ہے؟ لیکن میں نے کیا کیونکہ فیصل تب بھی بہت اچھا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ جو بھی لڑکی رہے گی' وہ بہت خوش رہے گی۔''

میں ضبط کی کوشش کر رہی تھی لیکن آنسو میرے اختیار میں نہیں تھے۔

''ڈیڈی میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی کہ میں کیا کروں۔ میری مدد بھی کوئی نہیں کر سکتا۔''

''دیکھیں جمیلہ بیٹی جانے والوں کی یادیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام مت کرو۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جائز قرار دیا ہے۔ زندگی میں خوشیاں اور غم آتے رہتے ہیں لیکن ایک غم کے بعد اپنے اوپر خوشیوں کے دروازے بند نہیں کرنے چاہئیں۔ خوشیوں کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے۔ بیٹی میرا اور آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں آپ کو رائے یا مشورہ دینے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ پھر بھی کہہ رہا ہوں کہ اپنے لیے خوشیوں کو حرام مت قرار دے دینا۔ خوشی اور محبت قسمت والوں کو ملتی ہے۔ یہ جہاں سے جتنی ملے۔ اپنی جھولی میں بھر لینا۔''

میں خاموش بیٹھی رہی' وہ بھی چپ رہے۔

کافی دیر بعد میں بولی۔ ''تیمور مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔''

''جب آپ نے اب تک اسے کوئی دکھ نہیں دیا۔ اس کی زندگی کے بدترین لمحات میں اس کا ساتھ دیا ہے تو اب اسے کیوں دکھ دے رہی ہیں۔ فیصل نے مجھے بتایا ہے کہ وہ سخت تکلیف میں ہے۔ جسمانی تکلیف تو ہے ہی ساتھ اسے یہ دکھ بھی چاٹ رہا ہے کہ اس نے آپ کو بھی کوئی خوشی نہیں دی۔ جمیلہ بیٹی اسے اس دکھ سے نکال لیں۔ ممکن ہے اس طرح اس کی کچھ تکلیف کم ہو جائے۔ یوں بھی محبت دینا ہی دینا ہوتی ہے۔ وہ آپ کو طلاق دے دے یا

نہیں' اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کوئی اور وقت ہوتا تو میں کبھی آپ کو یہ مشورہ نہ دیتا لیکن اب بات دوسری ہے۔ اس نے زندگی بھر آپ سے جو کچھ طلب کیا' اس میں سے یہ اس کی آخری خواہش ہے۔ اسے پورا کر دیں۔ آج نہیں تو کل وہ ہم سے بہت دور چلا جائے گا۔ اسے اس دکھ کے ساتھ موت کے سفر پر روانہ مت کریں جو تنہائی کا سفر ہے۔ کم از کم اسے یہ سکون دے دیں۔ وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوگا تو جسمانی تکلیف اور آزار سے آزاد ہو جائے گا لیکن کہیں اس کی روح پر لگا یہ زخم اس کے ساتھ نہ چلا جائے۔''

☆======☆======☆

وہ پہلے سے بہت زیادہ کمزور ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں اسے پہچان ہی نہیں سکی۔ بستر پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ میرا دل غم سے پھٹنے لگا۔

یہاں آتے ہوئے میں اس حقیقت کے لیے خود کو تیار کر کے آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت کمزور ہو چکا ہے۔ اتنا کہ اسے پہچاننا تک مشکل تھا۔ یہ بات مجھے اس کے پاپا بہت مرتبہ بتا چکے تھے۔ پھر بھی اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا۔ سننا الگ بات ہوتی ہے دیکھنا بالکل الگ۔

کل رات حسبِ معمول میں نے اس کے پاپا کو فون کیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح مجھ پر غصہ ہوئے۔ مجھے ڈانٹا برا بھلا کہا اور میں بھی ہمیشہ کی طرح ان کی گفتگو سنتی رہی جب وہ تھک گئے تب میں بولی۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے پاپا۔''

''کیسا فیصلہ؟''

''تیمور چاہے تو مجھے طلاق دے دے۔'' یہ میں ہی جانتی تھی کہ کس دل سے میں نے یہ بات کہی تھی۔

وہ شاک کی سی کیفیت میں رہ گئے۔ ''کیا؟''

میں خاموش رہی۔ یہ الفاظ دہرانا میرے لیے بہت مشکل تھا۔

''جمیلہ' ہیلو جمیلہ' تم کیا کہہ رہی ہو؟'' انہوں نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

''وہی جو آپ نے سنا ہے اور یقین نہیں کیا۔'' میں نے فون بند کر دیا تھا۔

اور پھر آدھے گھنٹے بعد ہی ان کا رنگ آ گیا۔

''میں نے تیمور کو بتادیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

میں خاموش رہی۔

''جمیلہ! میری بات سن رہی ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہوں۔''

''وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

اور انکار کر دینا میرے بس میں کہاں تھا۔ اب اس سے ملنا میرے لئے بہت اذیت ناک تھا پھر بھی میں اس سے ملنے کے لیے تیار تھی۔

گھر میں، میں نے سب کو بتا دینا مناسب سمجھا۔ نبیلہ کے پیالی میں چائے انڈیلتے ہاتھ رک گئے۔ پاپا نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ فیصل اپنی سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن میری بات پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا۔ نبیلہ نے چائے کی پیالی پاپا کو پکڑا دی اور انہوں نے ہونٹوں سے لگالی۔ اس نے دوسری پیالی میں چینی گھولی اور فیصل کی طرف بڑھادی۔

''پلیز کچھ بولیں آپ لوگ۔ آپ سب کی خاموشی سے مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میں تنہا ہو گئی ہوں۔ پلیز پاپا' بیلا' فیصل کچھ تو کہیں آپ سب۔'' میں روہانسی ہوگئی۔

''تمہارے سب فیصلے تمہارے اپنے ہوتے ہیں ججو! تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ ہم پہلے بھی تمہارے ساتھ تھے آئندہ بھی ہوں گے۔ کیونکہ یہ ہماری مجبوری ہے ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔'' بالآخر نبیلہ نے کہا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے پاپا کی طرف دیکھا' وہ کندھے اچکا کر رہ گئے۔ آنسوؤں کا پردہ دبیز ہو گیا۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے فیصل کی طرف دیکھا۔

''میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔'' اس نے کہا۔

''میرا یہ فیصلہ غلط تو نہیں؟''

''یہ کون جانے۔ کتنا ہے' اتنا کافی ہے کہ تم اب بھی اپنے لیے فیصلہ کر سکتی ہو۔'' وہ بولا۔

جب سے میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہاری تھی تب سے میری خود اعتمادی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میں ٹھیک کر رہی تھی یا غلط۔ میرے سامنے انتخاب کے دوراستے تھے ہی نہیں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

اس کے گھر کے باہر۔ ہاں وہ اسی کا گھر تھا' تیمور کا۔ آج اس گھر سے آخری رشتہ بھی ختم

ہونے والا تھا۔

اس کے گھر کے باہر کار رکی تو میرے قدم من من بھر کے ہو گئے۔

''تیمور تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔'' فیصل نے مجھے مخاطب کیا۔

اپنی طرف کا دروازہ کھول کر میں باہر نکلنے لگی۔

''آل دی بیسٹ۔''

میرے جاتے جاتے فیصل نے کہا۔

اور میں ذہنی طور پر تیار تھی۔ جانتی تھی کہ تیمور بہت کمزور ہو چکا ہے پھر بھی اسے اس حالت میں پڑا دیکھ کر دل میں ٹیس سی اُبھری۔ میں اسے کہنے آئی تھی کہ اگر وہ مجھے طلاق دے کر خوش ہو سکتا ہے تو اس کی خوشی کی خاطر میں اس کے لیے تیار تھی۔

لیکن اسے اس حالت میں دیکھ کر میرا ارادہ بدلنے لگا تھا۔ اسے اس وقت میری ضرورت تھی۔

مجھے دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کی۔

''پلیز تیمور! لیٹے رہو۔'' میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ لٹا دیا۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کبھی وہ ہاتھ مضبوط اور زندگی سے بھرپور تھا۔ آج کتنا ناتواں ہو رہا تھا۔

''میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ججو۔'' اس نے نحیف آواز میں کہا۔

اب تو اس کی آواز بھی بدل گئی تھی۔ مجھے یاد تھا جب پہلی مرتبہ اس کی قوتِ گویائی متاثر ہوئی تھی تو اس نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن تب بھی میں نے اسے بولنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس کی آواز اجنبی ہو گئی تھی مگر میں اس کی عادی ہو گئی تھی۔ پھر بھی جب آج وہ بولا تو اس کی آواز کی تبدیلی نے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

''نہیں تیمور! ایسے مت کہو۔ میں جب تک تمہارے ساتھ رہی یقین کرو بہت خوش رہی۔''

اس نے چند گہرے سانس لیے پھر بولا۔ ''میں بہت تکلیف میں ہوں ججو! اب برداشت نہیں ہوتا۔ درد اتنا شدید ہوتا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ دعا کرو' مجھے جلد از جلد چھٹکارا مل جائے۔ پتا نہیں اب موت کو کس چیز کا انتظار ہے۔''

اس کے ہاتھوں پر میری گرفت سخت ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''نہیں۔'' میں نے ہونٹ کاٹ کر کہا۔

''تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ تمہارا یہ ایک لفظ نہیں' میرے لیے کتنی بڑی بددعا ہے۔ اب بس اتنی دعا کرو کہ مجھے جلدی موت آئے۔ اب تکلیف ناقابلِ برداشت ہے۔''

میں رو پڑی۔

''میں بس آخری مرتبہ تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ مجھ سے دانستہ یا نادانستہ جو بھی تکلیف تمہیں پہنچی' اس کے لیے مجھے معاف کردینا۔''

''پلیز ایسے مت کہو تیمور۔'' میں نے تڑپ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر گہرے سانس لیتا رہا پھر کہنے لگا۔

''تم نے میرے سینے پر پڑا بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے۔ پتا نہیں میں کب مروں گا لیکن سجو! پلیز اپنے راستے میں آنے والی خوشیوں کو میری وجہ سے مت دھتکارنا۔ میں آج بھی اور آئندہ بھی تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں سے محبت اور خوشیاں ملیں' سمیٹ لینا۔ کاش میں ان دکھوں کی تلافی کرسکتا جو میں نے تمہیں دیئے ہیں۔''

دکھ کی شدت سے میرے لیے بولنا محال تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بس میں روتی گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ کتنی دیر گزر گئی۔ ہمارے درمیان خاموشی کی چادر تنی ہوئی تھی۔

''اب تم جاؤ سجو۔'' بالآخر اس نے بند آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ اس وقت تمہیں میری ضرورت ہے تیمور۔''

''پلیز سجو! میرے لیے موت کو اتنا اذیت ناک مت بناؤ۔''

میں ایک مرتبہ پھر اس کشمکش میں گرفتار تھی کہ اپنے دل کی مانوں یا اس کی خواہش کا خیال کروں۔ میں اس کی زندگی کی آخری سانس تک اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر چلے جانا کتنا مشکل تھا۔

''سجو میری طرف سے تم آزاد ہو۔ یاد ہے نکاح کے وقت میں نے طلاق کا حق تمہیں دیا تھا۔ میری طرف سے تم خود کو طلاق دے دو۔ اور پلیز اب جاؤ۔''

مجھے نہیں معلوم کہ اس کی بات کے بعد انتخاب کا حق میرے پاس رہا تھا یا نہیں لیکن میں وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مجھے تیمور کی خوشی زیادہ

عزیز تھی۔ اس کا سکون زیادہ عزیز تھا یا اپنی بے معنی لیکن شدید محبت کا خیال؟

''اس نے زندگی بھر آپ سے جو کچھ طلب کیا' اس میں یہ اس کی آخری خواہش ہے۔''

مجھے نادیہ کے ڈیڈی کی بات کا خیال آیا۔ ''اسے پورا کردیں۔ آج نہیں تو کل وہ ہم سب سے بہت دور چلا جائے گا۔ اسے اس دکھ کے ساتھ موت کے سفر پر روانہ مت کریں جو تنہائی کا سفر ہے۔ کم از کم اسے یہ سکون دے دیں۔ وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوگا تو جسمانی تکلیف اور آزار سے آزاد ہو جائے گا لیکن کہیں اس کی روح پر لگا یہ زخم اس کے ساتھ نہ چلا جائے۔''

اور میری محبت کو ہار تسلیم کرنا پڑی۔ محبت یہی تو تھی کہ میں اس کی خوشی کا خیال رکھتی۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں خاموشی سے اس کی خواب گاہ سے باہر نکل آئی۔

☆======☆======☆

میں سجیلہ کو جاتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اپنی آنکھیں بند ہی رکھوں لیکن وہ کمرے سے باہر نکلی تو میں رہ ہی نہیں سکا۔

''نرس۔'' میں گھنٹی کا بٹن دبانے کے ساتھ ساتھ چلایا۔

نرس عرفانہ اور میل نرس حمید دونوں تیزی سے خواب گاہ میں داخل ہوئے۔

''یس سر۔''

''مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر کھڑکی کے قریب لے چلو۔'' میں نے جلدی جلدی کہنے کی کوشش کی۔

انہوں نے میرے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ جا ہی نہ چکی ہو۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے دیکھنا چاہتا تھا۔

''پردہ ہٹاؤ۔'' میں نے کہا۔

نرس عرفانہ نے پردہ ہٹا دیا۔

وہ ابھی گئی نہیں تھی۔ گیٹ کے قریب پاپا سے کوئی بات کر رہی تھی۔ پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر آنسو پونچھتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ جہاں کار کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک نوجوان سگریٹ پی رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟ اور یہ کار بھی سجو کی نہیں ہے۔'' میں نے سوچا۔

سجو کی لڑکوں سے دوستی تھی لیکن اتنی کسی سے بھی نہیں تھی کہ اس کی کار میں بیٹھ آئے

جائے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نوجوان نے سگریٹ سڑک پر پھینک کر جوتے
مسل دیا۔ تجو ضبط کرنے کی کوشش میں پھر رو پڑی۔ اس نوجوان نے اسے تھام کر کار میں
دیا۔

وہ دونوں جا چکے ہیں مگر میں اب بھی وہیں کھڑکی کے سامنے بیٹھا تصور ہی تصور میں ا
منظر کو کتنی مرتبہ دُہرا چکا ہوں۔

میں نے صدقِ دل سے چاہا تھا کہ تجو ایک نئی خوبصورت زندگی کا آغاز کرے۔ ان
اذیت ناک دنوں کی یاد بھلا کر۔

لیکن ابھی اسے اس نوجوان کے ساتھ دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں سوچ
ہوں کہ کیا تجو کے لیے میں واقعی ایسا ہی چاہتا تھا؟

☆======ختم شد======☆